جگ بیتی

جگ بیتی

(حصہ اول)

از پنڈت جواہر لال نہرو

مترجمہ

محمود علی خاں (جامعی)

۱۵۰۰

مکتبہ جامعہ

دہلی ، نئی دہلی ۔ لکھنؤ، بمبئی ۳

قیمت ۳ روپے

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

۱۹۴۲ء

جگ بیتی

فہرست مضامین

دیباچہ

معلوم نہیں کہ یہ خطوط کبھی شائع بھی ہوں گے یا نہیں اور اگر ہوئے بھی تو کب اور کہاں سے۔ اس لئے کہ ہندوستان کی آج کل کچھ عجیب و غریب حالت ہے اور یہاں کسی بات کا پہلے سے اندازہ کرنا مشکل ہے مگر میں موقع کو غنیمت سمجھ کر اسی وقت یہ چند سطریں لکھے دیتا ہوں پھر خُدا جانے کیا ہو کیا نہ ہو۔

تاریخی خطوط کے اس سلسلے کے بارے میں مجھے ایک عُذر پیش کرنا ہے اور ایک بات سمجھانی ہے جو حضرات اس کتاب کو پڑھنے کی زحمت اٹھائیں گے وہ غالباً ان دو چیزوں کو خود ہی سمجھ لیں گے۔ میں پڑھنے والوں سے خاص طور پر یہ درخواست کرتا ہوں کہ پہلے آخری خط کو پڑھیں اس دنیا میں سبھی چیزیں الٹی ہیں اس لئے اگر ہم بھی خاتمے سے ابتدا کریں تو کوئی ہرج نہیں۔

ان خطوں کی لَے خود بخود بڑھتی چلی گئی۔ پہلے سے میرے ذہن میں ان کا کوئی نقشہ نہیں تھا اور ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ ان کا سلسلہ اتنا لمبا ہو جائے گا۔ اس سے کوئی چھ سال پہلے جب میری لڑکی دس برس کی تھی میں نے اُسے چند خطوط لکھے تھے جس میں دنیا کے ابتدائی دور کا سیدھے سادھے انداز میں کچھ مختصر سا ذکر تھا۔ بعد میں یہ ابتدائی خطوط ایک کتاب کی شکل میں شائع کئے گئے اور بہت مقبول ہوئے۔

میرے دل میں بار بار یہ خیال آیا کہ اس سلسلے کو جاری رکھوں لیکن سیاسی جدوجہد کی مصروفیت نے اسے پورا نہیں ہونے دیا۔ جیل میں مجھے اس کا موقع ملا اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

جیل کی زندگی میں بعض فائدے بھی ہیں ایک تو فرصت ہوتی ہے، دوسرے آدمی دنیا کے جھگڑوں سے بے تعلق ہو جاتا ہے لیکن اس زندگی میں جو دقتیں ہیں وہ بھی ظاہر ہیں، یہاں قیدیوں کے لئے نہ کوئی کتب خانہ ہوتا ہے اور نہ حوالے کی کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں ایسی حالت میں کسی چیز پر خصوصاً تاریخ کے موضوع پر کچھ لکھنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ مجھے کچھ کتابیں ملیں لیکن میرے پاس رہ نہیں سکیں بس آئیں اور چلی گئیں لیکن اب سے بارہ سال پہلے جب میں نے اپنے دیس کے بہت سے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ جیل یاترا شروع کی۔ اسی وقت سے یہ عادت ڈالی کہ جو کتابیں پڑھتا تھا ان کے نوٹ لے لیتا تھا۔ اس طرح میرے پاس بہت سی بیاضیں جمع ہو گئیں اور اس کتاب کو لکھتے وقت بہت کام آئیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے دوسری کتابوں سے بھی بہت مدد لی خصوصاً ایچ۔ جی ویلز کی تاریخ عالم سے کیونکہ اس کے بغیر چارہ ہی نہ تھا لیکن حوالے کی کتابوں کے نہ ہونے سے بڑی دقت تھی اور اس کی وجہ سے اکثر سلسلۂ بیان ٹوٹ جاتا تھا یا بعض خاص دور بیچ میں چھوڑنے پڑتے تھے۔

یہ خطوط ذاتی ہیں اور ان میں بعض نجی باتیں ہیں جن کا تعلق صرف میری لڑکی سے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کیا کروں

اس لئے کہ ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے میں تو بڑا جھگڑا ہے میں تو انھیں یونہی رہنے دیتا ہوں۔

جب آدمی ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکتا ہو تو وہ بیٹھ کر سوچا کرتا ہے اور اس کے مزاج میں کچھ عجیب اتار چڑھاؤ رہا کرتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کا اتار چڑھاؤ اس کتاب میں صریحی طور پر نظر آئے گا اور اس کا انداز بیان ویسا بے لاگ نہیں ہوگا جیسا مورّخ کا ہونا چاہئیے۔ یہ دعوی بھی نہیں کہ میں مورّخ ہوں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں دو چیزیں گڈ مڈ ہو گئی ہیں۔ کہیں تو بچّوں کے قابل سیدھی سادھی تحریر ہے اور کہیں ان گے خیالات کی بحث۔ جنھیں صرف بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اکثر جگہ خیالات کی تکرار بھی پائی جاتی ہے۔ غرض اس مجموعے میں جو کوتاہیاں ہیں ان کی کوئی انتہا نہیں۔ سچ پوچھئے تو کچھ سرسری خاکے ہیں۔ جن میں محض برائے نام ربط ہے۔ میں نے ہر قسم کی بُری بھلی کتابوں سے واقعات اور خیالات اخذ کئے ہیں۔ اِس لئے ممکن ہے کہ کتاب میں بہت سی غلطیاں ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی مورّخ سے نظر ثانی کرا دُں۔ لیکن میں جیل سے باہر اتنے تھوڑے دن رہا کہ اس کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔

اِن خطوں میں میں نے اکثر اپنی رائے کا اظہار شدت کے ساتھ کیا ہے۔ ان رایوں پر میں اب تک قائم ہوں۔ لیکن اس کتاب کے لکھنے کے دوران میں میرا تاریخ کا تصور رفتہ رفتہ بدل گیا ہے۔ اگر میں ان خطوط کو اب

لکھتا تو دوسری طرح لکھتا اور دوسری چیزوں پر زور دیتا۔ لیکن اس وقت میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ جو کچھ لکھا ہے اُسے پھاڑ ڈالوں اور نئے سرے سے اسے لکھنا شروع کروں۔

یکم جنوری ۱۹۳۶ء

جواہرلال نہرو

جنم دن کی مبارک باد

اندرا پریہ درشنی کے نام
تیرھویں جنم دن کے موقع پر

سنٹرل جیل نینی،
۲۶ اکتوبر ۱۹۳۰ء[1]

ہمیشہ جنم دن کے موقع پر تمہیں اچھے اچھے تحفے اور مبارک باد ملا کرتی تھی۔ مبارک بادیں تو اب بھی بہت سی ملیں گی لیکن تحفہ بھلا میں اس نینی جیل سے کیا بھیج سکتا ہوں۔ میرے پاس مادی تحفے کہاں۔ ہاں روحانی اور دماغی تحفے ضرور ہیں۔ اگر کوئی پری تمہارے لئے تحفے لاتی تو وہ ایسے ہی ہوتے۔ انھیں جیل خانے کی اونچی اونچی دیواریں بھی روک نہیں سکتیں۔

پیاری بیٹی! تم خوب جانتی ہو کہ مجھے نصیحت کرنے اور وعظ کہنے سے کتنی نفرت ہے۔ جب کبھی نصیحت کرنے کو میرا جی چاہتا ہے تو ہمیشہ اس "مرد دانشمند" کی کہانی یاد آجاتی ہے جو میں نے کبھی پڑھی تھی۔ شاید تم بھی ایک دن وہ کتاب پڑھو جس میں یہ کہانی درج ہے۔ کوئی تیرہ سو برس گذرے کہ چین سے ایک سیاح علم و دانش کی تلاش میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کا نام ہیونگ سانگ تھا۔ وہ شمال کے پہاڑ اور ریگستان طے کرتا ہوا یہاں پہنچا۔ اسے علم کا اتنا شوق تھا کہ راستے میں اس نے سینکڑوں مصیبتیں اٹھائیں اور ہزاروں خطروں اور مشکلوں کا مقابلہ

---

[1] اندرا کا جنم دن عیسوی سنہ کے مطابق ۱۹ نومبر کو پڑتا ہے لیکن بکرمی سمت کے حساب سے ۲۶ اکتوبر کو منایا گیا۔

کیا۔ وہ ہندوستان میں بہت دن رہا۔ خود سیکھتا تھا اور دوسروں کو سکھاتا تھا۔ زیادہ تر وہ نالندہ کی یونیورسٹی میں رہا جو شہر پاٹلی پتر کے قریب واقع تھی۔ اب اس شہر کو پٹنہ کہتے ہیں۔ ہیون سانگ پڑھ لکھ کر بہت قابل ہوگیا حتیٰ کہ اسے (بودھ مت کے) فاضلِ قانون کا خطاب دیا گیا۔ پھر اس نے سارے ہندوستان کا سفر کیا اور اس عظیم الشان ملک کے ان باشندوں کو جواب سے صدیوں پہلے یہاں رہتے تھے دیکھا بھالا اور ان کے متعلق پوری معلومات حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سفرنامہ لکھا۔ اسی کتاب میں وہ کہانی درج ہے جو اس وقت مجھے یاد آئی۔ یہ ایک شخص کا قصہ ہے جو جنوبی ہند سے شہر کرنا سوورنا میں آیا تھا۔ یہ شہر صوبہ بہار میں بھاگل پور کے آس پاس کہیں واقع تھا۔ سفرنامے میں لکھا ہے کہ یہ شخص اپنے پیٹ کے چاروں طرف تانبے کی تختیاں باندھے رہتا تھا اور سر پر ایک جلتا ہوا مشعل رکھتا تھا۔ ہاتھ میں عصا لئے وہ اکڑ اکڑ کر چلتا تھا اور اس عجیب و غریب ہیئت میں بڑی شان سے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ آخر آپ نے یہ کیا قطع بنائی ہے تو وہ جواب دیتا کہ میرے اندر اتنی حکمت بھری ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میرا پیٹ نہ پھٹ جائے۔ اس لئے میں نے اپنے پیٹ پر تانبے کی تختیاں باندھ لی ہیں اور چونکہ تم سب لوگ جہالت کی تاریکی میں رہتے ہو اور مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے اس لئے میں ہر وقت اپنے سر پر مشعل لئے پھرتا ہوں۔

لیکن مجھے عقل و حکمت کی زیادتی سے اپنا پیٹ پھٹ جانے کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے تانبے کی تختیاں لپیٹنے یا زرہ بکتر پہننے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ اور پھر مجھ میں جو کچھ تھوڑی بہت عقل ہے وہ میرے پیٹ میں نہیں۔ اس کا ٹھکانا جہاں کہیں بھی ہے وہاں ابھی بہت گنجائش باقی ہے اور جگہ کی کمی پڑنے

کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جب میری عقل اتنی محدود ہے تو میں دوسروں کے سامنے عقل مند کیسے بن سکتا ہوں اور سب کو خواہ مخواہ نصیحت کرنے کا مجھے کیا حق ہے۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب یہ معلوم کرنا ہو کہ صحیح بات کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے؟ تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی وعظ کہنے لگے بلکہ بہترین صورت یہ ہے کہ آپس میں گفتگو اور بحث کی جائے۔ اس سے کبھی کبھی حقیقت کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔ میں تم سے جو گفتگو کیا کرتا تھا اس میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ ہم نے بہت سی چیزوں پر بحث کی لیکن ہماری یہ دنیا بہت بڑی ہے اور اس دنیا کے علاوہ اور بہت سے عجیب و غریب اور پراسرار عالم ہیں۔ ہمارے سامنے علم کا بہت بڑا میدان ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں بے شغلی کی شکایت ہو یا ہم اس بیوقوف اور مغرور آدمی کی طرح جس کا قصہ ہیون سانگ نے لکھا ہے یہ سمجھنے لگیں کہ ہمیں سب کچھ آگیا ہے اور اب ہم بہت ہی دانشمند ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ ہی اچھا ہے کہ ہم بہت زیادہ دانشمند نہیں بن سکے اس لئے کہ اگر دنیا میں ایسے دانشمند ہوں بھی تو وہ ضرور دل میں کڑھتے ہوں گے کہ افسوس اب کوئی ایسی چیز باقی نہیں جسے ہم سیکھیں۔ وہ نئی نئی باتیں دریافت کرنے اور نیا علم حاصل کرنے کی مسرت سے محروم ہیں لیکن ہم میں سے جو چاہے وہ اس نعمت کو حاصل کر سکتا ہے۔

غرض کہ مجھے وعظ ہرگز نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن پھر کروں تو کیا کروں؟ خط میں بات چیت کا مزا تو آنہیں سکتا کیونکہ اچھے سے اچھا خط بھی یک طرفہ ہوتا ہے اس لئے اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جو نصیحت معلوم ہو تو یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کڑوے گھونٹ کو کسی نہ کسی طرح پینا ہے بلکہ یہ سمجھنا کہ میں نے ایک بات کہی ہے تا کہ تم اس پر غور کرو، گویا ہم سچ مچ آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں تم نے پڑھا ہوگا کہ مختلف قوموں کی زندگی میں بڑے معرکے کے دور گذرے ہیں۔ ہم اکثر اولوالعزم مردوں اور عورتوں کا اور ان کے کارناموں کا حال پڑھا کرتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی اپنے خواب یا تصور میں یہ دیکھتے ہیں جیسے ہم بھی اسی زمانے میں پہنچ گئے ہیں اور انھی سورماؤں کی طرح بڑے بڑے جواں مردی کے کام کر رہے ہیں۔ تمھیں یاد ہوگا جب تم نے پہلے پہل جون آف آرک کا قصہ پڑھا تھا تو تم پر کتنا اثر ہوا تھا اور تمھارا یہی جی چاہتا تھا کہ میں بھی اسی کی طرح کچھ کر دکھاتی۔ سب عورت مرد ایسے جاں باز نہیں ہوتے۔ ان بیچاروں کو اپنی دال روٹی کی، اپنے بال بچوں کی اور اپنے گھربار کی ہر وقت فکر لگی رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری کی ساری قوم کو کسی عظیم الشان مقصد کے حاصل کرنے کی لگن لگ جاتی ہے۔ اس وقت معمولی عورت مرد بھی سورما بن جاتے ہیں۔ پھر تو تاریخ میں انقلاب ہو جاتا ہے اور بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ بڑے لیڈروں کی بات میں کچھ ایسا جادو کا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساری قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں اور لوگ بڑے بڑے کام کر گذرتے ہیں۔

جس[1] سال تم پیدا ہوئیں وہ تاریخ کا ایک یادگار سال تھا۔ اسی سال ایک عظیم الشان لیڈر نے جس کا دل غریبوں کی محبت اور مظلوموں کی ہمدردی سے لبریز تھا اپنے ملک کے لوگوں سے ایسا شاندار کام کرایا جو تاریخ کے اوراق سے کبھی مٹ نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی مہینے میں جس میں تم پیدا ہوئیں لنن نے وہ زبردست انقلاب شروع کیا جس نے روس اور سائبیریا کا نقشہ بدل دیا۔ اسی طرح آج ہندوستان میں بھی ایک عظیم الشان لیڈر جس کا دل مظلوموں کی محبت سے معمور ہے ان کی مدد کے لیے تڑپتا ہے، ہماری قوم میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ وہ

---

[1] سنہ ۱۹۱۷ء۔

بھی بڑے بڑے کارنامے کرتے اور شاندار قربانیاں دینے کو تیار ہے تاکہ ہمارا ملک پھر آزاد ہو جائے اور بھوکوں، غریبوں اور مظلوموں کے سر سے یہ مصیبت ٹل جائے۔ باپو جی[1] اگرچہ جیل میں بند ہیں لیکن ان کا وہ پیغام جو جادو کا سا اثر رکھتا ہے ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مرد، عورتیں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی میدان میں نکل کھڑے ہوئے ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے سپاہی بن گئے ہیں۔

آج ہندوستان میں ہماری قوم جو کچھ کر رہی ہے وہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ہم تم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں بلکہ خود بھی اس میں تھوڑا بہت حصہ لے رہے ہیں۔

ہم اس زبردست تحریک میں کیا کریں گے؟ ہمارا اس میں کیا حصہ ہوگا؟ سچ پوچھو تو یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن اتنا ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے ہمارے پاک مقصد کو نقصان پہنچے یا ہماری قوم کی رسوائی ہو۔ اگر ہم ہندوستان کے سپاہی بننا چاہتے ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستان کی عزت ہمارے ہاتھ میں ہے اور یہ عزت بڑی مقدس امانت ہے۔ اکثر ہم کو یہ الجھن ہوگی کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ صحیح اور غلط راستے میں امتیاز کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے میں تمھیں اس کے پرکھنے کی ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ جب کبھی تمھیں کسی معاملے میں دگدھا ہو تو اس سے کام لینا۔ اُمید ہے کہ اس سے تمھیں بڑی مدد ملے گی۔ کوئی کام چھپ کر یا کوئی ایسا کام جسے چھپانے کی ضرورت ہو کبھی نہ کرنا کیونکہ چھپانے کی خواہش کے معنی یہ ہیں کہ تم ڈرتی ہو اور ڈر بہت بری چیز ہے۔ یہ تمھارے شایان شان نہیں۔ بس ہمت سے کام لو پھر سارے کام بن جائیں گے تمھارے

---

[1] مہاتما گاندھی

دل میں ہمت ہے تو ڈر پاس نہ پھٹکے گا اور تم کوئی ایسی بات نہ کروگی جس کے ظاہر ہونے سے تمھیں شرم آئے۔ تم خوب جانتی ہو کہ باپو جی کی رہنمائی میں آزادی کی جو زبردست تحریک جاری ہے اس میں چھپ کر کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں کسی بات کے چھپانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں یا کرتے ہیں ڈر کر نہیں کرتے، ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں اپنی نجی زندگی میں بھی کھلے بندوں کام کرنا چاہئے۔ خفیہ کارروائیوں سے دور رہنا چاہیے۔ اپنے نجی معاملات کو اپنے ہی تک رکھنے کا ہمیں حق ہے اور ہونا بھی چاہیے لیکن یہ اور چیز ہے اور چوری چھپے کچھ کرنا اور چیز ہے۔ پس اگر تم اس پر عمل کروگی تو تم روشنی کی گود میں پرورش پاؤگی اور ہر حالت میں بے خوف اور مطمئن رہوگی۔

میں نے تمھیں بڑا طول طویل خط لکھ ڈالا۔ پھر بھی بہت سی ایسی باتیں رہ گئیں جو میں تمھیں بتانا چاہتا تھا۔ بھلا ایک خط میں سب کچھ کیسے سما سکتا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس معاملے میں تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اس جنگِ آزادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو جو آج ہندوستان میں چھڑی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تمھیں بڑی اچھی اور بہادر ماں ملی ہے۔ اگر تمھیں کبھی کوئی الجھن یا پریشانی ہو تو ان سے بہتر مدد کرنے والا تمھیں نہیں مل سکتا۔

اچھا رخصت، ننھی بیٹی! اب رخصت۔ خدا کرے تم بڑی ہو کر ہندوستان کی خدمت کے لئے ایک بہادر سپاہی بنو۔ بہت بہت دعائیں اور پیار۔

(۱)

نئے سال کا تحفہ

نوروز ۱۹۳۱ء

تمھیں وہ خط تو یاد ہوں گے جو میں نے اب سے کوئی دو برس پہلے تمھیں لکھے تھے۔ اس وقت میں الہ آباد میں تھا اور تم مسوری میں۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ خط تمھیں بہت اچھے لگے تھے۔ اسی لئے مجھے اکثر خیال آیا کہ کیوں نہ میں وہ سلسلہ جاری رکھوں اور دنیا کے کچھ اور حالات تمھیں بتاؤں۔ لیکن اس معاملے میں مجھے ہمیشہ کچھ تامل سا رہا ہے۔ دنیا کی بیتی ہوئی باتیں، بڑے بڑے مردوں اور عورتوں کا حال اور ان کے اچھے اچھے کارنامے پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ تاریخ پڑھنا اچھا تو ہے لیکن میرے نزدیک تاریخ بنانے میں حصہ لینا اس سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔ اور یہ تمھیں معلوم ہی ہے کہ آجکل ہمارے ملک کی تاریخ بن رہی ہے۔ ہندوستان کا ماضی بہت پرانی بات ہے، وہ اب قدامت کی تاریکی میں چھپ چکا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں بہت سے افسوسناک اور ناخوشگوار دور بھی گذرے ہیں جن کا خیال کرکے ہمیں بڑا دکھ ہوتا ہے اور ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ہمارا ماضی بڑا شاندار رہا ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کا تصور کرکے ہمیں مسرت ہوتی ہے۔ لیکن آج ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ ماضی کو لئے بیٹھے رہیں۔ اب تو مستقبل ہمارے دل و دماغ میں بس رہا ہے اور اسی کو ہم سنوار رہے ہیں۔ اس لئے تمام کوششیں اور سارا وقت حال کی نذر ہو رہا ہے۔

یہاں نینی جیل میں مجھے لکھنے پڑھنے کا نوبہت کافی وقت ملتا ہے لیکن یکسوئی نہیں ہوتی، میرا دماغ پراگندہ رہتا ہے۔ میرا دل ہر وقت اس زبردست جنگ میں پڑا رہتا ہے جو جیل کے باہر چھڑ رہی ہے۔ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہوں گے اور اگر میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو کیا کرتا۔ یہی خیال ہر وقت ستاتا رہتا ہے۔ حال اور مستقبل میں اتنا منہمک رہتا ہوں کہ ماضی پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری غلطی ہے۔ جب میں باہر کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا تو اس کی فکر میں کیوں سرگرداں رہوں؟

لیکن ان خطوں کو ملتوی کر دینے کی اصل وجہ (کہو تو تمہارے کان میں کہہ دوں) ایک دوسری ہے۔ یعنی اب مجھے یہ شک ہو چلا ہے کہ آیا میں اتنا کافی جانتا بھی ہوں کہ تمہیں کچھ سکھا سکوں! ماشاءاللہ، تم اتنی جلد بڑی ہو رہی ہو اور ایسی عقل مند ہوتی جاتی ہو کہ اسکول اور کالج میں اور اس کے بعد بھی جو کچھ میں نے سیکھا تھا وہ سب شاید اب تمہارے لئے ناکافی ہو یا کم از کم فرسودہ ضرور ہو گا۔ ممکن ہے چند دن بعد تم مجھ سے بڑھ جاؤ اور مجھے نئی نئی باتیں سکھانے لگو! پچھلے جنم دن کے موقع پر میں نے تمہیں جو خط لکھا تھا اس میں بتایا تھا کہ میں اس "عقلمند آدمی" کی طرح ہرگز نہیں ہوں جو پیٹ پر تانبے کی تختیاں باندھے رہتا تھا تاکہ علم کی زیادتی سے اس کا پیٹ پھٹ نہ جائے۔

دنیا کے ابتدائی دور کے متعلق کچھ لکھنا اُس وقت میرے لئے زیادہ آسان تھا جب تم مسوری میں تھیں۔ ہمیں پرانے زمانے کا بہت تھوڑا اور مبہم سا حال معلوم ہے۔ اُس قدیم ترین دور کے ختم ہونے کے بعد کہیں تاریخ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور انسان دنیا کے مختلف گوشوں میں اپنی جدوجہد کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر اس دور کا حال لکھنا آسان نہیں ہے جو ہوشمندی پر کم اور حماقت و جنون پر

زیادہ ملتی تھا۔ کتابوں کی مدد سے تو کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے، لیکن نینی جیل میں کتابیں کہاں۔ یہاں کوئی لائبریری نہیں ہے۔ اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ اپنی خواہش کے باوجود شاید دنیا کی تاریخ کے مسلسل واقعات میں تمھیں نہ بتا سکوں۔ مجھے وہ لڑکے لڑکیاں اچھے نہیں لگتے جو صرف ایک ملک کی تاریخ پڑھ لیتے ہیں اور وہ بھی چند سنہ اور چند واقعات حفظ یاد کر لیتے ہیں اور بس۔ تاریخ تو ایک مسلسل زنجیر کی طرح ہے جس میں ایک ملک کی کڑی دوسرے ملک سے ملی ہوتی ہے اس لئے تم کسی ایک ملک کی تاریخ نہیں سمجھ سکتیں جب تک دنیا کے دوسرے ملکوں کی تاریخ سے واقفیت نہ رکھتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم اس تنگ نظری سے اپنے مطالعے کو ایک دو ملکوں تک محدود نہ رکھوگی بلکہ ساری دنیا کی تاریخ پر ایک نظر ڈالوگی۔ یاد رکھو کہ مختلف ملکوں کے باشندوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہوتا جتنا ہم تصور کرتے ہیں۔ البتہ نقشوں اور اٹلسوں میں سب ملکوں میں مختلف رنگ بھرے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ مانا کہ مختلف ملکوں کے باشندوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے لیکن بہت سی باتوں میں وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی تو ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم اسی چیز کو پیش نظر رکھیں اور نقشوں کے جدا جدا رنگوں یا ملکی حدود اربعہ پر نہ جائیں۔

مجھے افسوس ہے کہ جیسی تاریخ میں تمھارے لئے لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا۔ اس کے لئے تمھیں دوسری کتابیں پڑھنا ہوں گی لیکن وقتاً فوقتاً ماضی کا حال تمھیں لکھتا رہوں گا اور ان لوگوں کے بھی تذکرے سناؤں گا جو اُس گذرے ہوئے زمانے میں موجود تھے اور جنھوں نے دنیا کی اس تماشا گاہ میں بڑے بڑے کام کر دکھائے۔

معلوم نہیں میرے یہ خط تمھاری دلچسپی کا باعث ہوں گے یا نہیں

اور ان سے تمہارے اندر شوق اور جستجو کا جذبہ پیدا ہوگا یا نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ تمہارے پاس کب تک پہنچ سکیں گے یا کبھی تمہیں دیکھنے کو ملیں گے بھی کہ نہیں؟ افسوس کہ ہم تم اتنے نزدیک ہوتے ہوئے بھی کتنے دور ہیں! مسوری میں تم مجھ سے سینکڑوں میل دور تھیں لیکن جتنی بار میں چاہتا تھا تمہیں خط لکھ سکتا تھا اور جب ملنے کو جی چاہتا تھا تو فوراً تمہارے پاس پہنچ جاتا تھا۔ لیکن یہاں ہم جمنا بیچ رہتے ہیں، کچھ بہت دور نہیں۔ پھر بھی نینی جیل کی اونچی اونچی دیواریں ہمیں ایک دوسرے سے جدا لئے ہوئے ہیں۔ پندرہ دن میں صرف ایک خط میں بھیج سکتا ہوں اور ایک خط آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ پندرہ دن میں صرف ایک بار تم سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ پابندیاں بھی فائدے سے خالی نہیں۔ اگر ہمیں کوئی چیز آسانی سے مل جائے تو ہم اس کی پوری قدر نہیں کرتے۔ بہرحال میرا تو یہ خیال ہو چلا ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے جیل کی زندگی بھی نہایت ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ملک کے سینکڑوں ہزاروں آدمی آج یہ تعلیم پا رہے ہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ جب تم یہ خط پڑھو گی تو انھیں پسند بھی کرو گی یا نہیں۔ خیر پسند آئیں یا نہ آئیں، میں نے تو اپنی دلچسپی کے لئے لکھنا شروع کئے ہیں۔ ان کے لکھتے وقت تم مجھے بہت ہی قریب محسوس ہوئی ہو اور ایسا لگتا ہے جیسے میں تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارا اکثر خیال آتا ہے لیکن آج تو تم کسی طرح میرے ذہن سے فراموش ہی نہیں ہوتیں۔ آج نوروز ہے۔ علی الصبح جب میں ستاروں کی طرف ٹکٹکی لگائے اپنے بستر پر لیٹا تھا تو مجھے اس عظیم الشان سال کا خیال آیا جو ابھی ابھی گذر چکا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے ان تمام امیدوں، پریشانیوں اور مسرتوں کا بھی خیال آیا جن سے اس زمانے میں دوچار ہونا پڑا۔ اور وہ بڑے

بڑے بہادری کے کام بھی یاد آئے جو لوگوں نے انجام دئے۔ پھر مجھے باپوجی کا خیال آیا جنھوں نے یرودا جیل کی کوٹھری میں بیٹھے ہی بیٹھے گویا جادو کے ذریعے ہمارے کمزور اور ناتواں ملک میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس کے بعد دادو[1] کی طرف اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرف ذہن منتقل ہوا۔ لیکن خاص طور پر مجھے تم اور تمھاری اماں یاد آئیں۔ دن چڑھے یہ خبر آئی کہ تمھاری اماں گرفتار ہوگئیں اور جیل بھیج دی گئیں۔ میرے لئے اس سے بہتر نئے سال کا اور کیا تحفہ ہوسکتا تھا۔ اس کی تو عرصے سے توقع تھی۔ اور مجھے ذرا شک نہیں کہ تمھاری اماں خود بھی بہت خوش اور مطمئن ہونگی۔

لیکن یہ خیال ضرور ہے اب تم اکیلی رہ گئیں۔ خیر پندرہ دن میں ایک بار تم مجھ سے ملنے آیا کرو اور ایک بار اپنی اماں سے ملا کرو۔ اس طرح تم میری خبر ان کو اور ان کی خبر مجھے پہنچایا کروگی۔ اچھا، ان باتوں کو جانے دو۔ اب تو میں قلم دوات لے کر بیٹھوں گا اور تمھارا تصور کروں گا۔ پھر تم میرے پاس آجاؤگی اور ہم بہت سی باتیں کریں گے، ماضی کا خواب دیکھیں گے اور مستقبل کو ماضی سے زیادہ درخشاں بنانے کے طریقے سوچیں گے۔ اس لئے آج نوروز کے موقع پر ہمیں یہ عہد کرنا چاہئے کہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ہم اس خواب کو حقیقت سے بدل دیں گے اور اس درخشاں مستقبل کو حال سے قریب تر لے آئیں گے۔ تب کہیں ہم ہندوستان کے ماضی کو تاریخ کے صفحات میں نمایاں جگہ دے سکیں گے۔

---

[1] اندرا کے دادا پنڈت موتی لال جی نہرو۔

(۲)

تاریخ کا سبق

۵ جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری بیٹی! میں نہیں کیا لکھوں اور کہاں سے شروع کروں؟ جب میں ماضی کا تصور کرتا ہوں تو اس کی سینکڑوں تصویریں میرے ذہن میں آجاتی ہیں۔ ان میں سے بعض تصویریں جلد محو ہو جاتی ہیں اور بعض کا نقش زیادہ دیر تک قائم رہتا ہے۔ دراصل یہ مجھے محبوب ہیں اس لئے ان کے تصور سے لطف اُٹھانے لگتا ہوں۔ پھر پچھلے واقعات کا موجودہ حالات سے مقابلہ کرتا ہوں اور اپنی ہدایت کے لئے ان سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ کچھ غیر شعوری سی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن ایسے موقع پر دماغ طرح طرح کے غیر مربوط خیالات اور تصورات کا گورکھ دھندا بن جاتا ہے جیسے تصویروں کی بے ترتیب نمائش ہو۔ شاید اس میں صرف ہمارا ہی قصور نہیں ہے۔ ہم میں سے اکثر واقعات کو اپنے دماغ میں اچھی طرح ترتیب دے سکتے ہیں لیکن اس کو کیا کریں کہ کبھی کبھی واقعات بھی ایسے عجیب اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ کسی ترتیب میں ٹھیک بیٹھتے ہی نہیں۔

مجھے خیال ہے پہلے کبھی میں نے تمھیں لکھا تھا کہ تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح دنیا نے رفتہ رفتہ ترقی کی۔ یعنی شروع شروع میں یہاں سادہ ترین ساخت کے حیوان بستے تھے۔ اس کے بعد زیادہ پیچیدہ ساخت کے حیوانوں نے ان کی جگہ لی یہاں تک کہ سب سے بدتر حیوان یعنی انسان آیا جو اپنی ذہانت کے زور سے سب پر حاوی ہو گیا۔ وحشت سے تہذیب تک انسان کی

ترقی کی داستان تاریخ کہلاتی ہے۔ اپنے بعض خطوں میں میں نے تمھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اشتراکِ عمل یعنی مل جل کر کام کرنے کا تخیل انسان میں کس طرح پیدا ہوا اور ہمارا یہ نصب العین کیوں ہونا چاہیئے کہ عام فائدے کے لئے ہم سب مل کر کوشش کریں۔ لیکن بعض اوقات تاریخ کے مختلف زمانوں پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نصب العین نے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی اور ابھی تک ہم کافی مہذب اور ترقی یافتہ نہیں کہے جا سکتے۔ آج بھی اشتراکِ عمل کی بہت کمی ہے۔ ایک ملک، یا اس کے باشندے اپنے اغراض کے لیے دوسروں پر حملہ کرتے ہیں اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔ ایک فرد دوسرے فرد کو کھائے جاتا ہے۔ اگر لاکھوں برس کی ترقی کے باوجود آج بھی ہم اتنے نکمے اور ناقص ہیں تو معلوم نہیں کتنے جگ اور چاہئیں کہ ہمارا عمل ویسا ہو جائے جیسا معقول اور سمجھدار مخلوق کا ہونا چاہیئے۔ تاریخ میں لمبے دور بھی ہمیں نظر آتے ہیں جو اس لحاظ سے ہمارے زمانے سے بدرجہا بہتر تھے یعنی انسان زیادہ مہذب اور زیادہ متمدن تھے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہماری دنیا ترقی کر رہی ہے یا تنزل۔ خود ہمارے ملک کا ماضی بہت درخشاں تھا یعنی ہر لحاظ سے موجودہ حالت سے کہیں بہتر تھا۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے ملکوں کا ماضی شاندار گذرا ہے، مثلاً ہندوستان، مصر، چین، یونان وغیرہ اور ان میں سے اکثر بن کر بگڑ گئے۔ لیکن ہمیں اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ دنیا بہت بڑی جگہ ہے اور کسی ایک ملک کی عارضی ترقی یا تنزل سے اس کی مجموعی حالت میں کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

آج کل بہت سے لوگ اپنی عظیم الشان تہذیب اور سائنس کے حیرت انگیز کارناموں پر اکڑتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس نے حیرت انگیز کام کر دکھائے ہیں اور سائنس کے بڑے بڑے ماہرین یقیناً ہر عزت و احترام کے مستحق ہیں لیکن

اکڑنا کچھ بڑائی کی بات نہیں ۔ اور پھر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ بہت سی چیزوں میں انسان نے دوسرے جانوروں سے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی ہے بلکہ بعض چیزوں میں تو جانور اس سے برتر ہیں ۔ بہ ظاہر یہ بہت احمقانہ بات معلوم ہوگی اور ممکن ہے ناواقف لوگ اس پر ہنسیں لیکن تم نے تو میٹرلنک کی کتابیں ”شہد کی مکھیوں کے حالات“ اور ”دیمک اور چیونٹی کے حالات“ پڑھی ہیں۔ ان ننھے ننھے کیڑے مکوڑوں کی سماجی تنظیم کا حال پڑھ کر یقیناً تمھیں تعجب ہوا ہوگا۔ ہم ان کیڑوں کو مخلوق میں سب سے زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں ۔ پھر بھی اس ننھی اور ذلیل مخلوق کو اشتراکِ عمل کا فن اور عام فائدے کی خاطر ذاتی قربانی کرنے کا اصول انسان سے بہتر آتا ہے ۔ جب سے میں نے دیمک کا حال پڑھا ہے اور مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی ہم جنس کے لئے کتنی قربانی کرتی ہے مجھے تو اس سے کچھ محبت سی ہوگئی ہے ۔ اگر آپس میں اشتراک عمل کرنا اور سماج کے فائدے کے لئے قربانی کرنا تہذیب کا کوئی معیار ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیمک اور چیونٹیاں اس لحاظ سے انسان سے کہیں زیادہ مہذب ہیں ۔

سنسکرت کی قدیم کتابوں میں ایک اشلوک ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

”خاندان کے مفاد کے لئے فرد کو قربان کر دینا چاہئے ، قوم کے مفاد کے لئے خاندان کو ، ملک کے مفاد کے لئے قوم کو اور روح کی خاطر ساری دنیا کو“

روح کیا ہے ؟ اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے اور ہر شخص اپنے خیال کے مطابق اس کی مختلف تاویلیں کرتا ہے ۔ بہرحال یہ اشلوک ہمیں مل جل کر کام کرنے اور جماعت کے فائدے کی خاطر قربانی کرنے کا سبق دیتا ہے ۔ ہندوستان مدت سے عظمت کی اس شاہراہ کو فراموش کر چکا ہے ۔ یہی وجہ ہمارے تنزل کی ہے ۔ اب ہمیں پھر اس زرّیں اصول کی ایک جھلک نظر آنے لگی ہے ۔ اس کے لئے

سارا ملک اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر کیسی مسرت ہوتی ہے کہ تمام مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں وطن کے مفاد کے لئے خوشی خوشی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور تھوڑی بہت تکلیف اور مصیبت سے بھی نہیں گھبراتے۔ بیشک انھیں خوش ہونے کا حق ہے کیونکہ انھیں یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اعلیٰ مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اور جو زیادہ خوش قسمت ہیں انھیں قربانیاں کرنے کی مسرت بھی نصیب ہوئی ہے۔ آج ہم اپنے ملک کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر "نوع انسان" کے مفاد کا سوال ہے۔ چونکہ ہماری موجودہ جنگ اس عام عظیم الشان جنگ کا ایک جزو ہے جو انسان کی مصیبت اور تکلیفوں کا خاتمہ کرنے کے لئے جاری ہے اس لئے ہم بجا طور پر خوش ہو سکتے ہیں کہ ہم دنیا کی بہبودی کے لئے بھی جو کچھ ہم سے بن پڑتا ہے کر رہے ہیں۔

آج کل تم آنند بھون میں ہو، تمھاری اماں ملاکا جیل میں بیٹھی ہیں اور میں یہاں نینی جیل میں بند ہوں۔ ہمیں اکثر ایک دوسرے کی جدائی بہت محسوس ہوتی ہے، کبھی کبھی تو بہت زیادہ۔ کیوں، ہے نا؟ لیکن ذرا اس دن کا تصور کرو جب ہم تینوں ملیں گے۔ میں تو اس کے لئے دن گن رہا ہوں اور اس کا تصور ہی میرے دل کو تازگی اور مسرت سے بھر دیتا ہے۔

(۳)

انقلاب زندہ باد

۷ر جنوری ۳۱ء

پریہ درشنی[1]! بے شک تم نظروں کو پیاری ہو، لیکن نظروں سے اوجھل ہو تو اور بھی پیاری ہو جاتی ہو۔ آج جب میں تمھیں خط لکھنے بیٹھا تو کچھ ایسی دھیمی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں جیسے دور کہیں بادل گرجتا ہو۔ شروع میں تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ آوازیں کیسی ہیں لیکن ان سے کان کچھ آشنا معلوم ہوتے تھے۔ ان کی چوٹ میرے دل پر پڑتی تھی اور ایک بازگشت سی پیدا ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ قریب آتی گئیں اور بلند تر ہوتی گئیں۔ اب یہ صاف صاف سمجھ میں آنے لگیں "انقلاب زندہ باد"، "انقلاب زندہ باد" اس پرجوش نعرے سے سارا جیل خانہ گونج اٹھا اور اس سے ہمارے دلوں کو ایک خاص مسرت حاصل ہوئی۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے جو ہم سے اتنے قریب جیل کے باہر ہی یہ نعرۂ جنگ لگا رہے تھے۔ آیا وہ شہر کے مرد اور عورتیں تھیں یا دیہات کے کسان تھے۔ جو کوئی بھی ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ہمارے دلوں میں ایک تازگی پیدا کردی۔ ہم نے اُن کے پیام کا زبانِ خاموشی سے جواب دیا اور ہمارے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلیں۔

جانتی ہو کہ ہم "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں؟ اور تبدیلی

---

[1] پریہ درشنی' اندرا کے نام کا جزو ہے۔ اس کے معنی ہیں "نظر کی پیاری" یا "منظورِ نظر"۔

اور انقلاب کیوں چاہتے ہیں؟ اس لئے کہ آج ہندوستان میں واقعی زبردست تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن جو تبدیلی ہم چاہتے ہیں اس کے ہو جانے کے بعد بھی یعنی ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر بھی ہم خاموش ہو کر نہیں بیٹھ رہیں گے۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز جس کے اندر جان ہو کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی بلکہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ساری فطرت روز بروز بلکہ منٹ منٹ پر بدل رہی ہے۔ البتہ مُردوں میں نشو و نما رُک جاتا ہے اور ان پر جمود چھا جاتا ہے۔ اچھا پانی وہی ہے جو بہتا رہے۔ لیکن اگر اُس کا بہاؤ رک جائے تو سڑ جاتا ہے۔ یہی حال انسان کی اور قوموں کی زندگی کا ہے۔ خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں ہم برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ ننھی ننھی بچیاں چند سال میں لڑکیاں ہو جاتی ہیں، لڑکیاں جوان اور جوانیں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ ہمیں ان تبدیلیوں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان تبدیلیوں کے منکر ہیں۔ وہ گویا اپنے دل و دماغ کے دروازے بند کر کے انھیں مقفل کر دیتے ہیں اور نئے خیالات کو آنے ہی نہیں دیتے۔ جتنا وہ غور و فکر سے گھبراتے ہیں اتنا کسی چیز سے نہیں گھبراتے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ زمانہ ان کی ذرا پروا نہیں کرتا اور انھیں چھوڑ کر بڑھتا چلا جاتا ہے اور چونکہ اس قسم کے لوگ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت نہیں پیدا کرتے اس لئے وقتاً فوقتاً زبردست ٹکر ہو جاتی ہے اور بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں مثلاً اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے کا انقلاب فرانس یا تیرہ برس پہلے کا انقلاب روس۔ یہی حال ہمارے ملک کا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی آج انقلاب کی کیفیت ہے۔ بیشک ہم آزادی چاہتے ہیں مگر اس کے سوا کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ ہم گندے پانی کے تمام تالابوں کو خالی کر کے ہر جگہ صاف اور تازہ پانی بھرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں تمام کوڑے کرکٹ کو صاف کرنا ہے اور افلاس اور مصیبت کو اپنے ملک سے دور کرنا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو لوگوں کے دماغ

کے وہ جالے بھی صاف کرنے ہیں جن کی وجہ سے ان میں غور و فکر کی گنجائش نہیں رہتی اور وہ اس عظیم الشان کام میں جو ہمارے سامنے ہے ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور شاید اس میں بہت دن لگ جائیں گے۔ مگر آؤ ہم سے کم ایک بار اچھی طرح زور تو لگا دیں۔ انقلاب زندہ باد!

ہم انقلاب کی سرحد پر پہنچ گئے ہیں۔ آگے چل کر جو ہونے والا ہے اس کی تو ہمیں خبر نہیں۔ لیکن اتنا تو اس وقت بھی نظر آتا ہے کہ ہماری محنت خوب پھل لا رہی ہے۔ ذرا ہندوستان کی عورتوں پر نظر ڈالو۔ دیکھو اس جنگِ آزادی میں کس فخر سے سب سے آگے آگے چلتی ہیں۔ نرمی کے باوجود وہ اتنی بہادر ہیں کہ کسی سے دبنے والی نہیں۔ دیکھو کس تیزی سے قدم بڑھا رہی ہیں اور دوسروں کے لئے مثال قائم کر رہی ہیں۔ کہاں آج وہ پردہ جو ہماری بہادر اور حسین دیویوں کو اب تک چھپائے ہوئے تھا اور ان کے اور ملک کے لئے ایک لعنت تھا؟ وہ اب کھسک کر اس جگہ پہنچ رہا ہے جو اس کے لئے مناسب ہے یعنی عجائب خانے کی الماریوں میں جہاں پرانے زمانے کے تبرکات رکھے رہتے ہیں۔

پھر ذرا بچوں کو بھی دیکھو، لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو اور ان کی ونر سینا اور بال اور بالکا سبھاؤں کو بھی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے اکثر کے والدین بزدل یا غلام رہے ہوں لیکن آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس نسل کے بچے آگے چل کر ذرا بھی بزدلی کا ثبوت دیں گے یا غلامی گوارا کریں گے۔

غرض کہ زمانے کا پہیہ گردش کرتا رہتا ہے۔ جو نیچے ہوتے ہیں وہ اوپر آجاتے ہیں اور اوپر والے نیچے چلے جاتے ہیں۔ اب خدا خدا کر کے ہمارے ملک میں بھی اس کی گردش شروع ہو گئی ہے اور ہم نے اسے اب کی بار اس زور کا چکر دیا ہے کہ وہ کسی کے روکے رک نہیں سکتا۔ انقلاب زندہ باد!

(۴)

ایشیا اور یورپ

۸ جنوری ۱۹۳۱ء

میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ ہر چیز برابر بدلتی رہتی ہے۔ دراصل انھیں تبدیلیوں کے تذکرے کا نام "تاریخ" ہے۔ اگر دنیا میں بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہوتیں تو تاریخ بھی بہت چھوٹی ہوتی۔

عام طور پر اسکول اور کالج میں ہمیں کچھ یوں ہی سی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ دوسروں کا تو میں جانتا نہیں لیکن اپنے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسکول میں میں نے بہت کم تاریخ پڑھی تھی۔ کچھ تھوڑی سی ہندوستان کی تاریخ اور تھوڑی سی انگلستان کی تاریخ اور بس۔ ہندوستان کی جو تھوڑی بہت تاریخ پڑھائی بھی گئی وہ یا غلط تھی یا توڑ مروڑ کر بیان کی گئی تھی اور ایسے لوگوں کی لکھی ہوئی تھی جو ہندوستان کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے ملکوں کی تاریخ کا مجھے محض ایک دھندلا سا علم تھا۔ البتہ کالج چھوڑنے کے بعد میں نے سچ مچ کچھ تاریخ پڑھی۔ پھر خوش قسمتی سے جیل یاتراؤں کی بدولت مجھے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا کافی موقع ملا۔

پچھلے خطوں میں میں نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کا کچھ حال لکھا تھا، یعنی دراوڑوں کے بارے میں اور آریوں کی آمد کے متعلق۔ آریوں سے پہلے کا حال بہت کم لکھا تھا کیونکہ مجھے خود اس کا علم نہ تھا۔ لیکن اب تم بڑے شوق سے یہ سنو گی کہ پچھلے چند برس میں ہندوستان میں قدیم ترین تہذیب کے آثار برآمد ہوئے

ہیں۔ یہ شمال و مغربی ہند میں موہن جوداڑو کے قرب وجوار میں نکلے ہیں۔ لوگوں نے یہاں سے تقریباً" پانچ ہزار قبل کے آثار کھود کر نکالے ہیں حتیٰ کہ انھیں قدیم مصر کی طرح کی ممیاں بھی اچھی حالت میں ملی ہیں۔ ذرا سوچو تو! یہ ہزاروں برس پہلے کا حال تھا، آریوں کی آمد سے بہت پہلے کا۔ یورپ تو اس وقت ایک جنگل رہا ہوگا۔

آج یورپ بہت طاقت ور ہے اور اس کے باشندے اپنے آپ کو ساری دنیا سے زیادہ مہذب اور متمدن سمجھتے ہیں۔ وہ ایشیا اور اس کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایشیا کے ملکوں میں آتے ہیں اور جو کچھ ہاتھ پڑتا ہے لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ زمانہ کیسا بدل گیا ہے؟ آؤ ذرا اس یورپ اور ایشیا پر ایک نظر ڈالیں۔ اٹلس کھول کر دیکھو کہ چھوٹا سا یورپ عظیم الشان براعظم ایشیا کے ایک طرف کیسا لٹک رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایشیا ہی کا کوئی جزو ہے۔ جب تم تاریخ پڑھوگی تو تمھیں معلوم ہوگا کہ کافی عرصے تک ایشیا اس پر چھایا رہا ہے۔

ایشیا والے موج در موج یورپ پر حملہ آور ہوئے ہیں اور اسے فتح کیا ہے۔ انھوں نے یورپ کو لوٹا بھی ہے اور مہذب بھی بنایا ہے۔ آریہ، سیتھین، ہُن، عرب، مغل، ترک سب ایشیا ہی کے کسی نہ کسی گوشے سے نکلے اور سارے یورپ اور ایشیا میں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے ایشیا میں یہ ٹڈی دل کی طرح پیدا ہوتے تھے۔ سچ پوچھو تو یورپ ایک مدت تک ایشیا کی نو آبادی بنا رہا۔ چنانچہ جدید یورپ کے اکثر باشندے انھیں ایشیائی حملہ آوروں کی نسل ہیں۔

ایشیا سارے نقشے میں اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے کوئی بڑا دیو پڑا اینڈ رہا ہو۔ اس کے مقابلے میں یورپ بہت چھوٹا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں

کہ ایشیا محض اپنی جسامت کی وجہ سے عظمت کا مستحق ہے یا یورپ اسی بنا پر کسی توجہ کے قابل نہیں۔ جسامت تو کسی انسان یا ملک کی بڑائی کا سب سے ادنیٰ معیار ہے۔ ہم اچھی طرح واقف ہیں کہ تمام براعظموں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود یورپ آج سب سے بڑا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے اکثر ملکوں کے بڑے روشن دور گذرے ہیں۔ ان میں سائنس کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی تحقیق اور ایجادوں سے انسانی تہذیب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور کروڑوں انسانوں کے لئے زندگی کی بڑی بڑی سہولتیں مہیا کر دیں۔ اس کے علاوہ وہاں بڑے بڑے اہل قلم، مفکر، مصور، مغنی اور اربابِ عمل گذرے ہیں۔ اس لئے یورپ کی عظمت سے انکار کرنا سراسر حماقت ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ ایشیا کی عظمت کو بھی فراموش کرنا اتنی ہی بڑی حماقت ہے۔ ممکن ہے ہم یورپ کی موجودہ چمک دمک میں ایسے کھو جائیں کہ اپنے ماضی کو بھول جائیں۔ اس لئے ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایشیا ہی ہے جس نے ایسے ایسے جلیل القدر پیشوا پیدا کئے جنھوں نے ساری دنیا کی کایا پلٹ دی۔ شاید کسی فرد یا کسی چیز نے دنیا پر اتنا اثر نہ ڈالا ہوگا جتنا انھوں نے ڈالا۔ یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کی بنا ڈالی۔ ہندو مذہب جو تمام مذاہب میں سب سے پرانا ہے ہندوستان ہی سے نکلا۔ اسی طرح بدھ مت بھی جو تمام چین جاپان، برما، تبت اور لنکا میں پھیلا ہوا ہے۔ یہودی اور عیسائی مذہب بھی ایشیائی ہیں کیونکہ ان کی ابتدا ایشیا کے مغربی ساحل یعنی فلسطین میں ہوئی۔ پارسی مذہب ایران میں شروع ہوا اور غالباً تم جانتی ہوگی کہ پیغمبر اسلام محمدؐ عرب میں مکہ کے شہر میں پیدا ہوئے تھے، کرشن جی، بودھ جی، زرتشت، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ، چین کے جیّد فلسفی کانفیوشس اور لاؤتسی، کس کس کا نام لیا جائے۔ ایشیا

کے بڑے بڑے ارباب فکر کے ناموں سے تو صفحے کے صفحے بھر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایشیا میں بے شمار ارباب عمل بھی گذرے ہیں۔ اس کے علاوہ میں اور بہت سی باتوں سے یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ ہمارا یہ قدیم براعظم پچھلے زمانے میں کتنا عظیم الشان اور اہم تھا۔

زمانہ کیسا بدل گیا! اور اب پھر ہمارے دیکھتے دیکھتے بدل رہا ہے۔ تاریخ عموماً صدیوں میں بہت آہستہ آہستہ اپنا کام کرتی ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات بڑی تیزی سے بدلتے ہیں اور یکایک انقلاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آجکل ایشیا میں تاریخ نہایت تیزی سے بدل رہی ہے اور ہمارا یہ قدیم براعظم اب گہری نیند سے بیدار ہو رہا ہے۔ آج دنیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ مستقبل کی تشکیل میں ایشیا کا بہت بڑا حصہ ہو گا۔

(۵)

پُرانی تہذیبیں اور ان میں ہمارا تہذیبی ورثہ

۹ جنوری ۱۹۳۶ء

ہندی کے اخبار "بھارت" کے ذریعے ہمیں ہفتے میں دو بار باہر کی دنیا کی کچھ خبریں مل جاتی ہیں۔ کل اس میں یہ خبر میری نظر سے گذری کہ ملاکا جیل میں تمھاری اماں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا اور وہ لکھنؤ جیل بھیجی جانے والی ہیں۔ اس خبر سے میں تھوڑا سا گھبرا گیا اور دل کو ایک فکر ہوگئی۔ ممکن ہے "بھارت" کی یہ خبر بالکل بے بنیاد ہو۔ لیکن ذرا سا شبہ بھی دل میں کھٹکتا ہے۔ خود تکلیف اور مصیبت برداشت کر لینا معمولی بات ہے اور اس سے ہر ایک کو نفع ہوتا ہے۔ اگر آدمی اس کا عادی نہ ہو تو بہت نازک بن جاتا ہے۔ لیکن اپنے پیاروں کی تکلیف کا تصور کرنا آسان یا خوشگوار نہیں ہوتا، خصوصاً اس حالت میں جبکہ ہم بے بس ہوں اور ان کے لئے کچھ کر نہ سکتے ہوں۔ اسی وجہ سے "بھارت" کی خبر سے میرے دل میں تمھاری اماں کے متعلق فکر پیدا ہوگئی۔ میں جانتا ہوں وہ بڑی بہادر اور شیر دل ہیں لیکن ان کا جسم کمزور ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اور کمزور ہو جائے۔ خواہ ہمارا دل کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو اگر جسم بالکل ساتھ نہ دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کوئی کام اچھی طرح انجام دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی صحت اور موت کا خیال رکھنا چاہیے اور اپنے جسم کی پوری نگہداشت کرنی چاہیے۔

غالباً یہ تمھاری اماں کے لئے اچھا ہی ہے کہ وہ لکھنؤ بھیجی جا رہی ہیں کیونکہ وہاں انھیں زیادہ آرام ملے گا اور وہ زیادہ خوش رہیں گی۔ لکھنؤ جیل میں کچھ ساتھی

بھی مل جائیں گے۔ یہاں ملاکا میں تو غالباً وہ اکیلی ہوں گی۔ پھر بھی اس خیال سے میرے دل کو بڑی تسکین ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے دور نہیں ہیں، یعنی ہماری جیل سے صرف چار پانچ میل کے فاصلے پر ہیں۔ مگر یہ تو احمقانہ خیال ہے۔ پانچ میل یا پچاس میل یا ایک سو پچاس میل سب برابر ہیں اگر دو جیل خانوں کی اونچی اونچی دیواریں بیچ میں حائل ہوں۔

آج مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ دادو الٰہ آباد واپس آگئے ہیں اور اب ان کی صحت پہلے سے بہتر ہے۔ یہ سن کر بھی مجھے خوشی ہوئی کہ وہ تمھاری اماں سے ملنے ملاکا جیل گئے تھے۔ اگر قسمت میں ہے تو شاید کل میں بھی تم سب سے ملوں کیونکہ کل میری "ملاقات کا دن" ہے اور جیل میں ملاقات کا دن تو عید کا دن ہوتا ہے۔ دادو کو میں نے تقریباً دو ماہ سے نہیں دیکھا ہے۔ امید ہے کہ کل میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خود یہ اطمینان کرسکوں گا کہ واقعی اب ان کی حالت اچھی ہے اور تمھیں بھی میں پندرہ دن کے بعد ــــ وہ پہاڑ سے پندرہ دن جو کسی طرح کاٹے نہیں کٹتے ــــ دیکھوں گا اور تم مجھے اپنی اماں کی اور اپنی خیریت سناؤ گی۔

اُفوہ! میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور کیا فضول باتیں لکھنے لگا حالانکہ میں تمھیں پچھلی تاریخ کا کچھ حال بتانے بیٹھا تھا۔ اچھا آؤ اب تھوڑی دیر کے لئے ہم زمانۂ حال کو بھول جائیں اور دو تین ہزار برس پیچھے پلٹ چلیں۔

مصر اور کریٹ کے قدیم **Knossos** کا تھوڑا بہت حال میں نے پچھلے خطوں میں تمھیں لکھا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ قدیم تہذیب کی بنیاد انھی دو ملکوں میں اور ان کے علاوہ عراق یا مسوپوٹامیا میں اور چین، ہندوستان اور یونان میں پڑی۔ یونان کا نمبر ان سب کے بعد آیا۔ گویا ہندوستان کی تہذیب قدامت کے لحاظ سے مصر، چین اور عراق کی تہذیبوں کی ہم عصر ہے حتیٰ کہ یونان کی قدیم

Knossos کا کیا حشر ہوا تہذیب بھی اس کو چھوٹی نہیں ہے لیکن ان قدیم تہذیبوں کا کیا حشر ہوا کا اب کہیں پتہ نہیں۔ کوئی تین ہزار برس سے یہ بے نام و نشاں ہیں۔ یونانیوں نے جو ان کے بعد آئے انھیں تباہ کر دیا۔ اسی طرح مصر کی قدیم تہذیب بھی ہزاروں برس کی درخشاں تاریخ کے بعد ختم ہو گئی اور اس کا بھی کوئی نام و نشان باقی نہ رہا، بجز عظیم الشان اہرام (Pyramids) اور ابوالہول Sphinx کے اور قدیم مندروں کے آثار اور ممیوں اور اسی قسم کی دوسری یادگاروں کے۔ مصر کا ملک اب بھی موجود ہے اور دریائے نیل اب بھی پہلے کی طرح وہاں بہتا ہے اور مرد اور عورتیں دوسرے ملکوں کی طرح وہاں بھی رہتی ہیں لیکن ان جدید لوگوں کو اپنے ملک کی قدیم تہذیب کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔

عراق اور ایران کو دیکھو۔ یکے بعد دیگرے وہاں کتنی سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں۔ ان میں سب سے پرانی یعنی بابلی، اشوری اور کلدانی سلطنتوں کا اور ان کے بڑے بڑے شہروں یعنی بابل اور نینوا کا نام لینا کافی ہے۔ توریت ان کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ اس کے بعد اس قدیم سرزمین میں اور دوسری سلطنتیں پیدا ہوئیں اور ختم ہو گئیں۔ یہیں بغداد تھا، الف لیلہ کا طلسم آباد۔ غرض سلطنتیں ابھرتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ بڑے سے بڑے اور مغرور سے مغرور بادشاہ اور شہنشاہ دنیا کی اس تماشا گاہ میں ذرا سی دیر کے لیے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن تہذیبیں باقی رہتی ہیں، مگر عراق اور ایران کی قدیم تہذیبیں بھی مصر کی پرانی تہذیب کی طرح برباد ہو گئیں۔

یونان بھی پرانے زمانے میں بہت ترقی یافتہ تھا۔ آج بھی ہم اس کی شان و شوکت کا حال حیرت سے پڑھتے ہیں اور اس کے سنگ مرمر کے مجسموں کی خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ اب بھی ہم اس کے قدیم ادب کے بچے کھچے ٹکڑوں کا

جو ہم تک پہنچے ہیں بڑے احترام اور استعجاب سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ جدید یورپ بہت سی باتوں میں قدیم یونان کا وارث ہے۔ اسی سے اندازہ کرو کہ یورپ نے یونانی خیالات اور یونانی تہذیب و تمدن سے کتنا استفادہ کیا لیکن آج یونان کی وہ شان و شوکت کہاں ہے؟ صدیاں گذریں کہ وہ قدیم تہذیب ختم ہو چکی ہے اور نئے طریقوں نے اس کی جگہ لے لی ہے اور یونان آج یورپ کے جنوب و مشرقی گوشے میں بس ایک چھوٹے سے ملک کی حیثیت سے پڑا ہے۔ مصر، Knossos، عراق اور یونان سب تباہ ہو گئے۔ آج ان کی قدیم تہذیبوں کا حتیٰ کہ بابل اور نینوا جیسی عظیم الشان تہذیبوں کا بھی کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اب ذرا دیکھو کہ اس سلسلے کے باقی دو ملکوں پر کیا گذری، جن کا اب تک ہم نے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، یعنی چین اور ہندوستان کا دوسرے ملکوں کی طرح، یہاں بھی سلطنتوں پر سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان پر بھی بے شمار حملے ہوئے اور قتل و غارت کا دور دورہ رہا۔ بادشاہوں کے متعدد خاندان صدیوں تک حکمرانی کرتے رہے، پھر وہ مٹ گئے اور دوسرے ان کی جگہ آ گئے۔ یہ سب کچھ ہندوستان اور چین میں بھی اسی طرح ہوا جیسے دوسرے ملکوں میں ہوا تھا۔ لیکن تہذیب کا حقیقی تسلسل ایسا کسی جگہ قائم نہیں رہا جیسا ان دو ملکوں میں رہا۔ طرح طرح کے انقلابوں، جنگوں اور حملوں کے باوجود اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں ملک اپنی پہلی حالت سے اب بہت گر گئے ہیں اور صدیوں کی گرد و غبار سے ان کی تہذیب چھپ گئی ہے بلکہ بعض صورتوں میں مسخ ہو گئی ہے۔ مگر اب بھی یہ تہذیب اپنی جگہ پر قائم ہے اور آج تک ہندوستان کی زندگی اسی پر مبنی ہے۔ اب دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی ہے اور دخانی جہازوں، ریلوں اور بڑے بڑے کارخانوں نے اس کی صورت بدل دی ہے۔ ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ ہندوستان کی صورت بھی بدل دیں لیکن ہندوستانی تہذیب و تمدن کی قدامت اور

تسلسل کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ تاریخ کی ابتدا سے لے کر ہمارے زمانے تک کیوں کر باقی رہا۔ ہم ایک طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان قرنوں کا ورثہ ہم تک پہنچا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ہم براہ راست اُن قدماء کی نسل میں ہوں جو شمال و مغربی دروں سے گذر کر ان زرخیز میدانوں میں آئے جو آگے برہم ورت، آریہ ورت، بھارت ورش یا ہندوستان کہلائے۔ کیا تمھیں وہ لوگ پہاڑی دروں سے بے جانے بوجھے میدانوں میں نیچے اترتے ہوئے نظر نہیں آرہے ہیں؟ دیکھو وہ کیا سامنے ہیں، بہادر اور مہم سر کرنے کے جوش سے سرشار۔ وہ ہمیشہ نتائج سے بے پروا ہو کر آگے بڑھا کرتے تھے۔ اگر موت آجاتی تو وہ اس کی ذرا پروا نہ کرتے تھے بلکہ خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ زندگی کی قدر نہیں کرتے تھے۔ زندگی سے بھی انھیں سچا عشق تھا۔ زندگی کا لطف اس میں ہے کہ آدمی اپنے دل سے ڈر کو نکال دے اور شکست اور مصیبت کی پروا نہ کرے۔ کیونکہ جو لوگ نڈر ہوتے ہیں شکست اور مصیبت ان سے دور ہی دور رہتی ہے۔ ذرا اپنے اُن دُور کے بزرگوں کا تصور کرو جو منزلیں طے کرتے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ یکایک وہ مقدس گنگا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں جو شاہانہ انداز سے سمندر کی طرف بہتی چلی جارہی ہے۔ یہ عالم دیکھ کر انھیں کتنی بے اندازہ مسرت ہوئی ہوگی! اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر وہ اس کے سامنے سربسجود ہوگئے اور اپنی میٹھی اور سریلی زبان میں اس کے گیت گانے لگے۔

یہ خیال کر کے کتنی مسرت ہوتی ہے کہ ہم ان تمام جُگوں کی تہذیب کے وارث ہیں۔ لیکن ہمیں اس پر مغرور نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم وارث ہیں تو اچھائیوں اور برائیوں دونوں کے وارث ہیں بلکہ موجودہ حالت میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو وراثت میں برائیاں زیادہ ملیں جنھوں نے ہمیں دنیا کی نظروں میں ذلیل کردیا، ہمارے شاندار ملک کو کنگال کر دیا اور اسے دوسروں کے ہاتھ میں

کھلونا بنا دیا۔
مگر ہم تو یہ طے کر چکے ہیں کہ اب یہ حالت نہیں رہنے پائے گی۔

(۶)

یونانیوں کا حال

۱۰ جنوری ۳۱ء

آج تم میں سے کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا اور ملاقات کا دن بالکل خالی گیا۔ اس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ اور ملاقات نہ ہونے کی جو وجہ بتائی گئی اس سے اور بھی تکلیف ہوئی۔ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دادو کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ پتا نہ چل سکا۔ خیر جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ آج ملاقات نہ ہوگی تو میں نے اپنا چرخہ اُٹھایا اور کاتنے لگا۔ میرا تجربہ ہے کہ چرخہ کاتنے اور نواڑ بننے سے بہت سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے جب کچھ سمجھ میں نہ آئے تو آدمی کو چاہئے کہ چرخہ لے کر بیٹھ جائے۔

میں نے پچھلے خط میں ایشیا اور یورپ کا مقابلہ کیا تھا۔ اب ذرا اس زمانے کے یورپ پر ایک سرسری نظر ڈالو۔ پہلے صرف بحیرۂ روم کے آس پاس کے ملکوں کو یورپ کہتے تھے۔ شمالی ملکوں کا ہمیں کچھ حال معلوم نہیں ہے۔ بحیرۂ روم کے ملکوں کے باشندے جرمنی، انگلستان اور فرانس کے باشندوں کو جنگلی اور وحشی سمجھتے تھے۔ دراصل ابتدا میں تہذیب بحیرۂ روم کے صرف مشرقی علاقے تک محدود تھی۔ تمھیں علم ہے کہ مصر (جو یورپ میں نہیں، افریقہ میں ہے) اور Knossos ہی دو ملک تھے جن میں سب سے پہلے تہذیب پھیلی۔ رفتہ رفتہ ایشیا سے آریہ مغرب کی طرف پہنچے اور انھوں نے یونان اور قرب و جوار کے ملکوں پر حملہ کیا۔ یہی وہ "آریہ یونانی" ہیں جنھیں ہم قدیم یونانی کہتے ہیں اور آج تک

ان کے گن گاتے ہیں۔ ابتدا میں غالباً وہ ان آریوں سے کچھ مختلف نہ ہونگے جو شاید اس سے پہلے ہندوستان میں آچکے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں تبدیلیاں ہوتی گئیں اور آریہ قوم کی ان دونوں شاخوں میں فرق بڑھتا گیا۔ ہندوستانی آریوں نے ہندوستان کی قدیم تر تہذیب کا بہت کافی اثر قبول کیا یعنی دراوڑوں کی تہذیب کا اور شاید اس تہذیب کا جس کے آثار اب موہن جو دارو میں برآمد ہوئے ہیں۔ آریوں اور دراوڑوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا اور اس طرح ہندوستان میں ایک مشترکہ تہذیب کی بنیاد ڈالی۔

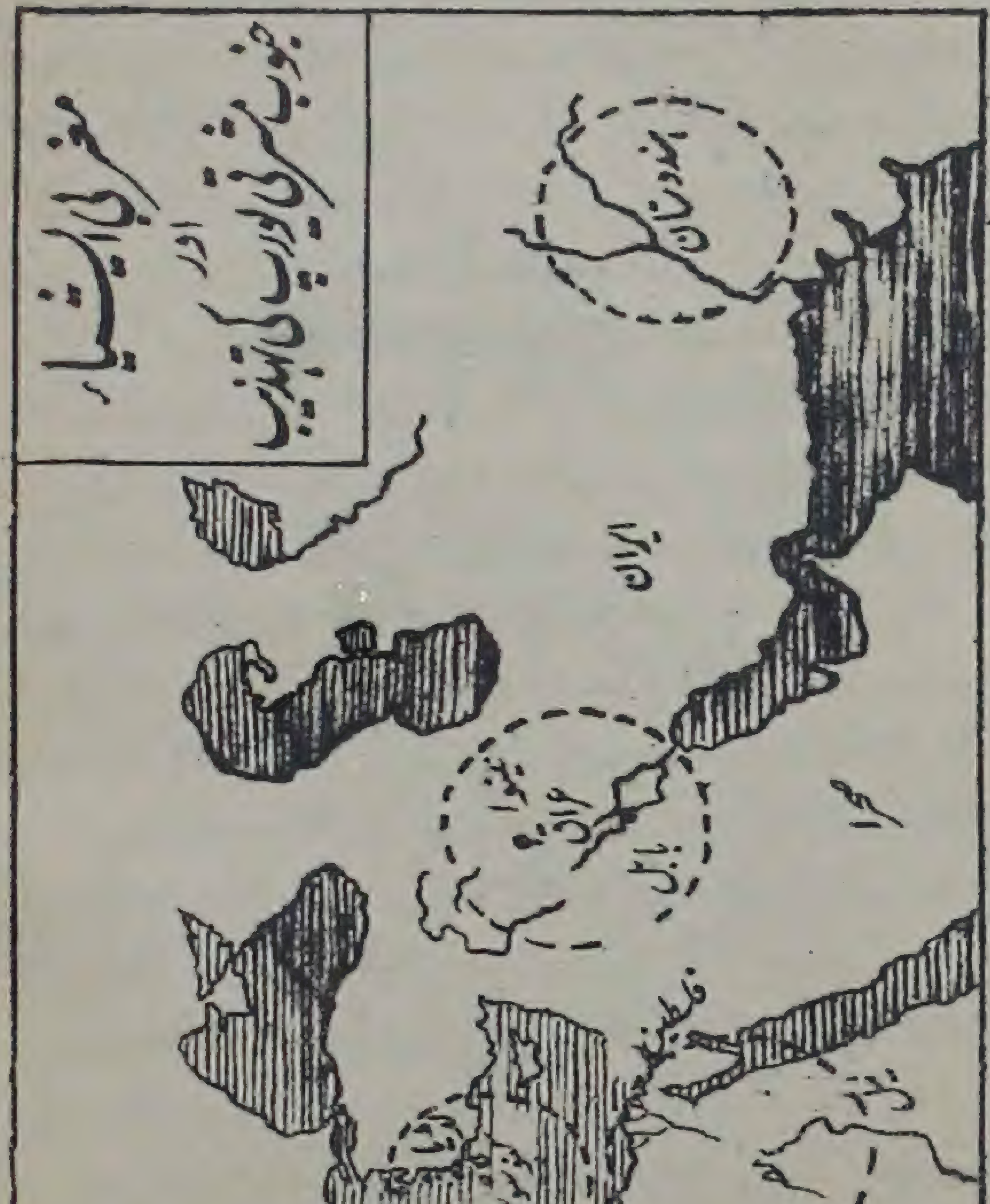
اسی طرح یونانی آریوں پر بھی Knossos کی قدیم تر تہذیب کا بہت کچھ اثر پڑا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانے میں یونانی علاقے میں اسی کا عروج تھا۔ انھوں نے اثر تو قبول کیا لیکن اسے برباد بھی کر ڈالا۔ اور گویا اس کے کھنڈروں پر اپنی تہذیب کی عمارت تیار کی۔ یہ بات تمہیں ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یونانی آریہ اور ہندوستانی آریہ دونوں اس زمانے میں بڑے اُجڈ اور سخت جنگ جو تھے۔ یہ بڑے زبردست لوگ تھے۔ اس لئے جہاں کہیں اپنے سے کمزور یا زیادہ مہذب لوگوں سے ان کا سابقہ پڑا، ان کو یا تو انھوں نے تباہ کر دیا یا اپنے میں جذب کر لیا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے Knossos بھی تباہ ہوگیا اور ان نئے یونانیوں نے یونان اور اُس کے آس پاس کے جزیروں میں اپنا قبضہ جما لیا۔ وہ سمندر کے راستے سے ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل تک، جنوبی اطالیہ اور سسلی تک حتیٰ کہ فرانس کے جنوب تک پہنچے۔ فرانس میں مارسلز انھیں کا بسایا ہوا ہے لیکن شاید ان کے آنے سے پہلے بھی وہاں فنیقی (Phoenician) آبادی تھی۔ تمھیں خیال ہوگا کہ یہ فنیقی

ایشیائے کوچک کے رہنے والے تھے اور بحری سفر میں ایسے مشاق تھے کہ تجارت کے سراغ میں دور دور تک دھاوے مارا کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ انگلستان تک جا پہنچے، اُس زمانے میں جبکہ انگلستان بالکل وحشی ملک تھا اور جب آبنائے جبرالٹر سے ہو کر اتنا طول طویل سفر کرنا بڑا خطرناک ہوگا۔

خاص یونان کے ملک میں بڑے بڑے مشہور شہر آباد ہوئے مثلاً ایتھنس، اسپارٹا، تھیبس اور کورنتھ وغیرہ۔ یونانیوں (جنھیں Hellenes بھی کہتے ہیں) کے ابتدائی زمانے کے کارناموں کا ذکر دو مشہور نظموں یعنی ایلیڈ (Iliad) اور اوڈیسی Odyssey میں ہے۔ تمھیں ان دونوں کا کچھ حال تو معلوم ہے۔ یہ بھی ہمارے تاریخی تذکروں یعنی رامائن اور مہابھارت سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ یہ دونوں نظمیں ہومر نے لکھی تھیں جو نابینا تھا۔ ایلیڈ میں حسین ہیلن کا قصہ درج ہے کہ کس طرح پیرس اُسے اپنے شہر ٹرائے کو لے اُڑا اور پھر کس طرح یونانی بادشاہوں اور رئیسوں نے ہیلن کو حاصل کرنے کے لئے ٹرائے کا محاصرہ کیا۔ اوڈیسی میں ٹرائے کے محاصرے کے بعد گھر واپس ہوتے ہوئے اوڈیسیس عرف یولیس کی جہاں گردی کا حال ہے۔ شہر ٹرائے ایشیائے کوچک میں ساحل کے قریب ہی واقع تھا۔ اب اس کا پتہ بھی نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے جُگ گذرے کہ وہ دنیا کے پردے سے مٹ چکا ہے لیکن اس شاعر کے کمال کی بدولت اس کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ جس وقت یونانی اپنے مختصر لیکن شاندار دورِ عروج کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے عین اسی زمانے میں ایک دوسری طاقت جس نے بعد کو یونان کو فتح کیا اور اس کی جگہ لے لی، چپکے چپکے ابھر رہی تھی۔ روم اسی زمانے میں بسایا گیا۔ سینکڑوں برس تک اس نے دنیا کے کارگاہ میں کوئی


مغربی ایشیا اور
جنوب مشرقی یورپ کی تہذیب
ایران
عراق
بابل
مصر
فلسطین

نمایاں حصہ نہیں لیا لیکن ایک ایسے عظیم الشان شہر کا عالم وجود میں آنا جو صدیوں تک تمام یورپ پر چھایا رہا اور جسے لوگ "ملکۂ عالم" اور "ابدی شہر" کے نام سے پکارتے تھے، قابل اظہار ضرور ہے۔ روم کے بسائے جانے کے متعلق عجیب عجیب قصے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ رمس اور رومیولس کو جنھوں نے اسے آباد کیا تھا ایک مادہ بھیڑیے نے پالا تھا۔ شاید یہ قصہ تو تمھیں معلوم ہوگا۔

جس زمانے میں روم آباد ہوا یا اس سے کچھ پہلے، قدیم زمانے کا ایک دوسرا مشہور شہر بھی آباد ہوا۔ اس کا نام کارتھیج تھا اور یہ افریقہ کے شمالی ساحل پر واقع تھا۔ اسے فونیقیوں نے بسایا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ بہت بڑی بحری طاقت بن گیا۔ اس کے اور روم کے درمیان بڑی رقابت رہی اور بہت سی جنگیں ہوئیں۔ آخر میں روم کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے کارتھیج کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔

اس سے پہلے کہ ہم آج کی گفتگو ختم کریں، آؤ ذرا فلسطین پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں۔ فلسطین نہ تو یورپ میں شامل ہے اور نہ اس کی کوئی خاص تاریخی اہمیت ہے لیکن بہت سے لوگوں کو اس کی قدیم تاریخ سے دلچسپی ہے کیونکہ توریت میں اس کا تذکرہ ہے۔ اس میں یہودیوں کے بعض قبیلوں کا قصہ ہے جو ایک چھوٹے سے خطے میں رہتے تھے اور ان کی ان لڑائیوں کا ذکر ہے جو بابل، آشوریہ اور مصر جیسے زبردست پڑوسیوں سے ہوتی رہتی تھیں۔ اگر یہ قصے یہودی اور عیسائی مذہب کا جزو نہ بن گئے ہوتے تو شاید آج انھیں دو چار ہی آدمی جانتے۔

جس وقت Knossos تباہ ہوا اس زمانے میں Saul اسرائیل کے بادشاہ تھے جو فلسطین کا ایک حصہ تھا۔ ان کے بعد داؤدؑ بادشاہ ہوئے، پھر سلیمانؑ جن کی حکمت مشہور ہے۔ میں نے ان تینوں کا یوں ذکر کر دیا کہ تم نے ان کے نام اکثر سُنے یا پڑھے ہوں گے۔

(۷)

یونان کی شہری ریاستیں

۱۱ر جنوری ۳۱ء

میں نے اپنے پچھلے خط میں یونانیوں کا کچھ حال بیان کیا تھا۔ آؤ، آج ذرا اُن پر پھر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کیسے لوگ تھے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ ان لوگوں یا ان چیزوں کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکیں جنھیں ہم نے کبھی دیکھا نہ ہو۔ ہم اپنی موجودہ معاشرت اور موجودہ حالات کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ہمارے لئے ایک ایسی دنیا کا تصور کرنا محال ہے جو ہماری دنیا سے بالکل مختلف ہو اور واقعہ بھی ہے کہ قدیم دنیا خواہ وہ ہندوستان کی ہو، چین کی ہو یا یونان کی، ہماری موجودہ دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ اس لئے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے کی کتابوں، عمارتوں اور دوسرے آثار قدیمہ سے ایک اندازہ لگالیں کہ وہ لوگ کیسے ہوں گے؟

یونان کے متعلق ایک بات بہت دلچسپ ہے۔ بظاہر یونانی بڑی بڑی سلطنتیں بنانا قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بناتے تھے یعنی ہر شہر ایک خود مختار ریاست ہوتا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں ہوتی تھیں جن کا مرکز شہر ہوتا تھا اور آس پاس کچھ آراضی اُن سے متعلق ہوتی تھی جس سے شہر کو خوراک بہم پہنچتی تھی۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ جمہوریت میں کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان یونانی ریاستوں میں بھی بادشاہ نہیں ہوتا تھا بلکہ شہر کے امرا انتظام حکومت کرتے تھے۔ عام لوگوں کا حکومت میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اس زمانے میں بہت

سے غلام بھی تھے جن کو سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ اسی طرح عورتیں بھی ان حقوق سے محروم تھیں۔ گویا ان شہری ریاستوں کے معدودے چند باشندوں کو شہریت کے حقوق حاصل تھے اور وہ شہری معاملات میں رائے دے سکتے تھے۔ عام لوگوں سے رائے لینا کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا کیونکہ وہ سب کے سب ایک جگہ آسانی سے جمع ہو سکتے تھے۔ یہ اس لئے ممکن تھا کہ شہری ریاستیں بہت چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں۔ ایک حکومت کے ماتحت کوئی بہت بڑا ملک تو تھا نہیں کہ سب لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا مشکل ہوتا۔ ذرا سوچو تو کہ سارے ہندوستان کے یا صرف ایک صوبے مثلاً بنگال یا صوبہ متحدہ کے ووٹر ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ یہی مشکل بعد میں دوسرے ملکوں کو پیش آئی اور اس کا حل نمائندہ حکومت کی صورت میں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مسئلہ طے کرنے کے لئے اس کے بجائے کہ ملک کے تمام ووٹر ایک جگہ جمع ہوں وہ اپنے نمائندے منتخب کر دیا کریں جو مل کر ملک کے عام مسائل پر غور کریں اور اس کے لئے قانون بنائیں۔ اس طرح گویا ہر شخص اپنے ملک کے انتظام حکومت میں بالواسطہ طور پر مدد کرتا ہے۔

لیکن یونان میں یہ صورت نہ تھی۔ اس نے تو اس مشکل کو یوں حل کر لیا تھا کہ شہری ریاستوں سے بڑی ریاست ہی نہ رکھی تھی۔ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ یونانی دور دور پھیل گئے تھے یعنی سارے یونان کے علاوہ جنوبی اطالیہ، سسلی اور بحیرۂ روم کے دوسرے ساحلوں تک۔ لیکن انھوں نے ایک سلطنت یعنی ان سب محکوم ملکوں کی ایک واحد حکومت قائم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ جہاں کہیں وہ پہنچے انھوں نے اپنی جداگانہ شہری ریاستیں قائم کر لیں۔

ہندوستان میں بھی بالکل ابتدائی زمانے میں یونانی شہری ریاستوں سے ملتی جلتی چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں یا سلطنتیں تھیں لیکن بظاہر وہ زیادہ عرصے تک

باقی نہ رہ سکیں اور بڑی سلطنتوں نے انھیں اپنے میں شامل کرلیا۔ اسی طرح مدت تک ہماری گاؤں کی پنچایتوں کو بھی اقتدار حاصل رہا۔ شاید شروع شروع میں قدیم آریوں کی بھی یہی عادت تھی کہ جہاں کہیں وہ جاتے چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں قائم کرتے تھے۔ لیکن جب انھیں دوسری قدیم تر تہذیبوں اور نئے جغرافی حالات سے سابقہ پڑا تو انھوں نے بھی اکثر ملکوں میں رفتہ رفتہ یہ طریقہ چھوڑ دیا۔ خصوصاً ایران میں تو بہت بڑی بڑی سلطنتیں بنیں اور ہندوستان میں بھی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ لیکن یونان میں شہری ریاستوں کا طریقہ مدت تک یعنی اس وقت تک جاری رہا جب ایک مشہور و معروف یونانی نے جہاں تک ہمیں علم ہے پہلی بار دنیا کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ یہ سکندر اعظم تھا۔ ہم اس کا کچھ حال بعد میں بیان کریں گے۔

غرض یونانیوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں کو ملا کر کوئی بڑی ریاست، سلطنت یا جمہوریت کبھی نہیں بنائی۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے اقتدار سے آزاد تھے بلکہ قریب قریب ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے بھی رہتے تھے۔ ان میں آپس میں بڑی رقابت تھی جس کا نتیجہ اکثر جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔

اس اختلاف کے باوجود ان شہری ریاستوں میں بہت سی چیزیں مشترک بھی تھیں۔ ان کی ایک زبان بھی تھی۔ ایک تمدن تھا اور ایک مذہب تھا۔ ان کے مذہب میں بھی بہت سے دیوی دیوتا مانے جاتے تھے اور ہندو دیومالا کی طرح ان کا علم الاصنام بھی نہایت دلکش اور رنگین تھا۔ وہ حسن کی پرستش کرتے تھے۔ اب بھی ان کے زمانے کے پتھر اور سنگ مرمر کے مجسمے موجود ہیں جن کے حسن و جمال کو دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ خوبصورت اور توانا جسم کے قائل تھے اس لئے طرح طرح کے کھیلوں اور دوڑوں کا انتظام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ

اولمپس پہاڑ پر وقتاً فوقتاً یہ کھیل بہت بڑے پیمانے پر ہوا کرتے تھے اور تمام یونان کے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔ تم نے سنا ہوگا کہ اب بھی اولمپک کھیل ہوتے ہیں۔ یہ انھیں یونانی کھیلوں کے نام پر رکھا گیا ہے جو اولمپک پہاڑ پر ہوا کرتے تھے۔ اب ان کا اطلاق ان کھیلوں اور مقابلوں پر ہوتا ہے جو مختلف ملکوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

غرض یونان کی شہری ریاستیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ صرف کھیلوں یا بعض دوسرے اجتماعوں کے موقع پر آپس میں ملتی تھیں ورنہ اکثر لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ لیکن اگر کوئی بیرونی حملہ ہوتا تو سب اس کے مقابلے میں متحد ہو جاتی تھیں۔ یہ میں نے ایرانی حملے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا تذکرہ میں آگے چل کر کروں گا۔

(۸)

مغربی ایشیا کی سلطنتیں

۱۳ جنوری سنہ ۳۱ء

بڑا اچھا ہوا کہ کل تم سب سے ملاقات ہو گئی۔ لیکن دادو کو دیکھ کر بہت قلق ہوا۔ وہ تو بہت کمزور اور بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی خوب خدمت کرنا تاکہ وہ بہت جلد تندرست ہو جائیں۔ تم سے تو میں کل اچھی طرح بات بھی نہ کر سکا۔ اس مختصر سی ملاقات میں بھلا کوئی کیا کیا کرے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ باتوں اور ملاقاتوں کی کمی ان خطوں سے پوری ہو جائے۔ لیکن بھلا پوری طرح تلافی کہاں ہو سکتی ہے اور اس طرح دل کو کب تک بہلا سکتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی اس سے کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔

اچھا تو ہم پرانی قوموں کا ذکر کر رہے تھے۔ ہم نے قدیم یونانیوں پر نظر ڈالی تھی۔ اب دیکھیں کہ اس زمانے میں دوسرے ملکوں کا کیا رنگ تھا۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرف کچھ زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے حالات کے بارے میں کم سے کم جہاں تک کہ مجھے علم ہے کوئی ایسی قابل ذکر بات معلوم نہیں ہوئی۔ غالباً شمالی یورپ کی آب و ہوا رفتہ رفتہ بدلتی گئی اور اس کی وجہ سے حالات بھی ضرور بدلے ہوں گے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ اب سے ہزاروں برس پہلے شمالی یورپ اور شمالی ایشیا میں سخت سردی پڑتی تھی۔ اس لئے اسے برف کا دور کہتے ہیں۔ اس زمانے میں گلیشیر یعنی برف کی بڑی بڑی چٹانیں وسطی یورپ تک آ پہنچتی تھیں۔ غالباً اس وقت وہاں انسان کا وجود نہ تھا یا اگر تھا تو وہ انسانوں سے زیادہ جانوروں سا ملتا جلتا ہوگا۔ شاید تم یہ کہو کہ ہمیں کیسے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں برف کی

چٹانیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا ذکر کتابوں میں تو ہو نہیں سکتا اس لئے کہ ان دنوں نہ تو کتابیں تھیں اور نہ ان کے لکھنے والے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تم قدرت کی کتابوں سے واقف ہوگی۔ قدرت ان چٹانوں اور پتھروں پر اپنی تاریخ خود لکھتی رہتی ہے اور جو پڑھنا چاہیں اسے پڑھ سکتے ہیں۔ گویا ایک قسم کی آپ بیتی ہے یعنی اپنی کہانی اپنی زبانی۔ اچھا سنو! یہ برف کی چٹانیں اپنے پیچھے ایک خاص قسم کے نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ اگر ایک بار تم ان نشانوں کو پہچان لو تو پھر کبھی غلطی نہیں کر سکتیں۔ اب اگر تم ان نشانوں کو پہچاننا چاہتی ہو تو جاکر ہمالیہ یا ایلپس یا کسی اور جگہ کے برف کی چٹانیں دیکھو۔ ہاں، ایلپس میں موں بلاں کے آس پاس تو تم نے یہ چٹانیں اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں لیکن شاید کسی نے تمھیں یہ نشان نہیں بتائے۔ کشمیر میں اور ہمالیہ کے دوسرے حصوں میں بھی بہت سی اچھی اچھی برف کی چٹانیں ہیں۔ ہم سے سب سے زیادہ قریب پنڈاری گلیشیر ہے جو الموڑے سے کوئی ہفتے بھر کا راستہ ہے۔ جب میں بہت چھوٹا تھا یعنی تم سے بھی چھوٹا تو ایک مرتبہ وہاں گیا تھا لیکن وہ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے۔

یہ لو، پچھلے زمانے کے حالات بیان کرتے کرتے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا یعنی برف کی چٹانوں اور پنڈاری کا ذکر کرنے لگا۔ جب آدمی اپنا دل بہلانے کے لئے جھوٹ موٹ کی کوئی بات فرض کرلے تو یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ میں تم سے اس طرح باتیں کرنا چاہتا ہوں جیسے تم میرے سامنے بیٹھی ہو اور اس میں تو پھر یہ ہونا ہی ہے کہ ہم کبھی کبھی بہک کر گلیشیر وغیرہ تک پہنچ جائیں۔

برف کے پہاڑوں کی بات یوں نکل آئی کہ میں نے برف کے دور کا ذکر شروع کیا تھا۔ ہاں تو ہم یہ بات کہ برف کے پہاڑ وسطی یورپ اور انگلستان تک لڑھک لڑھک کر آجاتے تھے اس وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ان ملکوں میں ہمیں

ان کے وہ خاص نشان اب تک ملتے ہیں۔ یہ نشان پرانی پرانی چٹانوں پر ملتے ہیں، جس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس زمانے میں وسطی اور شمالی یورپ میں سخت سردی پڑتی ہوگی۔ بعد میں وہاں گرمی ہونے لگی اور یہ برف کی چٹانیں رفتہ رفتہ پگھل گئیں۔ آراضیات کے ماہر یعنی وہ لوگ جو زمین کی بناوٹ کا حال جانتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ اس سرد دور کے بعد پھر گرم دور شروع ہوا یعنی اس وقت یورپ میں جتنی گرمی پڑتی ہے اس سے کہیں زیادہ گرمی ہوگئی۔ اس گرمی کی وجہ سے یورپ میں گھنے جنگل کھڑے ہو گئے۔

آریہ لوگ پھرتے پھراتے وسطی یورپ بھی پہنچے۔ اس زمانے میں انھوں نے وہاں کوئی قابل ذکر بات نہیں کی اس لئے اس وقت انھیں ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یونان اور بحیرۂ روم کے مہذب لوگ غالباً وسطی اور شمالی یورپ کے ان لوگوں کو وحشی سمجھتے تھے لیکن یہ "وحشی" اپنے گانووں اور جنگلوں میں تندرست اور سپاہیانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو اُس دن کے لئے تیار کر رہے تھے جب وہ جنوب کے مہذب لوگوں کی حکومتوں پر جھپٹ کر انھیں برباد کر دینے والے تھے۔ لیکن یہ صورت تو ایک مدت بعد ہوئی۔ اس لئے ہم پہلے سے اس کا ذکر کیوں کریں۔

خیر شمالی یورپ کا تو ہمیں کچھ حال معلوم بھی ہے لیکن دوسرے براعظموں اور بڑے بڑے ملکوں کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں۔ کہتے ہیں کہ امریکہ کو کولمبس نے دریافت کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کولمبس سے پہلے وہاں مہذب لوگ بستے ہی نہ تھے۔ اب اس کا ثبوت مل رہا ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ بہر حال ہمیں امریکہ کا اس زمانے کا کچھ حال معلوم نہیں ہے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اسی طرح مصر اور بحیرۂ روم کے ساحل کے سوا ہمیں براعظم افریقہ کے اور حصوں کے متعلق

بھی کچھ علم نہیں۔ البتہ مصر کی عظیم الشان اور قدیم تہذیب کا اس وقت زوال شروع ہوگیا تھا۔ پھر بھی وہ بہت ترقی یافتہ ملک تھا۔

اب ذرا دیکھو کہ اس وقت ایشیا کس حال میں تھا۔ یہاں قدیم تہذیب کے تین مرکز تھے یعنی مسوپوٹامیا (عراق)، ہندوستان اور چین۔

مسوپوٹامیا:۔ ایران اور ایشیائے کوچک میں اس ابتدائی دور میں بھی سلطنتوں پر سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں، مثلاً آشوری سلطنت Assyrian Empire میدی سلطنت Median Empire، بابل اور آخر میں ایران۔ ہمیں اس تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس طرح یہ سلطنتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں، کچھ دن تک امن و آشتی سے رہیں اور پھر انھوں نے ایک دوسرے کو برباد کر دیا۔ بہر حال مغربی ایشیا کی ان سلطنتوں اور یونان کی شہری ریاستوں میں تمہیں فرق ضرور محسوس ہوگا۔ ان ملکوں میں شروع ہی سے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا شوق پایا جاتا ہے۔ شاید یہ ان کی تہذیب کے زیادہ قدیم ہونے کی وجہ سے ہو یا اس کے دوسرے سبب ہوں۔

ایک نام سے شاید تمھیں دلچسپی ہو یعنی قارون کے نام سے۔ اس کا ذکر تم نے ضرور سُنا ہوگا۔ انگریزی زبان میں عام طور سے دولت میں قارون سے مثال دی جاتی ہے۔ تم نے اس قارون کے قصے بھی پڑھے ہوں گے کہ وہ کتنا مغرور تھا اور کس طرح ذلیل ہوا۔ قارون ملک لیڈیا Lydia کا بادشاہ تھا۔ یہ ایشیا کے مغربی ساحل پر واقع تھا جہاں اب ایشیائے کوچک ہے۔ چونکہ یہ ملک سمندر کے کنارے واقع تھا اس لئے غالباً وہاں تجارت کو بہت فروغ ہوا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ قارون کے پاس بہت دولت تھی۔ اُس کے زمانے

میں سائرس Cyrus کے ماتحت ایرانی سلطنت ترقی پر تھی اور اس کی قوت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ سائرس اور قارون کا مقابلہ ہوگیا اور سائرس کے ہاتھوں اُسے شکست کھانا پڑی۔ اس کی اس شکست کا حال اور یہ قصہ کہ مصیبت پڑنے پر مغرور قارون کی کس طرح آنکھیں کھلیں اور ہوش آیا ایک یونانی مورخ ہیروڈوٹس Herodotus نے بیان کیا ہے۔

سائرس کی سلطنت بہت بڑی تھی حتیٰ کہ مشرق میں ہندوستان تک پہنچی تھی لیکن اُس کے ایک جانشین دارا کی سلطنت اس سے بھی بڑھ گئی۔ اس میں ایک طرف مصر، دوسری طرف وسطی ایشیا کا ایک ٹکڑا اور تیسری طرف سندھ ندی کے پاس کا ہندوستان کا کچھ حصہ بھی شامل تھا۔ سنا ہے کہ اس ہندوستانی صوبے سے سونے کی ریت کی بہت بڑی مقدار خراج کے طور پر اس کی خدمت میں بھیجی جاتی تھی۔ اس زمانے میں سندھ ندی کے قریب سونے کی ریت نکلتی ہوگی۔ اب بالکل نہیں نکلتی۔ اب تو وہ سارا علاقہ ویران پڑا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا بھی کتنی بدل گئی ہے۔

جب تم تاریخ پڑھوگی اور پچھلے حالات کا موجودہ حالات سے مقابلہ کروگی تو جو چیز تمھیں سب سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوگی وہ وسطی ایشیا کا انقلاب ہے۔ اسی جگہ سے بے شمار قبیلے، مردوں اور عورتوں کے ٹڈی دل کی طرح، نکلے اور دور دور ملکوں میں پھیل گئے۔ یہیں پر کسی زمانے میں آباد اور دولت مند شہر تھے جو یورپ کی موجودہ راج دھانیوں کی ٹکر کے تھے اور ہمارے آج کے کلکتہ بمبئی سے کہیں بڑے تھے۔ ہر جگہ چمن اور سبزہ زار تھے۔ آب و ہوا بڑی خوش گوار اور معتدل تھی، نہ بہت ٹھنڈی، نہ بہت گرم۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت تک تھا۔ اب تو سینکڑوں برس سے وہ ایک ویران اور بنجر ملک ہے، قریب قریب

ریگستان کی طرح کا۔ پچھلے زمانے کے چند بڑے بڑے شہر اب بھی باقی ہیں، مثلاً سمرقند اور بخارا محض ان کے نام سے نہ جانے کن کن چیزوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے مگر اب ان کا ڈھانچہ ہی ڈھانچہ رہ گیا ہے۔

لیکن میں نے پھر آگے کی بات کہنی شروع کر دی جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں تو نہ سمرقند تھا نہ بخارا۔ یہ تو آگے چل کر پیدا ہوئے۔ ابھی تو مستقبل کی نقاب ان پر پڑی تھی اور وسطی ایشیا کے عروج اور زوال کا زمانہ بہت دور تھا۔

قدیم روایات کا بوجھ

۱۴ جنوری ۳۱ء

جیل میں میری عجیب عجیب عادتیں پڑ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں بہت سویرے یعنی پو پھٹنے سے بھی پہلے اٹھ بیٹھتا ہوں۔ یہ عادت مجھے پچھلی گرمیوں سے پڑی۔ پو پھٹنے اور ستاروں کے رفتہ رفتہ غائب ہونے کا نظارہ مجھے بہت پسند آیا۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ صبح تڑکے کس طرح چاندنی آہستہ آہستہ پھیکی پڑتی جاتی ہے اور دن کی روشنی پھیلتی جاتی ہے؟ میں نے اکثر چاندنی اور صبح صادق کی یہ کشمکش جس میں ہمیشہ صبح کو فتح ہوتی ہے دیکھی ہے۔ اس دھندلکے کا کچھ عجیب سماں ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ چاندنی ہے یا دن نکل رہا ہے۔ پھر کچھ یکایک سارا شبہ دور ہو جاتا ہے اور دن نکل آتا ہے، چاند کا چہرہ اتر جاتا ہے اور وہ ہار کر میدان چھوڑ دیتا ہے۔

حسب عادت آج بھی میں پچھلے پہر اٹھ بیٹھا۔ ستارے ابھی تک چھٹکے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ کہ صبح ہونے والی ہے صرف ہوا کی اس خاص کیفیت سے ہو سکتا ہے جو پو پھٹنے سے پہلے ہوتی ہے۔ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ یکایک صبح کی خاموشی کو دور کی آوازوں اور ایک دھیمے سے شور نے توڑا جو رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ آج سنکرانت یعنی ماگھ میلے کا پہلا دن ہے اور سنگم میں (جہاں گنگا اور جمنا ملتی ہیں اور سادتری بھی جو نظر نہیں آتی لیکن لوگوں کے عقیدے کے مطابق ان میں آملتی ہے) یاتری لوگ تڑکے ہی تڑکے غوطہ لگانے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں

آرہے ہیں۔ وہ گاتے جاتے ہیں اور کبھی کبھی "گنگا مائی کی جے" کے نعرے بھی لگاتے ہیں۔ انھی کی آوازیں جیل کی دیواروں کو پار کر کے میرے پاس آرہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ عقیدے میں کتنی طاقت ہے کہ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ندی کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے افلاس اور مصیبت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں برس سے یہ یاتری ہر سال تربینی میں اشنان کرنے آیا کرتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں آتے اور چلے جاتے ہیں۔ حکومتیں اور سلطنتیں چند روز اپنا زور دکھاتی ہیں پھر ماضی کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہیں۔ لیکن روایات اپنی جگہ پر رہتی ہیں اور نسلاً بعد نسلٍ لوگ اس کے سامنے جھکتے چلے آتے ہیں۔ روایات میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں لیکن بعض اوقات یہ ایسا زبردست بوجھ بن جاتی ہیں کہ ہمیں آگے قدم بڑھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ خیال بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے کہ ایک سلسلے نے جو کبھی نہیں ٹوٹتا ہمیں اپنے دھندلے اور بعید ماضی سے وابستہ کر رکھا ہے اور اب سے تیرہ سو برس پہلے کے میلوں کا حال پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ میلہ اُس زمانے میں بھی بڑی پرانی چیز سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب ہم آگے بڑھنا چاہیں تو یہ زنجیر ہمیں نہیں چھوڑتی اور ہم روایات کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہمیں ماضی سے بہت رشتے قائم رکھنے ہوں گے لیکن جہاں کہیں یہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکیں گے، ہمیں روایات کی قید کو توڑنا بھی ہوگا۔

پچھلے تین خطوں میں ہم نے یہ نقشہ کھینچنے کی کوشش کی تھی کہ ڈھائی ہزار سے تین ہزار سال پہلے کی دنیا کی کیا حالت تھی۔ واقعات کے سنہ میں نے نہیں لکھے تھے، کیونکہ مجھے ان کا شوق نہیں اور تمھیں بھی ان کی الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے مختلف واقعات کے صحیح سنہ معلوم کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ آگے چل کر شاید کہیں کہیں چند سنہ بتانے اور یاد رکھنے کی ضرورت پڑے،

تاکہ ذہن میں واقعات کی صحیح ترتیب قائم رہے۔ فی الحال تو ہم قدیم دنیا کا محض ایک تصور قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہم یونان، بحیرہ روم، مصر، ایشیائے کوچک اور ایران کی قدیم تاریخ کی ایک جھلک تو دیکھ چکے۔ اب ہمیں اپنے ملک پر نظر ڈالنا چاہیے۔ ہندوستان کی ابتدائی تاریخ کی چھان بین کرنے میں ہمیں ایک مشکل پیش آتی ہے۔ وہ یہ کہ پہلے زمانے کے آریہ جنھیں ہندی آریہ بھی کہتے ہیں تاریخیں لکھنے کے عادی نہ تھے۔ ہم پچھلے خطوں میں یہ بتا چکے ہیں کہ بہت سی باتوں میں یہ لوگ کتنے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی کتابوں، مثلاً وید، اپنشد، رامائن اور مہابھارت وغیرہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ ان کتابوں اور بعض دوسری چیزوں سے ہمیں پہلی تاریخ کے جاننے میں مدد ملتی ہے۔ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کے طور طریقے، رسم و رواج اور طرز معاشرت کیا تھی اور ان کی دماغی نشو و نما کہاں تک ہوئی تھی۔ لیکن انھیں صحیح معنوں میں تاریخ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ سنسکرت میں صرف ایک تاریخ موجود ہے لیکن یہ بہت بعد کے زمانے کی ہے۔ یہ کشمیر کی تاریخ ہے جسے راج ترنگنی کہتے ہیں اور جسے کلہانا نے تصنیف کیا تھا۔ اس میں کشمیر کے بادشاہوں کا حال ہے۔ تمھیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ آجکل تمھارے رنجیت پھوپھا[1] کشمیر کی اس زبردست تاریخ کا سنسکرت سے ترجمہ کر رہے ہیں۔ قریب قریب وہ آدھی کتاب کا ترجمہ ختم کر چکے ہیں۔ یہ بہت ضخیم کتاب ہے۔ جب پورا ترجمہ ختم ہو جائے گا اور یہ چھپ جائے گی تو ہم سب بڑے شوق سے اسے پڑھیں گے کیونکہ بدقسمتی سے ہم لوگ اتنی سنسکرت تو جانتے نہیں کہ اصل کتاب پڑھ سکیں۔ ہم اسے محض ایک اچھی کتاب سمجھ کر نہیں پڑھیں گے بلکہ اس لئے کہ اس سے ہمیں پرانے زمانے کا بہت کچھ حال معلوم

---

[1] رنجیت ایس پنڈت۔

ہوگا خصوصاً کشمیر کا جو کہ تم جانتی ہو کہ ہمارا اصلی گھر تھا۔

جب آریہ ہندوستان آئے اس وقت یہ کافی مہذب تھا۔ موہن جو دارو میں جو آثار نکلے ہیں ان سے تو اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ آریوں کے آنے سے بہت پہلے یہاں عظیم الشان تہذیب و تمدن موجود تھا۔ لیکن ابھی تک ہمیں اس کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوئی ہے۔ غالباً چند سال میں جب آثار قدیمہ کے ماہر (جو پرانے آثار کی چھان بین کرتے ہیں) یہاں سے سب کچھ کھود کر نکال لیں گے تو ہمیں اور حالات معلوم ہوں گے۔

اس کے علاوہ یوں بھی یہ بات ثابت ہے کہ دراوڑ لوگ جنوبی ہند میں، اور شاید شمالی ہند میں بھی، اعلیٰ ترین تہذیب کے مالک تھے۔ ان کی زبانیں جو آریوں کی سنسکرت سے نہیں نکلی ہیں بہت قدیم ہیں اور ان میں بہت عمدہ ادب موجود ہے۔ ان کے نام تامل، تلنگی، کناری اور ملیالم ہیں۔ یہ سب زبانیں جنوبی ہند میں اب بھی رائج ہیں یعنی برطانوی حکومت کی تقسیم کے مطابق صوبۂ مدراس اور صوبہ بمبئی میں۔ شاید تمہیں علم ہو کہ صوبوں کی تقسیم کے معاملے میں کانگریس نے زیادہ سمجھداری کا ثبوت دیا ہے اور زبانوں کے اعتبار سے صوبوں کی تقسیم کی ہے۔ یہ صورت زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس طرح ایک زبان کے بولنے والے اور عموماً ایک سے رسم و رواج رکھنے والے لوگ ایک حلقے میں آجاتے ہیں۔ جنوب میں کانگریس نے حسب ذیل صوبے قائم کئے ہیں:۔ اندھرا دیس یا صوبۂ اندھرا جو صوبہ مدراس کے شمال میں ہے اور جہاں تلنگی بولی جاتی ہے۔ تامل ناڈ یا صوبۂ تامل جہاں تامل بولی جاتی ہے۔ کنارا جو صوبۂ بمبئی کے جنوب میں ہے اور جہاں کنڑی زبان بولی جاتی ہے اور کیرالا (جو قریب قریب ملابار کا علاقہ ہے) جہاں ملیالم زبان بولی جاتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ صوبوں کی آئندہ تقسیم میں زبانوں کا بڑی حد تک لحاظ رکھا جائے گا۔

زبانوں کی جب بات چھڑ گئی تو آؤ ہندوستان کی زبانوں کا کچھ اور حال بیان کردیں۔ یورپ اور دوسرے ملکوں کے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں صدہا زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ بالکل لغو خیال ہے اور جو کوئی یہ کہتا ہے وہ گویا اپنی لاعلمی کا ثبوت دیتا ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں بے شمار بولیاں یعنی ایک ہی زبان کی مختلف مقامی صورتیں ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں بہت سی پہاڑی اور طرح طرح کی دوسری قومیں بھی آباد ہیں جو اپنی خاص زبانیں بولتی ہیں لیکن اتنے بڑے ملک میں بھلا وہ کس شمار میں ہیں، بلکہ اُن کی جو کچھ اہمیت ہے مردم شماری کی رپورٹ میں ہے۔ ہندوستان کی خاص خاص زبانیں جیسا کہ میں شاید اپنے پچھلے کسی خط میں بھی تذکرہ کرچکا ہوں صرف دو خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں یعنی دراوڑی اور ہندی آریائی۔ ہندی آریوں کی خاص زبان سنسکرت تھی، اور ہندی، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی اسی کی شاخیں ہیں۔ ان کے علاوہ چند زبانیں اور ہیں جو ان سے تھوڑی سی مختلف ہیں مثلاً آسام میں آسامی اور اُڑیسہ یا اُتکل میں اُڑیہ بولی جاتی ہے۔ اردو، ہندی ہی کی دوسری شکل ہے اور ہندوستانی سے ہندی اور اردو دونوں مراد لی جاتی ہیں۔ گویا ہندوستان کی خاص زبانیں صرف دس ہوئیں یعنی ہندوستانی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلنگی، کناری، ملیالم، اوڑیہ اور آسامی۔ ان میں سے ہندوستانی جو ہماری مادری زبان ہے تمام شمالی ہند یعنی پنجاب، صوبجات متحدہ، صوبجات متوسط، راجپوتانہ، دہلی اور سنٹرل انڈیا میں بولی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑا رقبہ ہوا جس میں ۱۳ کروڑ کی آبادی ہے۔ تم نے دیکھا کہ ۱۳ کروڑ آدمی، تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ ہندوستانی بولتے ہیں اور تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کے تمام حصوں میں ہندوستانی کم و بیش سمجھی جاسکتی ہے، گویا یہی ہندوستان کی عام زبان بننے والی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ باقی زبانیں جن کا میں تذکرہ کرچکا ہوں

فنا ہو جائیں گی۔ صوبے کی زبانوں کی حیثیت سے انھیں یقیناً باقی رہنا چاہیے کیونکہ ان میں اعلیٰ ادب موجود ہے اور لوگوں کو ان کی ترقی یافتہ زبان سے محروم ہونے کا کبھی خیال نہ کرنا چاہیے کیونکہ لوگوں کے ترقی کرنے کا اور ان کے بچوں کی تعلیم حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ صرف ان کی مادری زبان ہو سکتی ہے۔ لیکن آج کل ہندوستان کا تو ڈھنگ ہی نرالا ہے، یعنی ہم آپس میں بھی زیادہ تر انگریزی استعمال کرتے ہیں۔ میرا تم کو انگریزی میں خط لکھنا نہایت مضحک ہے۔ لیکن میں پھر بھی یہ لغویت کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہمیں اس بیہودہ عادت سے نجات مل جائے گی۔

(۱۰)

قدیم ہندوستان کی دیہی جمہوریتیں

۱۵ جنوری سنہ ۳۱ء

قدیم تاریخ کے مطالعے کا سلسلہ آگے چلے تو کیوں کر چلے! میں بار بار سیدھا راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہوں۔ ابھی پچھلے خط میں ٹھیک اس وقت جبکہ اصل موضوع شروع ہونے والا تھا میں نے ہندوستان کی زبانوں کی بحث چھیڑ دی۔

خیر! اب ہم پھر قدیم ہندوستان کی تاریخ کو جہاں سے چھوڑا تھا شروع کرتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ آج کل جسے افغانستان کہتے ہیں یہ ملک بھی اس زمانے میں اور اس کے بعد عرصے تک ہندوستان کا ایک حصہ رہا ہے۔ اس شمالی و مغربی ہندوستان کو گندھارہ کہتے تھے۔ شمال میں اور سندھ اور گنگا ندیوں کے میدانوں میں آریوں کی بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں۔ یہ نو وارد آریہ غالباً فنِ تعمیر سے اچھی طرح واقف تھے کیونکہ ان میں سے اکثر لوگ ایران اور میسوپوٹامیہ (عراق) سے آئے ہوں گے جہاں اس وقت بھی بڑے بڑے شہر آباد تھے۔ ان آریوں کی مختلف بستیوں کے درمیان بہت سے جنگل تھے، خصوصاً شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان تو ایک بہت بڑا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ غالباً ان میں سے زیادہ لوگ ان جنگلوں کو پار کرکے جنوبی ہند میں بسنے کے لئے نہ گئے ہوں گے۔ پھر بھی بہت سے لوگ نئے مقامات دریافت کرنے، تجارت کرنے اور وہاں اپنی تہذیب اور روایات پھیلانے کی غرض سے ضرور پہنچے ہوں گے۔ روایت یوں مشہور ہے کہ جنوب میں سب سے پہلے جس

آریہ نے قدم رکھا اس کا نام رشی آگستیہ تھا۔ یہی شخص آریہ مذہب اور آریہ تہذیب کا پیغام سب سے پہلے دکن میں لے گیا۔

اس زمانے میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان تجارت فروغ پر تھی۔ جنوب کی مرچوں، سونے اور موتیوں کی تلاش میں سمندر پار سے دور دور کے تاجر آیا کرتے تھے۔ چاول بھی شاید باہر جاتا تھا اور ملابار کی ساگون کی لکڑی تو بابل کے قدیم محلوں میں پائی گئی ہے۔

رفتہ رفتہ آریوں نے ہندوستان میں دیہی نظام قائم کیا۔ یہ کچھ تو قدیم دراوڑی اور کچھ جدید آرین خیالات سے مل جل کر بنا تھا۔ اس نظام کے ماتحت ان کے گاؤں قریب قریب خودمختار تھے اور ان کی منتخب کی ہوئی پنچایتیں حکمرانی کرتی تھیں۔ پھر بہت سے گاؤں یا چھوٹے چھوٹے قصبے مل کر ایک راجہ یا سردار کے ماتحت ہوتے تھے جسے کبھی لوگ منتخب کرتے تھے اور کبھی وراثتاً وہ اس منصب کا حق دار ہوتا تھا۔ اکثر مختلف دیہی ریاستیں آپس میں اشتراک عمل کرکے سڑکیں، سرائیں، آبپاشی کی نہریں اور اسی قسم کی مفاد عامہ کی مشترکہ چیزیں بناتی تھیں۔ جہاں تک معلوم ہوا ہے یہ راجہ اگرچہ اپنی ریاست کا حاکم ہوتا تھا لیکن من مانی کارروائی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے بھی آریہ قانون اور رواج کی پابندی کرنی پڑتی تھی اور جمہور اسے گدی سے اتارنے یا سزا دینے کا حق رکھتے تھے۔ میں نے اپنے پچھلے خطوں میں یورپ کے ایک بادشاہ کے اس قول کا ذکر کیا ہے "میں خود ریاست ہوں"۔ یہاں یہ صورت نہیں تھی۔ گویا آریوں کی بستیوں میں ایک طرح کی جمہوری حکومت تھی اور وہاں کے باشندوں کو کسی حد تک انتظام حکومت میں دخل حاصل تھا۔

اب ان ہندوستانی آریوں کا ذرا یونانی آریوں سے مقابلہ کرو۔ دونوں میں بہت سی باتیں مختلف ملیں گی لیکن بہت سی ملتی جلتی بھی ہیں مثلاً دونوں جگہ

کسی نہ کسی شکل میں جمہوریت موجود تھی۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہ جمہوریت آریوں نے کم و بیش اپنے تک محدود رکھی تھی۔ ان کے غلاموں کو یا ان لوگوں کو جنھیں وہ نیچ ذات سمجھتے تھے کوئی حق یا آزادی حاصل نہ تھی۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح ذات پات کا یہ شاخ در شاخ نظام نہ تھا بلکہ ہندوستانی آریوں میں سماج کے صرف چار طبقے یعنی چار ذاتیں تھیں یعنی برہمن جو پنڈت، پروہت یا سنیاسی وغیرہ ہوتے تھے چھتری جو سپاہی یا حاکم ہوتے تھے، ویش جو تاجر ہوتے تھے اور شودر جو محنت مزدوری اور خدمت کرتے تھے۔ گویا یہ تقسیم پیشوں کی بنا پر کی گئی تھی۔ ممکن ہے اس ذات پات کی بنیاد اس خواہش پر ہو کہ آریہ لوگ مفتوح قوم سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ آریہ اتنے مغرور اور خود بیں تھے کہ وہ اپنے علاوہ سب کو ذلیل سمجھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ دوسروں میں خلط ملط ہو جائیں۔ ذات کے لیے سنسکرت میں لفظ "ورن" ہے۔ اس کے معنی ہی "رنگ" کے ہیں۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ آریہ جو ہندوستان آئے یہاں کے اصلی باشندوں کے مقابلے میں زیادہ گورے تھے۔

گویا ہمیں دو باتیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ یعنی ایک طرف آریوں نے محنت پیشہ طبقے کو تو غلام بنا کر رکھا اور انھیں اپنی جمہوریت میں شریک نہیں کیا، مگر دوسری طرف اپنے درمیان بڑی آزادی قائم رکھی۔ وہ اپنے بادشاہوں یا حاکموں کو بے عنوانی کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اگر حاکم کوئی بے عنوانی کرتا تو فوراً گدی سے اتار دیا جاتا۔ راجہ عموماً چھتری قوم میں سے ہوتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی جنگ یا مصیبت کے زمانے میں شودر بھی تخت حاصل کر سکتے تھے بشرطیکہ وہ اس کے اہل ثابت ہوتے۔ آگے چل کر ان آریوں کی حالت بہت گر گئی اور ذات پات کے معاملے میں شدت پیدا ہو گئی۔ اس میں سیکڑوں شاخیں پھوٹ نکلیں

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کمزور ہوگیا اور اس پر زوال آگیا۔ انھوں نے آزادی کی پرانی روایات بھی بھلادیں حالانکہ پہلے زمانے میں یہ مثل مشہور تھی کہ آریہ کبھی غلام نہیں ہوسکتا۔ آریوں کے نام کو بٹا لگانے سے اس کے نزدیک موت بہتر تھی۔

آریوں کی بستیاں، ان کے قصبے اور شہر اٹکل پچو آباد نہیں ہوگئے تھے بلکہ نقشوں کے مطابق بسائے گئے تھے اور تمھیں یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ یہ نقشے اقلیدس کے مطابق بنائے گئے تھے۔ اس زمانے میں ویدک پوجا میں بھی اقلیدس کی شکلوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اب بھی بہت سے ہندو گھروں میں مختلف پوجاؤں کے موقع پر یہ شکلیں استعمال ہوتی ہیں۔ مکانوں اور شہروں کی تعمیر سے اقلیدس کا بڑا تعلق ہے۔ آریوں کے پرانے زمانے کے گاؤں شاید پہلے پہل قلعہ بند چھاؤنی کی طرح کے ہونگے۔ کیونکہ اس زمانے میں دشمن کے حملے کا ہمیشہ خوف لگا رہتا تھا۔ اس لئے اگر حملے کا خطرہ نہ بھی ہوتا تب بھی نقشہ وہی رہتا تھا یعنی تمام بستیاں مستطیل کی شکل میں آباد کی جاتی تھیں۔ ان کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیلیں ہوتی تھیں اور چار بڑے پھاٹک اور چار چھوٹے دروازے ہوتے تھے۔ فصیلوں کے اندر ایک خاص ترتیب سے گلیاں بنائی جاتی تھیں اور گلیوں کے درمیان میں مکان ہوتے تھے۔ بستی کے بیچوں بیچ میں ایک پنچایت گھر ہوتا تھا جہاں گاؤں کے بڑے بوڑھے صلاح مشورے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ چھوٹے گاؤں میں پنچایت گھر کے بجائے صرف ایک بڑا سا درخت ہوتا تھا۔ ہر سال گاؤں کے آزاد شہری یہاں جمع ہوکر اپنی پنچایت منتخب کرتے تھے۔

بہت سے پنڈت لوگ اکثر گاؤں یا قصبے کے قریب کے جنگلوں میں چلے جاتے تھے تاکہ سادہ زندگی بسر کرسکیں یا اطمینان و سکون کے ساتھ اپنا مطالعہ جاری رکھ سکیں۔ طالب علم ان سے پڑھنے کے لئے وہاں جمع ہوجاتے تھے اور رفتہ

رفتہ ان استادوں اور شاگردوں کی نئی آبادیاں قائم ہو جاتی تھیں۔ ان آبادیوں کو ہم یونیورسٹیاں کہہ سکتے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں عمدہ عمدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں لیکن طالب علم دور دور سے یہاں آتے تھے۔

آنند بھون کے سامنے ہی بھاردواج آشرم ہے۔ اسے تم اچھی طرح جانتی ہو اور شاید تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ بھاردواج، رامائن کے زمانے میں بڑے زبردست پنڈت گذرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رام چندر جی اپنے بن باس کے دوران میں ان سے بھی ملے تھے۔ اس زمانے میں ہزاروں طالب علم ان کے ساتھ رہتے تھے، گویا اس وقت یہ پوری یونیورسٹی رہی ہوگی جس کے بھاردواج پرنسپل ہوں گے۔ اس زمانے میں یہ آشرم گنگا کے کنارے واقع تھا۔ اگرچہ اب گنگا یہاں سے کوئی ایک میل دور ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ ہمارے باغ کی زمین بہت رتیلی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ جگہ گنگا کی ترائی میں ہوگی۔

وہ زمانہ ہندوستان میں آریوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ افسوس کہ اس وقت کی کوئی باقاعدہ تاریخ موجود نہیں ہے اس لئے جو باتیں ہمیں معلوم ہوئی ہیں وہ ہمیں تاریخ کے علاوہ دوسری کتابوں سے ملی ہیں۔ اس زمانے کی خاص خاص سلطنتیں اور جمہوریتیں یہ تھیں: جنوبی بہار میں مگدھ، شمالی بہار میں ودیہہ، کاشی یا بنارس، کوشل جس کی راجدھانی اجودھیا یعنی موجودہ فیض آباد تھا اور پنچالوں کا علاقہ یعنی گنگا اور جمنا کا دوآبہ۔ پنچالوں کے علاقے میں دو مشہور شہر تھے یعنی متھرا اور کان کبج۔ یہ دونوں شہر بعد کے زمانے میں بھی مشہور رہے ہیں۔ اب بھی یہ دونوں باقی ہیں۔ کان کبج کا نام اب قنوج ہے جو کانپور کے قریب ہے۔ آجکل کا اجین بھی اگرچہ اب چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے اس ابتدائی دور میں موجود تھا۔ اب یہ

ریاست گوالیار میں شامل ہے۔

پاٹلی پتر یا پٹنہ کے قریب ویسالی شہر تھا۔ یہ ہندوستان کے ابتدائی دور میں لچھوی خاندان کی راج دھانی تھی۔ اس ریاست میں جمہوریت قائم تھی اور عمائد کی ایک مجلس یہاں حکمرانی کرتی تھی۔ مجلس کا صدر منتخب شدہ ہوتا تھا جسے نائک کہتے تھے۔

رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد ہوتے گئے، تجارت کی ترقی ہوئی اور کاریگروں کی صنعت و حرفت کو بہت فروغ ہوا۔ شہر بڑے بڑے تجارتی مرکز بن گئے اور جنگلوں کے آشرم جہاں قابل پنڈت اپنے چیلوں کے ساتھ رہتے تھے یونیورسٹیوں کی بستیاں بن گئے۔ ان یونیورسٹیوں میں وہ تمام علوم و فنون سکھائے جاتے تھے جن کا دنیا کو اس وقت علم تھا۔ برہمن لوگ فن جنگ بھی سکھاتے تھے۔ تمھیں خیال ہوگا کہ مہابھارت میں پانڈوں کے استاد درونا چاریہ تھے جو برہمن تھے۔ انھوں نے دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ انھیں جنگ کا فن بھی سکھایا تھا۔

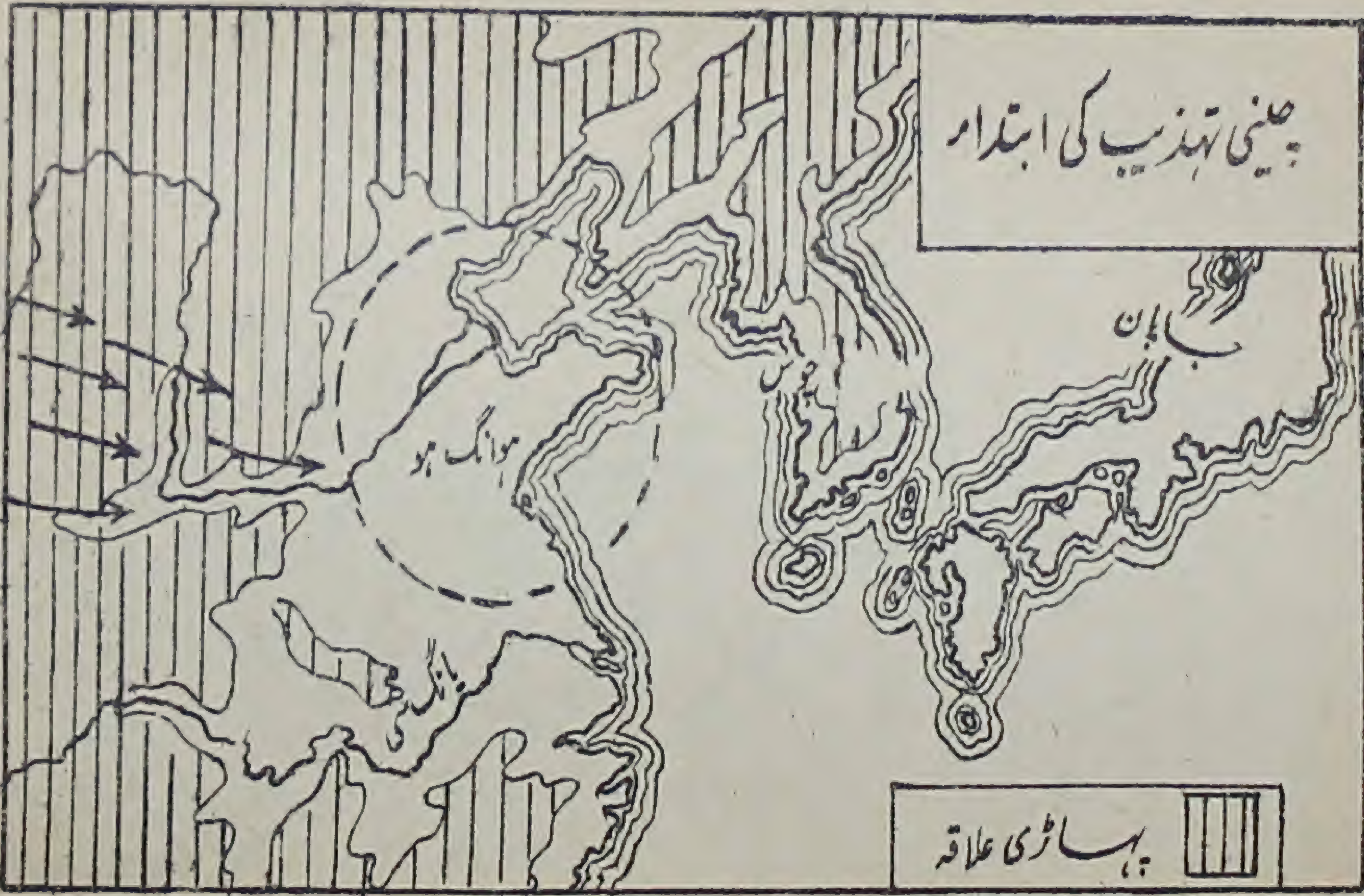
(۱۱)

چین کی تاریخ کے ہزار برس

۱۶ر جنوری ۳۱ء

آج باہر کی ایک خبر آئی۔ وہ خبر جس سے پریشانی اور دکھ بھی ہوا اور دل فخر و مسرت سے لبریز بھی ہو گیا یعنی شولاپور والوں پر جو آفت آئی اس کا حال معلوم ہوا۔ تمھیں اس کا بھی کچھ علم ہوا ہو گا کہ اس افسوسناک خبر کا سارے ملک پر کیا اثر ہوا اور کیا صورتیں پیدا ہوئیں۔ یہاں جیل کے ایک کونے میں بیٹھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے جبکہ یہ معلوم ہو کہ ہمارے نوجوان باہر اپنی جانیں دے رہے ہیں اور ہزاروں مرد عورتیں وحشیانہ لاٹھی کے وحشیانہ حملہ کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن یہ ہمارے لئے تہذیب نفس کی بڑی اچھی صورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح ہم میں سے ہر مرد اور عورت کو اس کا پورا موقع ملے گا کہ اپنے آپ کو کسوٹی پر کس سکے۔ خیر یہ معلوم کر کے ہمارا دل بڑھ جاتا ہے کہ ہمارے آدمی بھی خوشی سے مصیبت برداشت کرنے کی ہمت رکھتے ہیں اور کس طرح دشمن کے ہتھیار کا ہر وار انھیں زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے اور وہ مقابلے پر زیادہ استقلال سے ڈٹ جاتے ہیں۔

جب روز کی ان خبروں سے دماغ پریشان ہو تو بھلا دوسری باتوں کا کیا خیال آسکتا ہے۔ لیکن محض خیال آرائی سے کیا حاصل۔ اگر ہم کوئی ٹھوس کام کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے دماغ پر پورا قابو رکھنا چاہیئے۔ اس لئے آؤ، پچھلے زمانے میں پلٹ چلیں اور تھوڑی دیر کے لئے موجودہ فکروں کو بھول جائیں۔



چینی تہذیب کی ابتداء

آؤ، ہندوستان کے قدیم ہم عصر چین کا حال بیان کریں۔ چین اور مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں یعنی جاپان کوریا، انڈوچائنا، سیام اور برما میں ہمیں آریوں سے کوئی واسطہ نہیں پڑے گا۔ یہاں منگولی قوم آباد تھی۔

کوئی پانچ ہزار سال یا اس سے اوپر ہوئے کہ چین پر مغرب سے حملہ ہوا۔ یہ حملہ آور قبیلے بھی وسطی ایشیا سے آئے تھے اور تہذیب و تمدن میں خاصی ترقی کر چکے تھے۔ وہ زراعت کے فن سے واقف تھے اور مویشیوں کے بڑے بڑے گلّے پالتے تھے۔ وہ اچھے اچھے گھر بھی بنانا جانتے تھے اور ان کی سماج خوب ترقی یافتہ تھی۔ وہ ہانگ ہو یا پیلی ندی کے کنارے آباد ہوئے۔ یہاں انھوں نے اپنی حکومت قائم کی۔ سینکڑوں برس تک وہ سارے چین میں پھیلتے اور صنعت و حرفت کو ترقی دیتے رہے۔ یہ چینی لوگ عموماً کاشت کار تھے اور ان کے حاکم اصل میں قبیلوں کے سردار تھے۔ اس قسم کے لوگوں کا میں اپنے پچھلے خطوں میں ذکر کر چکا ہوں۔ چھ سات سو سال کے بعد یعنی اب سے کوئی چار ہزار برس پہلے ہمیں ایک شخص یاؤ کا نام ملتا ہے جو اپنے آپ کو شہنشاہ کہتا تھا۔ لیکن اس لقب کے باوجود وہ ایک قبیلے کا سردار ہی تھا نہ کہ اس طرح کا شہنشاہ جیسا مصر یا عراق میں ہوتا تھا۔ چینی بدستور کسانوں کی زندگی بسر کرتے رہے اور ان کی مرکزی حکومت محض برائے نام تھی۔

میں تمھیں یہ بتا چکا ہوں کہ پہلے کس طرح عوام اپنے قبیلے کے سرداروں کو منتخب کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کس طرح یہ نسلاً بعد نسلٍ اس گدّی کے وارث ہونے لگے۔ چین میں بھی یہی صورت ہوئی۔ شروع میں یاؤ کا لڑکا اس گدّی کا وارث نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک دوسرے شخص کو جو ملک میں سب سے زیادہ لائق اور اس کا اہل سمجھا جاتا تھا نامزد کیا۔ لیکن اس کے

بعد ہی یہ منصب خاندانی بن گیا اور کہتے ہیں کہ سیا خاندان نے کوئی چار سو برس چین پر حکمرانی کی۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ بڑا ظالم تھا اس لئے ملک میں انقلاب ہوگیا اور اُسے گدّی سے اتار دیا گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے سینی شنگ یا ین خاندان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی۔ ان کا اقتدار کوئی ۶۵۰ برس تک رہا۔

دیکھو، ایک چھوٹے سے پیراگراف میں، دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں، میں نے چین کی ایک ہزار برس سے زیادہ کی تاریخ بیان کرڈالی۔ کیوں، کتنی دلچسپ بات ہے؟ آخر اتنی لمبی چوڑی تاریخ سے آدمی کس طرح نبٹے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میرے بیان کے اختصار کی وجہ سے یہ گیارہ سو برس کی مدت بھی چھوٹی ہوگئی۔ ہم تم زمانے کو دن، مہینے اور برسوں میں سوچتے ہیں۔ تم سو سال کا بھی تصور کرنا چاہو تو مشکل ہے۔ تمھیں اپنی عمر کے تیرہ برس ابھی بہت معلوم ہوتے ہیں۔ ہے نا؟ اور ہر سال تم کتنی بڑھتی جاتی ہو۔ جب یہ صورت ہے تو تمھارے لئے تاریخ کے پورے ایک ہزار برس کا تصور کرنا کتنا مشکل ہے۔ یہ تو بہت بڑی مدت ہوئی۔ اس مدت میں نسلوں پر نسلیں آتی اور چلی جاتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبے بڑے بڑے شہر بن جاتے ہیں۔ پھر وہ مٹ جاتے ہیں اور نئے شہر ان کی جگہ آباد ہوجاتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہزار برس کی تاریخ پر غور کرو۔ شاید اس طرح تم اس طویل مدت کا کچھ تصور قائم کرسکو گی۔ دیکھو، دنیا میں اسی ہزار برس میں کیسی کیسی تبدیلیاں ہوگئی ہیں!

چین کی تاریخ، اس کے تمدن کی طویل روایات، اس کے شاہی خاندان جن میں سے ہر ایک نے پانچ پانچ سو، آٹھ آٹھ سو برس یا اس سے بھی زیادہ مدت تک حکمرانی کی، یہ سب چیزیں کتنی عجیب ہیں!

چین کی اس گیارہ سو برس کی دھیمی رفتارِ ترقی پر غور کرو جس کا حال میں نے صرف ایک پیراگراف میں ختم کر ڈالا۔ رفتہ رفتہ یہ قبائلی نظام ختم ہو گیا اور مرکزی حکومت قائم ہوئی۔ اب ایک منظم ریاست نمودار ہوئی۔ اُس زمانے میں بھی چین تحریر کے فن سے واقف تھا۔ لیکن تمھیں معلوم ہے کہ چینی تحریر ہماری ہندوستانی یا انگریزی اور فرانسیسی تحریروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں حروف تہجی نہیں ہیں بلکہ اس میں خیالات تصویروں کے ذریعے سے ادا کئے جاتے ہیں۔

شنگ خاندان بھی ۶۵۰ برس کے بعد انقلاب کا شکار ہو گیا۔ ایک نیا چاؤ خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ اس نے شنگ خاندان سے زیادہ مدت تک حکومت کی یعنی ۸۶۷ برس تک۔ اس چاؤ خاندان ہی کے ماتحت منظم چینی ریاست کی تشکیل ہوئی۔ اسی زمانے میں چین میں دو مشہور فلسفی کن فیوشس اور لاؤ سے پیدا ہوئے۔ ان کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

جب شنگ خاندان تباہ ہوا تو ان کے ایک بڑے سردار کی شے نے چاؤ خاندان کی ماتحتی کے مقابلے میں جلا وطنی گوارا کی۔ وہ پانچ ہزار ساتھیوں کو لے کر کوریا میں نکل گیا۔ اس نے اس کا نام چوسن رکھا یعنی "سکونِ سحر کی سرزمین"۔ کوریا یا چوسن چین کے مشرق میں واقع ہے یعنی کی شے مشرق یا مطلعِ آفتاب کی طرف گیا۔ شاید اس نے یہ سمجھا ہو گا کہ وہ مشرق کے بالکل کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ اسی لئے اس نے کوریا کا یہ نام رکھا۔ کی شے کے زمانے سے یعنی حضرت مسیحؑ سے گیارہ سو برس پہلے سے کوریا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ کی شے اپنے ساتھ چینی صنعت و حرفت، فنِ تعمیر، زراعت اور ریشم سازی کا فن بھی لایا۔ اس کے بعد اور بہت سے چینی یہاں آئے۔ کی شے کی اولاد کوریا پر کوئی نو سو برس تک حکمراں رہی۔

چوسن حقیقت میں مشرق کا آخری ملک نہیں تھا۔ تمھیں معلوم ہے کہ

اس کے بعد جاپان بھی ہے لیکن جب کی شے چوسن میں گیا ہے اس وقت کے جاپان کا ہمیں کوئی حال معلوم نہیں ۔ جاپانی تاریخ اتنی قدیم نہیں ہے جتنی چین یا کوریا کی تاریخ۔ جاپانی کہتے ہیں کہ ان کے سب سے پہلے بادشاہ کا نام جمّو تینو تھا اور وہ حضرت مسیحؑ سے چھ سات سو سال پہلے گذرا ہے ۔ وہ اسے سورج دیوی کی اولاد میں مانتے ہیں۔ جاپان میں سورج کو دیوی ہی مانا جاتا ہے۔ جاپانیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا موجودہ بادشاہ براہ راست جموتینو کی نسل میں ہے ۔ اس لئے بہت سے جاپانی اسے بھی سورج کی اولاد مانتے ہیں ۔

تم جانتی ہو کہ ہمارے ملک میں بھی راجپوت اسی طرح اپنے آپ کو سورج اور چاند کی نسل سے بتاتے ہیں ۔ ان کے دو خاص گھرانے ہیں سورج بنسی یعنی سورج کے بنس یا نسل سے اور چندر بنسی یعنی چاند کی نسل سے ۔ اُودے پور کے مہارانا اپنے آپ کو سورج بنسیوں کا سردار کہتے ہیں اور اپنا سلسلۂ نسب بہت پرانے زمانے تک لے جاتے ہیں ۔ ہمارے راجپوت بھی کتنے عجیب لوگ ہیں اور ان کی شجاعت اور بہادری کے افسانوں کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے ۔

(۱۲)

ماضی کی پکار

۱۷ جنوری ۱۹۳۱ء

اب ہم ڈھائی ہزار برس پہلے کی دنیا پر ایک سرسری نظر ڈال چکے ۔ لیکن ہمارا یہ مطالعہ بہت مختصر اور محدود رہا۔ ہم نے صرف ان ملکوں کا تذکرہ کیا جو کافی ترقی یافتہ تھے یا جن کی کوئی صحیح تاریخ موجود تھی ۔ مصر کے سلسلے میں ہم نے اس عظیم الشان تہذیب کا تذکرہ کیا جو اہرام مصر (Pyramids) اور ابوالہول Sphinx اور بہت سی عجیب عجیب چیزوں کو جن کی تفصیل یہاں بیان کرنا فضول ہے وجود میں لائی ۔ یہ تہذیب غالباً اپنے دن پورے کر چکی تھی اور اس ابتدائی زمانے ہی میں جس کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس کا تنزل شروع ہو گیا تھا - Knossos بھی شمع سحری ہو رہا تھا ۔ چین کے سلسلے میں ہم نے کافی زمانے کا حال بیان کیا ۔ اس مدت میں وہاں رفتہ رفتہ زبردست مرکزی سلطنت قائم ہوئی اور فن تحریر، ریشم سازی اور بہت سی اچھی اچھی چیزوں نے نشو و نما پائی ۔ اس کے علاوہ ہم نے کوریا اور جاپان کی بھی ایک جھلک دیکھی ۔ ہندوستان کے سلسلے میں ہم نے اس قدیم تہذیب کی طرف صرف ایک اشارہ کیا جس کا وادیِ سندھ کے علاقے موہن جوداڑو کے آثار سے کچھ پتہ چلتا ہے ۔ پھر دراوڑی تہذیب اور غیر ملکوں سے ان کی تجارت کا اور آخر میں آریوں کا کچھ حال لکھا ۔ اس کے علاوہ ہم نے ان چند مشہور کتابوں کا بھی ذکر کیا جو اس زمانے کے آریوں نے لکھی تھیں یعنی وید اور اپنشد، اور رامائن اور مہابھارت کی رزمیہ نظمیں ۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح وہ سارے

شمالی ہندوستان میں پھیل گئے حتیٰ کہ جنوب تک پہنچے اور انھوں نے ایک نئی تہذیب اور تمدن کی بنیاد ڈالی جس میں دراوڑی تہذیب کا تھوڑا اور آریہ تہذیب کا زیادہ حصہ تھا۔ خاص کر ہم نے ان کے دیہی نظام کا مطالعہ کیا کہ وہ کس طرح جمہوری اصولوں پر قائم ہوا اور کس طرح قصبے اور شہر بنے اور جنگل کے آشرم یونیورسٹیاں ہو گئے۔ عراق اور ایران کے سلسلے میں ہم نے مختصر طور پر صرف یہ بتایا کہ وہاں سلطنتوں پر سلطنتیں قائم ہوئیں۔ ان سلطنتوں میں جو بعد کے زمانے میں قائم ہوئیں ایک دارا کی تھی جو ہندوستان کی سندھ ندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ فلسطین میں ہم نے عبرانیوں پر ایک نظر ڈالی جو تعداد میں اگرچہ مٹھی بھر تھے اور دنیا کے ایک چھوٹے سے کونے میں پڑے ہوئے تھے لیکن ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے۔ ان کے بادشاہ داؤد اور سلیمان کے نام آج بھی دنیا کو یاد ہیں حالانکہ ان سے بڑے بڑے بادشاہوں کے نام وہ بھول چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تذکرہ بائبل میں موجود ہے۔ یونان میں ہم نے دیکھا کہ Knossos کی قدیم تر تہذیب کے کھنڈروں پر آریوں نے نئی تہذیب کی عمارت تعمیر کی، رفتہ رفتہ شہری ریاستیں پیدا ہوئیں اور بحیرۂ روم کے کنارے کنارے یونانی نوآبادیاں قائم ہو گئیں۔ ان کے علاوہ روم جس کے عروج کا ستارہ چمکنے والا تھا اور اس کا رقیب کارتھیج ابھی تاریخ کے مطلع پر طلوع ہو رہے تھے۔

ہم نے ان سب ملکوں کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ میں کچھ اور ملکوں کا حال بھی لکھ سکتا تھا مثلاً شمالی یورپ کے ملک یا جنوب و مشرقی ایشیا کے ملک کیونکہ اس ابتدائی زمانے میں بھی جنوبی ہند کے ملاح خلیج بنگال کو عبور کر کے ملایا اور اس کے جنوب کے جزیروں تک جاتے تھے۔ مگر آخر کہاں تک۔ کہیں نہ کہیں تو ایک حد قائم کرنی پڑے گی ورنہ ہم آگے کیسے بڑھیں گے۔

جن ملکوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان کا تعلق قدیم دنیا سے تھا۔ یہ بات

ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس زمانے میں دور دراز ملکوں کے درمیان آمد و رفت کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ بعض من چلے ملاح سمندر کو عبور کرتے تھے اور بعض لوگ تجارت یا دوسرے مقاصد کے لیئے لمبے لمبے سفر کیا کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ صورت بہت شاذ ہوگی کیونکہ سفر میں خطرہ بہت تھا، جغرافیے کا علم بھی بہت تھوڑا تھا، لوگ دنیا کو گول نہیں بلکہ چپٹا سمجھتے تھے۔ غرض کہ اپنے قریب کے ملکوں کے سوا کسی ملک کا حال معلوم نہ ہوتا تھا، مثلاً یونان کے لوگوں کو چین اور ہندوستان کی کچھ خبر نہ تھی اور چینیوں اور ہندوستانیوں کو بحیرۂ روم کے ملکوں کا حال معلوم نہ تھا۔

اگر تمھیں کہیں سے پرانی دنیا کا نقشہ مل جائے تو اس پر ایک نظر ضرور ڈالو۔ اس زمانے کی دنیا کی بعض تفصیلات اور پرانے مصنفوں کے نقشے بہت ہی دلچسپ ہیں۔ ان نقشوں میں بہت سے ملکوں کی عجیب عجیب شکلیں ہیں۔ پرانے زمانے کے جو نقشے اب تیار ہوئے ہیں ان سے بہت زیادہ مدد ملتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس زمانے کا حال پڑھتے وقت تم انھیں ضرور دیکھ لیا کرو۔ دراصل نقشے سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کے بغیر تاریخ پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تاریخ پڑھتے وقت تک توجتنے زیادہ نقشے اور حقیقی زیادہ تصویریں ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ تصویروں سے میری مراد پرانی عمارتوں، کھنڈروں اور اس زمانے کے بچے کھچے آثار کی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں سے تاریخ کے خشک ڈھانچے میں جان پڑجاتی ہے اور وہ ہمیں جیتی جاگتی نظر آنے لگتی ہے۔ اگر تاریخ سے ہمیں کچھ حاصل کرنا ہے تو اسے اس طرح پڑھنا چاہیے کہ ہم اپنے ذہن میں اس زمانے کی مسلسل تصویریں بناتے جائیں تاکہ پڑھتے وقت ہمیں یہ محسوس ہو کہ یہ سب واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہیں۔ اس کی حیثیت ایک دل کو موہ لینے والے تماشے کی سی ہونی چاہیئے جس میں ہم کھو جائیں۔ یہ تماشا کبھی طرب انگیز ہوگا اور اکثر الم انگیز ہوگا۔

دنیا اس کی تماشاگاہ ہوگی اور ماضی کے جلیل القدر مرد اور عورتیں اس میں اداکار ہوں گی۔

تاریخ کے اس تماشے کو ہم تصویروں اور نقشوں کی مدد سے تھوڑا بہت دیکھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہر لڑکے اور لڑکی کے پاس ان کا ہونا ضروری ہے لیکن ان تصویروں سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ پرانے تاریخی کھنڈروں اور آثار قدیمہ کو خود جاکر دیکھا جائے۔ سب کا دیکھنا تو محال ہے کیونکہ وہ دنیا کے پردے پر دور دور پھیلے ہوئے ہیں، لیکن اگر ہم اپنی آنکھیں کھلی رکھیں تو ہمیں اپنے آس پاس بھی آسانی سے کچھ آثار مل سکتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں اور یادگاریں بڑے بڑے عجائب خانوں میں جمع کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں قدیم زمانے کے بہت سے آثار باقی ہیں لیکن بہت ہی پرانے زمانے کی چیزیں نہیں ملتیں۔ اس کے لئے اب تک صرف دو مقام ہیں یعنی موہن جو دارو اور ہڑپا۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سی پرانی عمارتیں گرم آب و ہوا کی وجہ سے گرگئی ہوں اور اس سے زیادہ یہ امکان ہے کہ وہ اب تک زمین کے نیچے دبی ہوئی ہوں، اس انتظار میں کہ کب وہ کھود کر نکالی جاتی ہیں۔ جب ہم انھیں کھودیں گے اور ان میں سے پرانی یادگاریں اور کتبے برآمد ہوں گے تو ہمارے ملک کی قدیم تاریخ کے صفحات رفتہ رفتہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھلنے لگیں گے اور اینٹ، پتھر اور چونے کے ان صفحوں پر ہم پڑھ سکیں گے کہ قدیم ترین زمانے میں ہمارے بزرگ کیسے تھے اور کیا کرتے تھے۔

دہلی تو تم گئی ہو اور موجودہ شہر کے آس پاس تم نے کچھ پرانی عمارتیں اور کچھ کھنڈر بھی دیکھے ہیں۔ اب اگر تم وہاں جاؤ تو ماضی کا تصور کرنا۔ پھر وہ تمھیں سینکڑوں برس پیچھے لے جائیں گے اور اتنی تاریخ سنائیں گے کہ کوئی کتاب نہیں بتا سکتی۔ مہابھارت کے زمانے سے اب تک برابر لوگ دہلی شہر یا اس کے قرب وجوار میں

رہتے چلے آئے ہیں اور اسے مختلف ناموں سے پکارتے رہے ہیں، مثلاً اندر پرستھ، ہستنا پور، تغلق آباد، شاہ جہاں آباد وغیرہ۔ مجھے تو سب نام یاد بھی نہیں ہیں۔ مشہور ہے کہ سات مختلف جگہوں پر سات مرتبہ دلی شہر آباد ہوا۔ اس لئے کہ جمنا ندی اپنی دھار بدلتی رہتی ہے۔ اب ہمارے سامنے آٹھواں شہر یعنی رائے سینا یا نئی دلی ہے جو موجودہ حاکموں کے حکم سے تیار ہو رہا ہے۔ دلی میں کتنی سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں!

یا بنارس یعنی کاشی جاؤ جو ہندوستان کی سب سے قدیم بستی ہے اور ذرا کان لگا کر اس کی مدھم آواز سنو۔ کیا وہ اپنے بیتے ہوئے زمانے کا فسانہ تمہیں سناتی ـــــ یہ کہ وہ کس طرح اب تک باقی ہے جبکہ سلطنتوں کا نام و نشان تک نہیں رہا ـــــ اور بودھ جی کون تھے جو اپنا نیا پیغام لے کر اس کے پاس آئے ـــــ اور ان کروڑوں آدمیوں کا حال جو اس ہزاروں سال کے عرصے میں سکون و اطمینان حاصل کرنے کی خاطر اس کی چوکھٹ پر آئے۔ وہ نہایت کمزور، ضعیف اور بوڑھی بھوس اور میلی کچیلی ہے لیکن اس میں اب تک جان ہے اور صدیوں کی قوت۔ کاشی دل کشی اور عجائب کا مجسمہ ہے کیونکہ آج بھی اس کی آنکھوں میں ہندوستان کا ماضی نظر آتا ہے اور اس کے دریا کی موجوں میں اب بھی گذرے ہوئے زمانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

یا دور کیوں جاؤ۔ ذرا اپنے ہی شہر الہ آباد یعنی پریاگ میں اشوک کی پرانی لاٹ کو دیکھو، اس کتبے پر نظر ڈالو جو اشوک کے حکم سے اس پر لکھا گیا تھا تو تمہارے کانوں میں اس کی آواز آج دو ہزار سال بعد بھی گونجنے لگے گی۔

(۱۳)

یہ ساری دولت کہاں جاتی ہے؟

۸ر جنوری سنہ ۳۱ء

میں نے اپنے ان خطوں میں جو تمھیں مسوری بھیجے تھے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا لوگ مختلف طبقوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ ابتدائی انسانوں کی زندگی بڑی کٹھن تھی حتیٰ کہ کھانے کو بھی مشکل سے ملتا تھا۔ وہ روز کے روز شکار مارتے تھے یا پھل اور سوکھے میوے اکٹھا کرتے تھے۔ غرض کھانے کی تلاش میں وہ جگہ جگہ مارے مارے پھرتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے قبیلے بن گئے۔ دراصل یہ بڑے بڑے خاندان تھے جو ایک ساتھ رہتے اور ایک ساتھ شکار کھیلتے تھے کیونکہ ساتھ رہنے میں زیادہ محفوظ رہتے تھے۔ اس کے بعد ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی یعنی زراعت کا فن دریافت ہوا۔ اس سے حالات میں بڑی زبردست تبدیلی ہوگئی۔ لوگوں کو زراعت کے ذریعے زمین سے خوراک پیدا کرنا سارے دن شکار کی تلاش کرنے کے مقابلے میں زیادہ آسان معلوم ہوا۔ ہل چلانے، بیج بونے اور فصل کاٹنے کی غرض سے انھیں ایک جگہ قیام کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح مارے مارے نہیں پھرتے تھے بلکہ اپنے کھیت ہی پر رہتے تھے۔ اس طرح گانوں اور قصبے بن گئے۔

زراعت سے اور بہت سی تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ کھانے پینے کی چیزیں جو زمین سے پیدا ہوتی تھیں وہ اتنی زیادہ تھیں کہ ایک دم استعمال نہیں کی جا سکتی تھیں۔ جو بچتیں وہ جمع کر لی جاتیں۔ اب زندگی اس زمانے کے مقابلے میں جب انسان شکار

کیا کرتا تھا کچھ زیادہ پیچیدہ ہو گئی اور لوگوں کے مختلف طبقے بن گئے یعنی کچھ تو کھیتوں اور میدانوں میں ہاتھ سے کام کرنے لگے اور کچھ نگرانی اور انتظام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ منتظم اور نگراں زیادہ طاقت پکڑ گئے اور قبیلہ' سردار، حاکم اور بادشاہ ہونے لگے۔ چونکہ انھیں طاقت حاصل تھی اس لئے وہ فاضل پیداوار کا زیادہ حصہ خود لے لیتے تھے، اس لئے وہ امیر ہوتے گئے۔ لیکن ان لوگوں کو جو کھیتوں میں محنت کرتے تھے مشکل سے پیٹ بھرنے کے لائق ملتا تھا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ یہ نگراں اور منتظم لوگ اتنے سست اور نااہل ہو گئے کہ ان سے نگرانی کا کام بھی نہ ہوتا تھا۔ اب وہ کچھ بھی نہ کرتے تھے صرف اس تاک میں رہتے تھے کہ محنتی لوگ جو خوراک پیدا کریں اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے قبضے میں کرلیں۔ اب وہ یہ سمجھنے لگے کہ انھیں ہاتھ پاؤں چلائے بغیر اس طرح دوسروں کی محنت سے فائدہ اُٹھانے کا پورا حق حاصل ہے۔

تم نے دیکھا کہ زراعت نے معاشرت میں کتنا فرق پیدا کر دیا۔ خوراک حاصل کرنے کے طریقوں کو زیادہ بہتر اور آسان کرکے زراعت نے سماج کی ساری بنیاد ہی بدل ڈالی یعنی لوگوں کو زیادہ آسائش و آرام ملا اور مختلف طبقے پیدا ہو گئے۔ اب ہر شخص کو خوراک حاصل کرنے کی دھن نہ تھی اس لئے کچھ لوگ دوسرے کام کرنے لگے۔ یوں مختلف قسم کی صنعتیں پیدا ہوئیں اور نئے نئے پیشے شروع ہوئے، لیکن اصل طاقت منتظم طبقے ہی کے ہاتھ میں رہی۔

آگے چل کر بھی تمھیں یہ بات معلوم ہوگی کہ خوراک اور دوسری چیزوں کے پیدا کرنے کے نئے طریقے اختیار کرنے سے زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ انسان کے لئے دوسری چیزیں بھی اتنی ہی ضروری ہو گئیں جتنی خوراک۔ گویا پیداوار کے طریقوں میں تبدیلی کا ہمیشہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ سماج کی حالت میں بہت بڑی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ حال ہی کی ایک بین مثال لے لو۔ جب کارخانوں، ریلوں اور جہازوں کے

چلانے میں اسٹیم سے کام لیا جانے لگا تو پیداوار اور تقسیم کے طریقوں میں زبردست انقلاب ہوگیا۔ کاریگر اپنے ہاتھوں اور چھوٹے چھوٹے اوزاروں سے مختلف چیزیں بہت دیر میں تیار کرتے تھے، لیکن اسٹیم سے چلنے والے کارخانے ان سے کہیں جلدی تیار کرنے لگے۔ بڑی مشین بھی گویا ایک زبردست اوزار ہے۔ اس کے علاوہ ریلیں اور دخانی جہاز خوراک اور کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں دور دور کے ملکوں میں بہت جلد پہنچانے لگے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ اس سے ساری دنیا میں کتنا انقلاب ہوگیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں وقتاً فوقتاً خوراک اور دوسری مختلف چیزیں پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے جن میں کم وقت صرف ہوتا تھا دریافت ہوتے رہے ہیں۔ غالباً تمھیں یہ خیال ہوگا کہ اگر پیداوار کے بہتر طریقے اختیار کئے جائیں تو اس کی مقدار بہت بڑھ جائے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا زیادہ امیر ہو جائے گی اور ہر شخص زیادہ خوش حال ہوگا۔ کسی حد تک تمھارا یہ خیال صحیح ہے اور کسی حد تک غلط۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیداوار کے بہتر طریقوں نے دنیا کو زیادہ مالدار کر دیا ہے۔ لیکن کس طبقے کو؟ یہ تو خیر ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں اب تک سخت مصیبت اور افلاس پھیلا ہوا ہے۔ لیکن انگلستان جیسے دولت مند ملک کا کیا ہے۔ وہاں بھی یہی صورت ہے۔ آخر یہ کیوں؟ یہ ساری دولت جاتی کہاں ہے؟ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دولت روز بروز بڑھ رہی ہے اور غریب اسی طرح غریب ہیں۔ بعض ملکوں میں ان کی حالت تھوڑی سی بہتر ہوئی ہے۔ لیکن دولت کے موجودہ اضافے کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بہرحال یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہ دولت زیادہ تر کہاں جاتی ہے۔ یہ ان لوگوں کے پیٹ میں جاتی ہے جو نگراں اور منتظم ہونے کی حیثیت سے اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ ہر اچھی چیز کا زیادہ حصہ انھیں مل جائے۔ پھر اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ سماج میں ایسے طبقے بھی پیدا ہوگئے ہیں جو خود کوئی

کام کرنا عار سمجھتے ہیں۔ پھر بھی دوسروں کی محنت کے پھل کا زیادہ حصہ ہضم کر جاتے ہیں اور شاید تمھیں یقین نہ آئے کہ اس طبقے کی عزت کی جاتی ہے اور بعض احمق یہ خیال کرتے ہیں کہ اپنی روزی خود کمانا شان کے خلاف ہے۔ یہ ہے ہماری دنیا کا الٹا کارخانہ! کتنی حیرت کی بات ہے کہ کھیت کے کسان اور کارخانے کے مزدور جو ساری دنیا کے لئے خوراک اور دولت پیدا کرتے ہیں خود غریب بنے رہیں۔ ہم اپنے ملک کی آزادی کے تذکرے کیا کرتے ہیں لیکن اس آزادی سے کیا فائدہ ہوگا جب تک ہم اس اندھیر کا خاتمہ نہ کر دیں اور کام کرنے والے کو اس کی محنت کا پھل نہ ملنے لگے۔ سیاست پر، آئین حکومت پر، اقتصادیات پر اور اس موضوع پر کہ قوم کی دولت کو کس طرح تقسیم کرنا چاہیئے موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں، بڑے بڑے قابل پروفیسر ان مسائل پر لکچر دیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ باتیں بناتے رہتے ہیں اور کام کرنے والے بدستور مصیبت جھیل رہے ہیں۔ کوئی دو سو برس گذرے والٹیر نامی ایک مشہور فرانسیسی نے ان سیاست دانوں اور اسی قسم کے لوگوں کے متعلق خوب کہا تھا کہ "ان لوگوں نے اپنی حکمت عملی سے ایسی تدبیر نکالی ہے کہ جو لوگ محنت کر کے دوسروں کو زندہ رکھتے ہیں وہ خود بھوکے مریں۔"

بہر حال، پرانے زمانے کے لوگ ترقی کرتے گئے اور رفتہ رفتہ فطرت پر قابو پانے لگے۔ انھوں نے جنگل کاٹے، مکان بنائے اور زمین کو جوتنا بویا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان نے کسی حد تک فطرت کو فتح کر لیا۔ لوگ فطرت کے مفتوح ہونے کی ڈینگ مارتے ہیں۔ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انسان نے فطرت کو سمجھنا شروع کیا اور جتنا زیادہ وہ اسے سمجھ سکا اتنا ہی وہ اس سے اشتراک عمل کرنے اور اپنے فائدے کے لئے اس سے کام لینے کے لائق ہو سکا۔ پرانے زمانے میں لوگ فطرت یا فطری مظاہر سے ڈرتے تھے۔ انھیں سمجھنے کے بجائے وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کے نام پر بھینٹ چڑھاتے تھے۔ گویا فطرت بھی کوئی وحشی جانور تھی جسے

چمکارنے اور پھیلانے کی ضرورت تھی۔ مثلاً وہ بجلی کی کڑک اور چمک سے اور وبائی امراض سے ڈرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انھیں صرف بھینٹ چڑھا کر راضی کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے سیدھے سادے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سورج گرہن اور چاند گرہن بھی کوئی زبردست آفت ہے، اس کے بجائے کہ وہ یہ سمجھتے کہ یہ معمولی قدرتی واقعہ ہے، خواہ مخواہ اس کے متعلق پریشان ہوتے ہیں اور سورج اور چاند کو بچانے کے لئے برت رکھتے ہیں اور اشنان کرتے ہیں۔ سورج اور چاند اپنی حفاظت خود کرسکتے ہیں۔ ہمیں ان کے لئے بے کار پریشان نہ ہونا چاہیئے۔

ہم تہذیب اور تمدن کی ترقی کا تذکرہ کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ اس کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب لوگوں نے قصبوں اور گانوؤں میں بسنا شروع کیا۔ پھر جتنی زیادہ مقدار میں انھیں خوراک ملی اتنی ہی انھیں آسائش اور فرصت نصیب ہوئی۔ اس لئے شکار کرنے اور پیٹ بھرنے کے علاوہ اب انھیں دوسری چیزوں پر بھی غور کرنے کا موقع ملا۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت اور تہذیب و تمدن کی ترقی ہوئی۔ جیسے جیسے آبادی بڑھی لوگ ایک دوسرے سے قریب تر رہنے لگے۔ اب وہ برابر ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور آپس میں کاروبار کرنے لگے جب لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں تو انھیں ایک دوسرے کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں کرتے جس سے ان کے ساتھی یا پڑوسی کو تکلیف پہنچے، ورنہ سماجی زندگی ممکن ہی نہیں ہے۔ مثلاً ایک خاندان کو لے لیجئے۔ خاندان بھی سماج کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ یہ اسی وقت خوش حال رہ سکتا ہے جبکہ اس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتیں۔ ایک خاندان میں تو یہ بات زیادہ مشکل نہیں کیونکہ اس کے افراد محبت کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمدردی کو ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں اور یہ ثابت کرنے لگتے ہیں کہ ہم بالکل غیر مہذب اور

غیر متمدن ہیں۔ خاندان سے بڑی جماعت کا بھی یہی حال ہے، چاہے وہ ہمارے محلے والے ہوں یا شہر والے یا ملک والے یا ساری دنیا کے بسنے والے۔ غرض آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ سماجی زندگی میں ترقی ہوئی اور لوگ زیادہ ضبط و تحمل اور ہمدردی سے کام لینے لگے۔ تہذیب و تمدن کی صحیح تعریف کرنا مشکل ہے اور میں اس کی کوشش نہیں کروں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ تہذیب میں اور باتوں کے علاوہ یہ دو چیزیں بہت ضروری ہیں یعنی اپنے اوپر قابو رکھنا اور دوسروں کا خیال رکھنا۔ اگر انسان اپنے اوپر قابو نہ رکھتا ہو اور دوسروں کا خیال نہ رکھتا ہو تو ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مہذب ہے۔

حضرت عیسیٰؑ سے ۶۰۰ سال پہلے
مذہب کا حال

۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء

چلو، تاریخ کی اس سڑک پر پھر چلیں جو دور تک چلی گئی ہے۔ اب ہم ایک خاص منزل تک پہنچ گئے ہیں یعنی اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے تک یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں حضرت عیسیٰؑ سے ۶۰۰ برس پہلے تک۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ بالکل صحیح تاریخیں ہیں۔ میں تو صرف زمانے کا سرسری طور پر ایک تعین کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں چین اور ہندوستان سے لے کر ایران اور یونان تک مختلف ملکوں میں بڑے بڑے لوگ، بڑے بڑے فلسفی اور مذہبوں کے بانی پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ سب ایک ہی وقت میں نہ تھے لیکن ان کا زمانہ اتنا قریب قریب گذرا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس زمانے میں دنیا میں مذہبی فکر کی ایک لہر دوڑ رہی ہوگی یعنی موجودہ حالت سے بے اطمینانی اور بہتر صورت کی جستجو اور امید کی لہر۔ کیونکہ مذاہب کے یہ بڑے بڑے بانی ہمیشہ بہتری کی تلاش میں رہتے ہیں اور اپنی قوموں کی حالت بدلنے، اسے بہتر بنانے اور ان کی مصیبتیں کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انقلاب پسند رہے ہیں۔ موجودہ برائیوں پر حملہ کرنے سے وہ کبھی نہیں ڈرے۔ اگر قدیم روایات کبھی خراب ہوگئیں اور ترقی کے راستے میں حائل ہوئیں تو انھوں نے فوراً ان پر وار کیا اور انھیں مٹا ڈالا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اعلیٰ زندگی کی ایک ایسی مثال قائم کی جو لوگوں کے لئے نسلاً

بعد نسل نمونے کا کام دیتی رہی اور ان کی ہمت بڑھاتی رہی۔

ہندوستان میں چھٹی صدی قبل مسیح میں بودھ جی اور مہابیر پیدا ہوئے، چین میں کنفیوشس اور لاؤزے، ایران میں زرتشت[۱] اور یونان کے جزیرہ ساموس میں فیثاغورس۔ تم نے یہ نام کسی دوسرے تذکرے کے سلسلے میں پہلے بھی سنے ہوں گے۔ اسکول کے لڑکے اور لڑکیوں کے ذہن میں فیثاغورس کا تصور یہ ہے کہ یہ وہی ظالم ہے جس نے اقلیدس کی ایک شکل ثابت کی تھی اور وہ اب ہم کو رٹنی پڑتی ہے۔ اس شکل میں مثلث قائم الزاویہ کے ضلعوں کے مربعوں کی بحث ہے۔ ہر اقلیدس میں یہ شکل ملتی ہے۔ اقلیدس کی ایجادوں کے علاوہ فیثاغورس بہت بڑا مفکر بھی مانا جاتا ہے۔ ہمیں اس کا کچھ زیادہ حال معلوم نہیں۔ بعض لوگوں کو تو اس پر بھی شک ہے کہ آیا واقعی دنیا میں اس کا کوئی وجود بھی تھا یا یہ محض خیالی ہستی ہے۔

ایران کے زرتشت پارسی مذہب کے بانی کہے جاتے ہیں لیکن میں تعین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان کو اس مذہب کا بانی کہنا بالکل درست ہے یا نہیں۔ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے ایران کے قدیم مذہب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ایک مدت سے ایران میں اس مذہب کا وجود باقی نہیں ہے۔ بہت زمانہ ہوا جب پارسی ایران سے ہندوستان آئے تو وہ اس مذہب کو اپنے ساتھ یہاں بھی لائے۔ جب سے وہ برابر اسی مذہب پر ہیں۔

چین میں اس زمانے میں دو بڑے شخص گذرے ہیں یعنی کنفیوشس اور لاؤزے۔ کنفیوشس کا اصلی تلفظ "کان۔ فیو۔ سی" ہے۔ یہ دونوں بزرگ عام معنوں میں مذہب کے بانی نہیں کہے جا سکتے لیکن انھوں نے اخلاق اور معاشرت کا ایک نظام ترتیب دیا یعنی انسانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ان کے

---

[۱] زرتشت غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں گذرے ہیں۔

انتقال کے بعد چین میں ان کے نام پر سینکڑوں مندر بن گئے اور چینی ان کی کتابوں کی اتنی تعظیم کرنے لگے جیسے ہندو ویدوں کی یا عیسائی انجیل کی کرتے ہیں۔ کنفیوشس کی تعلیم کا ایک اثر یہ ہوا کہ چینی دنیا میں سب سے زیادہ خلیق اور مہذب بن گئے۔

ہندوستان میں مہابیر اور بودھ نے جنم لیا۔ مہابیر نے جین مذہب کی بنیاد ڈالی۔ ان کا اصلی نام وردھ مان ہے۔ مہابیر تو لقب ہے جو ان کی عظمت کی بنا پر انھیں دیا گیا یعنی "سب سے بڑا بہادر"۔ جینی عموماً مغربی ہندوستان اور کاٹھیاوار میں رہتے ہیں۔ کاٹھیاوار میں اور راجپوتانے میں کوہ آبو پر ان کے بڑے خوبصورت مندر ہیں۔ آج کل جینیوں کا شمار عموماً ہندوؤں میں ہوتا ہے۔ وہ اہنسا یا عدم تشدد کے بڑے حامی ہیں اور کوئی ایسا فعل نہیں کرتے جس سے کسی جاندار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی تمھارے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ فیثاغورس بھی گوشت خوری کے سخت خلاف تھا۔ وہ اپنے شاگردوں اور چیلوں کو سخت تاکید کرتا تھا کہ ہرگز گوشت نہ کھائیں۔

اب ہم گوتم بودھ کا حال بیان کریں گے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ چھتری اور ایک شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا نام سدھارتھ تھا۔ ان کی ماں مایا رانی تھیں جن کے متعلق پرانی تاریخ میں لکھا ہے کہ "ہر شخص دل سے ان کا ایسا احترام کرتا تھا جیسے چاند کا، اپنے مقصد میں وہ ایسی خاموش لیکن ایسی مضبوط تھیں جیسے دھرتی ماتا اور ان کا دل ایسا پاک تھا جیسے کنول کا۔" گوتم کے والدین نے انھیں بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور یہاں تک اس کا اہتمام کیا تھا کہ کوئی تکلیف یا مصیبت کا منظر ان کی نظر سے نہ گزرے۔ لیکن بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ چنانچہ قصہ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک غریب اور ایک مصیبت زدہ آدمی اور ایک مردے کو دیکھا جس کا ان پر زبردست اثر ہوا۔ اب محل میں انھیں چین کہاں تھا۔ تمام عیش و عشرت

کا سامان جوان کے چاروں طرف موجود تھا حتیٰ کہ ان کی حسین اور نوجوان بیوی بھی جس سے وہ بے انتہا محبت کرتے تھے، ان کے دل سے انسان کی مصیبت کی فکر کو دور نہ کر سکی۔ لہٰذا یہ خیال ان کے دل میں جمتا گیا اور ان مصیبتوں سے دنیا کو نجات دلانے کی خواہش بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ اسے برداشت نہ کر سکے اور ایک روز رات کی خاموشی میں وہ اپنے محل اور اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر سر بصحرا نکل کھڑے ہوئے تاکہ جو سوال ان کے دل میں کھٹک رہے تھے ان کا حل تلاش کریں۔ عرصے تک وہ اس تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر کار کئی برس بعد گیا میں ایک درخت کے نیچے وہ بیٹھے تھے کہ ان کا ضمیر روشن ہو گیا اور وہ روشن ضمیر بودھ کے نام سے مشہور ہوئے اور وہ درخت جس کے نیچے وہ بیٹھے تھے بُدھی درخت یعنی شجرِ دانش کہلانے لگا۔ اس کے بعد سارناتھ کے شکار گاہ میں جسے اس زمانے میں اسپتانہ کہتے تھے قدیم کاشی کے زیرِ سایہ بودھ نے اپنی تعلیم شروع کی اور "اعلیٰ زندگی کا راستہ" بتایا۔ دیوی دیوتاؤں کو جو قربانیاں دی جاتی تھیں اُن سب کی انھوں نے مذمت کی اور فرمایا کہ اس کے بجائے ہمیں غصہ، نفرت اور حسد کے جذبات اور بُرے خیالات کی قربانی کرنی چاہیے۔

جس وقت بودھ جی پیدا ہوئے ہیں ہندوستان میں قدیم ویدک مذہب کا دور دورہ تھا لیکن وہ بہت کچھ بدل چکا تھا اور اپنی اصلی حالت سے بہت نیچے گر چکا تھا۔ برہمن پروہتوں نے مذہب میں ہر طرح کی رسمیں اور پوجا اور توہمات داخل کر دیے تھے کیونکہ پوجا میں جتنا اضافہ ہوتا تھا اتنا ہی برہمن کا بھلا ہوتا تھا۔ ذات پات کی بندشیں بہت سخت ہو گئی تھیں اور عوام شگون، جادو، ٹوٹکے اور بھوت پریت کے معتقد تھے اور ان سے کانپتے تھے۔ پنڈتوں نے ان ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور چھتری راجاؤں کی حکومت کا مقابلہ کرنے

لگے تھے ۔اس طرح برہمنوں اور چھتریوں میں رقابت پیدا ہوگئی تھی۔ بودھ عوام کے مصلح بن کر آئے اور انھوں نے پروہتوں کے اس ظلم اور ان تمام برائیوں پر جو ویدک مذہب میں داخل ہوگئی تھیں حملہ کیا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ پاک زندگی بسر کرنا اور نیک کام کرنا اصل چیز ہے ، پوجا پاٹ کی کوئی حقیقت نہیں ۔انھوں نے بودھ سنگ قائم کیا یعنی ان بودھ سنیاسیوں اور سنیاسنوں کی جماعت جو ان کی تعلیم پر عمل کرتے تھے ۔

بودھ مذہب عرصے تک ہندوستان میں مقبول نہیں ہوا۔ لیکن آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ کس طرح یہ ہندوستان میں پھیلا اور پھر کس طرح یہاں سے فنا ہوگیا۔ اگرچہ لنکا سے چین تک دور دور کے ملکوں میں یہ پھلا پھولا لیکن ہندوستان میں جہاں اس نے جنم لیا یہ پھر ہندو مت میں ضم ہوگیا۔ اس کے باوجود ہندو دھرم پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا اور اس نے کچھ نہ کچھ توہمات اور رسموں سے اسے نجات دلادی ۔

بودھ مت کے پیرو آج دنیا میں سب سے زیادہ ہیں اس کے بعد عیسائیت ، اسلام اور ہندو دھرم ہیں ۔ ان کے علاوہ یہودیوں ، سکھوں ، پارسیوں وغیرہ کے مذہب ہیں ۔ مذاہب اور ان کے بانیوں نے دنیا کی تاریخ میں زبردست حصہ لیا ہے ۔ اس لئے تاریخِ عالم کا جائزہ لیتے وقت ہم انھیں نظر انداز نہیں کرسکتے۔ لیکن ان کا حال لکھنے میں مجھے کچھ مشکل محسوس ہوتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ان مذاہب کے بانی دنیا کی بزرگ ترین اور مقدس ترین ہستیوں میں گذرے ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آگے چل کر ان کے پیرووں کو ان صفات سے دور کا بھی تعلق نہیں رہا ۔ اکثر تاریخ میں ہم نے دیکھا ہے کہ وہ مذہب جو لوگوں کو ابھارنے اور انھیں بہتر اور بلند تر کرنے کے لئے آیا تھا اتنا گر گیا کہ اس کے پیرو وحشی جانوروں کی سی حرکتیں کرنے لگے ، لوگوں پر روشنی کے دروازے کھولنے کے بجائے اس نے

اکثر انھیں تاریکی میں رکھنے کی کوشش کی، ان کے ذہن میں وسعت پیدا کرنے کے بجائے اس نے اکثر انھیں تنگ خیال اور متعصب بنا دیا۔ مذہب کی بدولت بہت سے بلند اور اعلیٰ کارنامے انجام پائے ہیں اور مذہب ہی کے نام پر ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا ہے اور طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

اب بتاؤ، انسان مذہب کے معاملے میں کیا کرے؟ بعض لوگوں کے نزدیک مذہب نام ہے دوسری دنیا یعنی بیکنٹھ، جنت وغیرہ کا۔ اس جنت کی خاطر لوگ مذہبی آدمی بنتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ اس پر مجھے اس بچے کی مثال یاد آجاتی ہے جو جلیبی کے لالچ میں نیک بنا بیٹھا رہتا ہے۔ اگر کوئی بچہ ہر وقت جلیبی کا تصور کرتا رہے تو کیا تم یہ نہ کہوگی کہ اس کی تربیت اچھی نہیں ہوئی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ پھر ان بچوں کو تو اور برا سمجھوگی جو جلیبی ہی کے لالچ میں ہر کام کریں۔ اب بتاؤ ان بوڑھے اور سمجھ دار لوگوں کو کیا کہوگی جن کا عمل اسی بچے کی طرح ہے؛ کیونکہ اس جلیبی اور اس جنت کے تخیل میں آخر فرق کیا ہے؟ ہم سب تھوڑے بہت خود غرض ہیں لیکن ہم اپنے بچوں کی اس طرح تربیت ضرور کرتے ہیں کہ وہ حتی الامکان خود غرض نہ ہونے پائیں۔ بہرحال ہمارا مطمحِ نظر بالکل بے غرضانہ ہونا چاہیے تاکہ ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کر سکیں۔

ہم سب کی خواہش ہوتی ہے کہ کچھ حاصل کریں اور اپنی محنت کا پھل چکھیں۔ یہ بالکل فطری چیز ہے۔ لیکن ہمارا مطمحِ نظر کیا ہوتا ہے؟ کیا ہمارا صرف اپنی ذات سے تعلق ہے یا دوسروں کی بہبودی کا فرض بھی ہم پر عائد ہوتا ہے، یعنی سماج کی بہبودی، اپنے ملک کی بہبودی یا تمام نوعِ انسانی کی بہبودی کا فرض؟ اس وسیع نظام میں ہم بھی تو بہرحال شامل ہیں۔ چند روز ہوئے میں نے اپنے کسی خط میں تمھیں سنسکرت کا ایک دوہا لکھا تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ فرد کو خاندان کے مفاد پر، خاندان کو قوم

کے مفاد پر اور قوم کو ملک کے مفاد پر قربان کر دینا چاہیے۔ آج میں ایک دوسرے سنسکرت دوہے کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ یہ بھاگوت گیتا کا اشلوک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "نہ میں عروج کے اس درجے کا طالب ہوں جہاں مجھے آٹھوں کمالات حاصل ہوں اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ دوبارہ جنم نہ ہو۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمام مخلوق کی تکلیفیں اور مصیبتیں اپنے سر لے لوں تاکہ انھیں رنج و غم سے نجات مل جائے۔"

ایک مذہب کا آدمی کچھ کہتا ہے اور دوسرے مذہب کا کچھ اور کہتا ہے اور اکثر ایک دوسرے کو احمق سمجھتے ہیں۔ اب ان میں سے کون حق پر ہے؟ چونکہ وہ ایسی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو نہ نظر آتی ہیں اور نہ ثابت کی جا سکتی ہیں، اس لئے ہمارے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ہماری رائے میں تو ان کا ایسی باتوں پر بحث کرنا اور ان کی خاطر ایک دوسرے کا سر پھوڑنا بالکل فضول ہے۔ ہماری عقل بہت محدود ہے، اس لئے کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ساری حقیقتیں ہم پر آشکارا ہو گئی ہیں اور دوسروں کو انھیں تسلیم کر لینا چاہیے۔ ممکن ہے ہم صحیح ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے صحیح ہوں۔ اگر کسی درخت پر تمھیں پھول کھلا ہوا نظر آئے تو تم پھول کو تو درخت نہیں کہو گی۔ پھر اگر دوسرے شخص کو صرف پتی نظر آئے اور تیسرے کو صرف تنا یا شاخ تو گویا ہر شخص نے درخت کا ایک جزو دیکھا، پورا درخت کسی نے نہیں دیکھا۔ اب ان میں سے ہر ایک کا اس چیز پر اصرار کرنا اور اس پر جھگڑنا کہ درخت صرف پھول یا پتّی یا تنے کو کہتے ہیں کتنی بڑی حماقت ہے۔

مجھے دوسری دنیا یا عاقبت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیونکہ مجھے اس دنیا کے کاموں سے فرصت کہاں ہے۔ میں مطمئن ہوں اگر یہاں مجھے اپنا راستہ صاف نظر آجائے، یعنی اگر یہ میری سمجھ میں آجائے کہ یہاں میرا فرض کیا ہے تو مجھے دوسری دنیا کی کوئی فکر نہیں۔

جب تم بڑی ہو گی تو ہر قسم کے لوگوں سے ملنے کا تمھیں اتفاق ہوگا، مذہبی آدمیوں سے بھی، ایسے لوگوں سے بھی جو مذہب کے مخالف ہیں اور ایسے لوگوں سے بھی جو نہ مذہب کے موافق ہیں نہ مخالف بلکہ اس سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتے۔ دنیا میں بڑے بڑے گرجا اور بڑے بڑے مذہبی ادارے موجود ہیں جن کے اختیار میں زبردست طاقت اور دولت ہے۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اچھے کام میں استعمال کرتے ہیں اور کبھی بُرے کام میں۔ مذہبی لوگوں میں تمھیں بہت سے نیک اور شریف لوگ بھی ملیں گے اور ایسے بدمعاش اور پاجی بھی ملیں گے جو مذہب کا جامہ پہن کر دوسروں کو لوٹتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ اس وقت تمھیں ان باتوں پر غور کرنا اور فیصلہ کرنا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان دوسروں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لیکن قابل قدر وہی چیز ہوتی ہے جو انسان خود معلوم کرے یا اپنے تجربے سے حاصل کرے چنانچہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جو ہر مرد عورت کو خود حل کرنا ہوتے ہیں۔

فیصلہ کرنے میں جلدی کی ضرورت نہیں۔ کسی بڑے یا اہم مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے تمھیں کافی تعلیم اور تجربہ حاصل کرنا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کو خود غور کرنا اور خود فیصلہ کرنا چاہیے لیکن پہلے فیصلہ کرنے کی اہلیت تو ہو۔ ایک دودھ پیتے بچے سے کسی بات کا فیصلہ کرنے کے لئے نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو سن کے لحاظ سے تو بہت بڑے ہوتے ہیں لیکن جہاں تک دماغ کا تعلق ہے وہ بالکل دودھ پیتے بچوں کی طرح ہوتے ہیں۔

آج میں نے بہت لمبا خط لکھ ڈالا اور ممکن ہے کہ تمھیں روکھا پھیکا بھی معلوم ہو۔ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ اس معاملے میں اپنا خیال ظاہر کردوں۔ اگر فی الحال تم ان میں سے کوئی بات نہ سمجھ سکو تو مضائقہ نہیں۔ بہت جلد تم ان کے سمجھنے کے لائق ہو جاؤ گی۔

(۱۵)

ایران اور یونان

۲۱ جنوری ۱۹۳۱ء

آج تمھارا خط ملا اور یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تم اور تمھاری اماں خیریت سے ہیں۔ خدا کرے دادو کا بخار اور دوسری شکایتیں بھی جاتی رہیں۔ وہ ساری عمر محنت کرتے رہے اور اب بھی انھیں آرام اور سکون میسر نہیں۔

اچھا، تم نے کتب خانے سے بہت سی کتابیں لے کر پڑھ ڈالیں اور مجھ سے اور کتابوں کے نام پوچھتی ہو۔ لیکن تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ کون کون سی کتابیں پڑھیں۔ کتابیں پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے لیکن جو لوگ بہت سی کتابیں جلد پڑھ لیتے ہیں میں انھیں ذرا شبہے کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ مجھے اس میں شک ہے کہ آیا وہ انھیں ٹھیک سے پڑھتے بھی ہیں یا یونہی گھاس کاٹتے چلے جاتے ہیں اور دوسرے دن اس کا ایک حرف بھی ذہن میں نہیں رہتا۔ اگر کوئی کتاب پڑھنے کے لائق ہے تو اسے نہایت غور سے پڑھنا چاہیے لیکن آج کل ایسی کتابیں زیادہ ہیں جو پڑھنے کے لائق ہی نہیں۔ اس لیے اچھی کتابیں منتخب کرنا آسان کام نہیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں نے تو آپ کے کتب خانے سے کتابیں لے کر پڑھی ہیں۔ وہ ضرور اچھی ہوں گی ورنہ آپ انھیں اپنے پاس رکھتے کیوں؟ اچھا خیر، تم پڑھے جاؤ اور یہاں نینی جیل سے بیٹھے بیٹھے میں جو کچھ تمھاری مدد کر سکتا ہوں وہ ضرور کروں گا۔ اکثر میں سوچا کرتا ہوں کہ تم ذہن اور جسم دونوں کے لحاظ سے کس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہو۔ کاش میں تمھارے پاس ہوتا! شاید جب تک یہ خط تمھارے پاس پہنچیں تم ان کے معیار سے بھی بلند

ہو جاؤ۔ خیر اس وقت تک چندر[۵] اس قابل ہو جائے گی کہ انھیں بڑھ سکے۔ غرض کوئی نہ کوئی ان کی قدر کر سکے گا اور میری محنت رائگاں نہ جائے گی۔

اچھا اب قدیم یونان اور ایران کا کچھ ذکر کرنا چاہیئے اور تھوڑی دیر کے لئے ان کی آپس کی جنگوں پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے۔ اپنے پچھلے کسی خط میں میں نے یونان کی شہری ریاستوں کا اور ایران کی اس عظیم الشان سلطنت کا ذکر کیا تھا جس پر دارا حکمراں تھا۔ دارا کی یہ سلطنت نہ صرف اپنی وسعت کے لحاظ سے بلکہ اپنے اعلیٰ نظام کے لحاظ سے بھی بہت زبردست تھی۔ یہ ایشیائے کوچک سے دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مصر اور ایشیائے کوچک کے چند یونانی شہر شامل تھے سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت اچھی سڑکیں بنی ہوئی تھیں جن پر شاہی ڈاک باقاعدہ آتی جاتی تھی۔ دارا نے کسی وجہ سے یہ طے کیا کہ یونان کی شہری ریاستوں کو فتح کرلے۔ اس سلسلے میں تاریخ کی بہت سی مشہور لڑائیاں ہوئیں۔

ہمیں ان لڑائیوں کا حال اس تاریخ سے معلوم ہوتا ہے جو ہیروڈوٹس نامی یونانی مورخ نے لکھی ہے۔ وہ ان واقعات کے بعد ہی کے زمانے میں گذرا ہے۔ اس نے یونانیوں کی کچھ پاس داری ضرور کی ہے لیکن اس کا تذکرہ بہت دلچسپ ہے۔ اس لئے میں اپنے ان خطوں میں اس کی تاریخ کے چند اقتباس بھی نقل کردوں گا۔

یونان پر پہلا ایرانی حملہ ناکام رہا، کیونکہ کوچ کے دوران میں ایرانی فوج کو وبا اور خوراک کی کمی کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا۔ وہ یونان پہنچ بھی نہ سکی اور ناکام واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد دوسرا حملہ ۴۹۰ء قبل مسیح میں ہوا۔ اس مرتبہ ایرانی فوج خشکی سے نہیں بلکہ سمندر کے راستے سے گئی اور اتھنس کے قریب ایک مقام مراتھن پر اتری۔ یونانی بہت گھبرا گئے کیونکہ ایرانی سلطنت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس خوف سے اتھنس

[۵] چندر لیکھا پنڈت۔ اندرا کی چھوٹی پھوپھی زاد بہن۔

والوں نے اپنے پرانے دشمنوں یعنی اسپارٹا والوں سے میل کرنا چاہا اور ان سے ایرانیوں کے خلاف مدد چاہی جو دونوں کے دشمن تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ اسپارٹا کی فوجیں کمک پر پہنچیں ایتھنس والوں نے ایرانی فوجوں کو شکست دے دی۔ یہ جنگ مراتھن کے نام سے مشہور ہے جو ۴۹۰ سنہ قبل مسیح میں ہوئی۔

بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یونان کی ایک چھوٹی سی شہری ریاست نے ایک زبردست سلطنت کی فوجوں کو شکست دے دی۔ لیکن حقیقت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یونانی اپنے وطن میں اور وطن کی حفاظت کی خاطر لڑ رہے تھے۔ ایرانی فوج وطن سے بہت دور تھی۔ اس کے علاوہ اس میں ایرانی سلطنت کے جگہ جگہ کے سپاہی شامل تھے۔ وہ صرف اس لئے لڑ رہے تھے کہ انھیں تنخواہ ملتی تھی۔ انھیں اس سے کوئی مطلب نہ تھا کہ یونان فتح ہو جائے۔ بہ خلاف اس کے ایتھنس والے اپنی آزادی کی خاطر لڑ رہے تھے۔ وہ آزادی کے عوض جان دینے کو تیار ہو گئے اور جو لوگ کسی مقصد کے لئے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں وہ فتح مند رہتے ہیں۔

غرض مارتھن میں دارا کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد ایران آکر اس کا انتقال ہو گیا اور Xerxes اس کا جانشین ہوا۔ اسے بھی یونان فتح کرنے کی آرزو تھی چنانچہ اس نے بھی اس مقصد کے لئے لشکر تیار کیا۔ اب یہاں میں تمھیں یہ دلچسپ قصہ ہیروڈوٹس ہی کی زبان میں سناؤں گا ارٹبانس Xerxes کا چچا تھا اس کا خیال تھا کہ یونان جانے میں ایرانی فوج کے لئے خطرہ ہے۔ اس لئے اس نے اپنے بھتیجے کو سمجھایا کہ یونان کے خلاف جنگ نہ کرے۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ Xerxes نے حسب ذیل الفاظ میں جواب دیا:-

آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن آپ کو ہر چیز میں خطرہ کیوں نظر آتا ہے


یونانی اور ایرانی
سلطنت دارا کی وسعت
پارتھیا
ایران
میڈیا
سوسہ
دجلہ
فرات
بابل
سارڈس
لڈیا
ایتھنز
عرب
مصر
ہندوستان

اور آپ پہلے ہی سے تمام مشکلات کا حساب کیوں لگانے لگتے ہیں۔ اگر ہر معاملہ میں آپ ہر چیز کے نفع نقصان کو تولنے لگیں تو دنیا میں کبھی کوئی کام نہیں کرسکتے آدمی اگر ہر چیز سے بھلائی کی توقع رکھے اور اسے دنیا بھر کی تکلیفیں اٹھانی پڑیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو لیکن دل میں ہر وقت آنے والی تکلیفوں کا اندیشہ رہے۔ اگر آپ ہر تجویز کی مخالفت کیا کریں گے اور خود کوئی صحیح راستہ تبائیں گے نہیں تو آپ کو ہم سے کم تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی ترازو کے دونوں پلّے برابر ہیں۔ پھر کوئی انسان یقین کے ساتھ یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ کون سا پلّہ جھکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ لیکن کامیابی انھیں کے قدم چومتی ہے جو عمل کا جوش رکھتے ہیں، ان کے پاس پھٹکتی بھی نہیں جو بزدل ہیں اور "اگر مگر" میں پڑے رہتے ہیں۔ ایران کا عروج آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے اگر مجھ سے پہلے کے بادشاہ آپ کی سی رائے یا آپ کے سے مشیر رکھتے تو ہماری سلطنت اتنی عظیم الشان کیسے ہوسکتی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو خطروں میں ڈال ڈال کر ہمیں اس مرتبہ پر پہنچا دیا۔ کوئی اچھی چیز خطروں کا سامنا کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی

میں نے یہ طویل اقتباس اس لئے درج کیا کہ مورخ کے ان الفاظ سے ہمیں اس ایرانی بادشاہ کے سمجھنے میں اتنی مدد ملتی ہے جتنی کسی دوسری کتاب سے نہیں ملتی۔ اتفاق سے ارٹبانس (Artabanus) کی رائے صحیح ثابت ہوئی اور ایرانی فوج کو یونانیوں کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ اگرچہ Xerkes ہار گیا لیکن اس کے الفاظ آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں اور ہمیں ایک پیام دیتے ہیں۔ آج جب کہ ہم بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہیں ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک ہم خطروں کی گھاٹیوں میں سے ہو کر نہیں گذریں

گے۔ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

غرض شہنشاہ Xerxes زبردست لشکر لے کر ایشیائے کوچک کے راستے یورپ پہنچا اور درہ دانیال کو جسے اس وقت ہیلس پانٹ کہتے تھے عبور کیا۔ کہتے ہیں کہ راستہ میں اس نے شہر ٹرائے کے کھنڈروں کی جہاں قدیم یونانی سورماؤں نے ہیلن کی خاطر اپنی جانیں لڑادی تھیں۔ خاص طور پر زیارت کی درہ دانیال پر ایک بہت بڑا پل بنایا گیا تاکہ فوج آسانی سے گزر جائے جب ساری فوج دوسرے کنارے پہنچ گئی تو ایک پہاڑی پر (Xerxes) کا سنگ مرمر کا تخت رکھا گیا اور اس پر بیٹھ کر اس نے اپنی فوج کا معائنہ کیا۔ یہاں پر ہیروڈوٹس (Herodotus) کہتا ہے کہ جب (Xerxos) نے تمام درہ دانیال کو اپنے جہازوں سے پٹا ہوا۔ اور سارے ساحل اور ابی ڈاس (Abydos) کے میدان کو اپنی فوج سے کھچا کھچ بھرا ہوا دیکھا۔ تو اس نے پہلے خوشی کا اظہار کیا پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اس کے چچا ارٹبانس (Artabanus) نے جس نے اسے یونان پر حملہ کرنے سے منع کیا تھا جب یہ کیفیت دیکھی تو دریافت کیا "اے بادشاہ ابھی چند لمحے پیشتر آپ کی کچھ اور کیفیت تھی اور اب کچھ اور حالت ہے۔ یعنی ابھی تو آپ نے مسرت کا اظہار کیا تھا اور اب آپ آنسو بہا رہے ہیں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے" بادشاہ نے جواب دیا ہاں یہ صحیح ہے۔ لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھے یہ خیال کر کے انسان پر ترس آنے لگا کہ اس کی زندگی کتنی مختصر ہے۔ آج میرے سامنے اتنا بڑا مجمع ہے۔ لیکن صرف ایک سو سال بعد ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہے گا۔"

خیر یہ لشکر خشکی کے راستہ روانہ ہوا۔ اور کنارے کنارے جہازوں کا بیڑہ چلا۔ لیکن سمندر نے یونانیوں کی مدد کی اور اتنا زبردست طوفان آیا کہ زیادہ تر جہاز تباہ ہو گئے۔ یونانی اس ٹڈی دل کو دیکھ کر گھبرا گئے انھوں نے اپنے سارے خانگی جھگڑوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اور غنیم کے مقابلہ میں متفق اور متحد ہو گئے۔ شروع شروع میں یونانی فوج پسپا ہوئی اور ترمایولای (Thermopylae) کے مقام پر اس نے ایرانیوں کو روکا۔ اس جگہ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف پہاڑ تھا اور درمیان میں راستہ اتنا تنگ تھا کہ مٹھی بھر آدمی بھی بڑی سے بڑی فوج کو آگے بڑھنے سے روک سکتے تھے۔ یہاں لیونی دس کی کمان میں اسپارٹا کے تین سو جوان تعینات تھے تاکہ اس درہ کی حفاظت میں اپنی جانیں لڑا دیں۔ ان کی کمک پر گیارہ سو یونانی موجود تھے۔ غرض جنگ مراتھن کے ٹھیک دس سال بعد اس روز جو ان کی قسمت کے فیصلہ کا دن تھا ان سورماؤں نے اپنے وطن کی خدمت کی خوب خوب داد دی۔ جب یونانی فوج پیچھے ہٹ رہی تھی تو یہ ایرانی فوج کو وہیں روکے رہے اس تنگ درے میں ایک کے بعد ایک سورما گرتا تھا اور دوسرے بڑھ کر ان کی جگہ لے لیتے تھے۔ لیکن ایرانی فوج کو کسی طرح بڑھنے نہیں دیتے تھے۔ تھرمایولائی پر جب لیونی دس اور اس کے پورے چودہ سو سپاہی کام آ گئے تب کہیں ایرانی آگے بڑھ سکے یہ ۴۸۰ء قبل مسیح یعنی آج سے دو ہزار چار سو دس برس پہلے کا واقعہ ہے لیکن آج بھی ان کی بے مثال بہادری کا خیال کر کے ہمارے سارے جسم میں جوش کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور آج بھی تھرمایولای کا مسافر ڈبڈبائی ہوئی

آنکھوں سے لیونی دس اور اس کے ساتھیوں کا یہ پیغام پڑھتا ہے۔ جو وہاں ایک پتھر پر کندہ ہے۔

"اے اس راہ سے گزرنے والے
ذرا اسپارٹا کو ہمارا یہ پیام سنا دینا
کہ تیرے جاں نثار، اپنی بات کے دھنی
یہاں سو رہے ہیں"

اس بہادری کا کیا کہنا جو موت کو فتح کرے! لیونی دس اور تھرماپولائی کا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ہم اتنی دور ہندوستان میں بیٹھے ہیں۔ لیکن جب ان کی سرفروشی اور جانبازی کا تصور کرکے ہماری رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔ پھر خود اپنے بزرگوں کا یعنی ہندوستان کے ان مردوں اور عورتوں کا تصور کرکے ہمارا کیا حال ہوتا ہوگا۔ جو موت کو دیکھ کر مسکراتے اور اسے ہیچ سمجھتے تھے۔ جنھوں نے غلامی اور ذلت کے مقابلہ میں ہمیشہ موت کو ترجیح دی اور جنھوں نے سر کٹوا دیا مگر یہ گوارا نہیں کیا کہ ظلم کے آگے سر جھکائیں۔ ذرا چتور اور اس کے بینظیر واقعہ کا اور راجپوت مردوں اور عورتوں کی حیرت انگیز بہادری کا تصور کرو! پھر ذرا موجودہ زمانہ پر بھی نظر ڈالو اور دوستوں کو دیکھو جن کا خون بھی ہماری طرح جوش کھاتا ہے اور جنھوں نے وطن کی آزادی کی خاطر موت سے بھی منہ نہیں موڑا۔

یونانیوں نے تھرماپولای پر ایرانی فوج کو تھوڑی دیر تو روکا لیکن ان کے مقابلہ کی زیادہ تاب نہ لا سکے اور پیچھے ہٹنے لگے حتیٰ کہ بہت سے یونانی شہر بھی ایرانیوں کے قبضے میں آگئے۔ غیر تمند ایتھنس والوں نے اپنے

پیارے شہر کی بربادی گوارا کر لی لیکن دشمن کے آگے سر جھکانا گوارا نہیں کیا۔ چنانچہ ہیاری کی ساری آبادی زیادہ تر جہازوں میں منتقل ہوگئی ایرانی سنسان شہروں میں داخل ہوئے اور انھیں آگ لگادی۔ یونانی بیڑے کو ابھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے اب سلامس کے قریب زبردست بحری جنگ ہوئی۔ جس میں تمام ایرانی جہاز تباہ ہو گئے اور اس تباہی سے (Xerxes) کا ایسا دل چھوٹا کہ وہ ایران واپس چلا گیا۔

ایرانی سلطنت کی عظمت ابھی کچھ عرصہ اور برقرار رہی لیکن مراتھن اور سلامس اس کے زوال کا پتہ دے رہے تھے۔ جو لوگ اس زمانہ میں زندہ ہوں گے انھوں نے حیرت کے ساتھ اس عظیم الشان سلطنت کی بنیادوں کو ہلتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ہروڈوٹس نے اس پر غور کیا اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر قوم کی تاریخ میں تین دور ہوتے ہیں یعنی عروج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زعم اور بے انصافی۔ اور زعم و بے انصافی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زوال، کامیابی، پھر غرور اور ظلم جو کامیابی کا نتیجہ ہے اور آخر میں زوال جو ان دونوں کا نتیجہ ہے۔

(۱۶)

یونانیوں کا عروج

۲۳ جنوری ۱۹۳۱ء

ایرانیوں پر یونانیوں کی فتح کے دو نتیجے برآمد ہوئے۔ ایرانی سلطنت کا رفتہ رفتہ تنزل شروع ہوا اور وہ کمزور ہوگئی اور یونانیوں کی تاریخ کا درخشاں باب شروع ہوا۔ لیکن یہ چمک دمک بہت تھوڑے دن رہی یعنی دو سو سال سے بھی کم۔ یہ عروج، ایران یا اس سے پہلے کی دوسری عظیم الشان سلطنتوں کا سا عروج نہ تھا۔ کچھ مدت بعد سکندر اعظم پیدا ہوا اور اس نے اپنی فتوحات سے تھوڑے دن کے لئے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا لیکن یہاں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ہم تو اس دور کا ذکر رہے ہیں جو ایران کی لڑائیوں اور سکندر اعظم کی آمد کے درمیان میں گذرا۔ یعنی تھرما پولائی اور سلامس کی جنگ سے لے کر ڈیڑھ سو برس بعد تک کا۔ ایرانی خطرے نے یونانیوں کو متحد کر دیا تھا لیکن جب یہ خطرہ جاتا رہا تو وہ پھر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ ایتھنس اور اسپارٹا کی ریاستیں خاص کر ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں مگر ہمیں ان کے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ تاریخی حیثیت سے ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں یونان اور بہت سی باتوں میں بڑھا چڑھا تھا اس لئے ان خانہ جنگیوں کا نام بھی سن لیا ورنہ کسی کو ان کا علم بھی نہ ہوتا۔

یونان کی اس زمانہ کی صرف چند کتابیں، چند مجسمے، اور چند گنتی کے

کھنڈر باقی ہیں۔ لیکن یہ بھی اس شان کے ہیں کہ ہم انھیں دیکھ کر محو حیرت ہوجاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ یونانی ہر چیز میں کتنا کمال رکھتے تھے ان کے ذہن کتنے ہمہ گیر اور ان کے ہاتھ کیسے سبک تھے کہ انھوں نے ایسی ایسی خوبصورت عمارتیں اور مجسمے بنا ڈالے۔ فی ڈیاس (Phidias) اس زمانہ کا مشہور سنگ تراش تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے سنگتراش مشہور گذرے ہیں۔ یونانیوں کے الم انگیز اور طرب انگیز ڈراموں کا شمار آج بھی دنیا کے بہترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔ سوفوکلیز (Sophocles) اسکائی لس (Aeschylus) یوریڈیز (Euripidos) ارسٹافلینز (Aristophanes) پنڈار Pindar) مناندر Menandar) اور سیفو Sappho) وغیرہ کا شاید ابھی تو تم نے صرف نام ہی نام سنا ہو لیکن جب تم بڑی ہوگی تو ان کی کتابیں پڑھوگی۔ اور یہ اندازہ کرسکوگی کہ یونانی کتنے ترقی یافتہ تھے۔

یونانی تاریخ کا یہ دور ہمارے لئے ایک ہدایت ہے کہ کسی ملک کی تاریخ ہمیں کس طرح پڑھنا چاہیئے اگر ہم ان کی خانہ جنگیوں اور یونانی ریاستوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی توجہ صرف کردیں تو ہمیں تاریخ کیا خاک معلوم ہوگی! ہاں اگر واقعی ہم انھیں سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کی ذہنیت کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ کیا سوچتے اور کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں یہ اندرونی تاریخ ہی تو اصل چیز ہے اور اسی کی بدولت آج یورپ قدیم یونانی تہذیب کا پروردہ سمجھا جاتا ہے۔

قوموں کی زندگی میں ترقی کے جو روشن دور آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں، ان کا مطالعہ کتنا عجیب اور دلچسپ ہوتا ہے کچھ عرصہ کے لئے ہر چیز

جگمگا اٹھتی ہے اور اس دور کے مردوں اور عورتوں میں یہ اہلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ حسین سے حسین چیزوں کی تخلیق کرسکیں۔ گویا لوگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی ایسے دور گذرے ہیں۔ بالکل ابتدائی دور جس کا ہمیں علم ہے وہ تھا جس میں وید۔ اپنشد اور دوسری کتابیں تصنیف ہوئیں۔ افسوس کہ اس قدیم زمانے کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ اس وقت کی بہت سی خوبصورت اور شاندار چیزیں برباد ہوگئی ہوں گی اور ممکن ہے کہ بہت سی ابھی موجود ہوں اور محفوظ اور ان کا پتہ نہ چلا ہو پھر بھی اتنا کافی مواد موجود ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستانی کتنے زبردست دماغ رکھتے تھے اس کے بعد کے زمانے میں بھی ہندوستانی تاریخ کے روشن دور گذرے ہیں اور ممکن ہے کہ ہم اپنی اس جہاں گردی میں ان کی سیر کریں۔

ایتھنس اس زمانہ میں خاص طور پر مشہور ہو گیا تھا اس کا رہنما ایک زبردست مدبر تھا جس کا نام Pericles) تھا تیس برس تک ایتھنس میں اس کا اقتدار رہا۔ اس مدت میں ایتھنس کی کایا پلٹ گئی۔ اس میں خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں اور بڑے بڑے صناع اور مفکر پیدا ہوئے اب بھی ہم اسے ' Pericles کے ایتھنس کے نام سے پکارتے ہیں اور اس زمانہ کو دور Pericles کہتے ہیں۔

ہمارا دوست مورخ (Herodotus) اسی زمانہ میں ایتھنس میں تھا۔ اس نے ایتھنس کی اس ترقی پر غور کیا اور چونکہ اسے اخلاقی نتیجے نکالنے کا بہت شوق تھا اس لئے اس واقعہ سے بھی نتیجہ نکالا چنانچہ وہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

ایتھنس کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس کا ثبوت ہر جگہ ملتا ہے سچ ہے آزادی بڑی اچھی چیز ہے ۔ جب ایتھنس والوں پر مطلق العنان بادشاہ کی حکومت تھی اس وقت وہ اپنے پڑوسیوں سے جنگ میں بہت کمزور پڑتے تھے لیکن انھیں اس سے نجات حاصل ہو گئی تو وہ ان سے بہت بڑھ گئے ۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غلامی میں وہ صحیح معنوں میں کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے آقا کے خیال سے کام کرتے تھے لیکن جب وہ آزاد ہو گئے تو ہر فرد نے خود بخود دل سے کوشش کی ۔"

اس زمانہ کے بعض مشہور لوگوں کے نام تو میں تمہیں بتا چکا ہوں لیکن سب سے بڑے شخص کا نام ابھی تک نہیں بتایا ۔ اس کا نام سقراط تھا وہ بہت بڑا فلسفی تھا اور ہمیشہ حق کی تلاش میں رہتا تھا، اس کے نزدیک صرف ایک چیز قابل قدر تھی یعنی حقیقی علم ۔ وہ اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں سے مشکل مسئلوں پر گفتگو کیا کرتا تھا ۔ اس خیال سے کہ شاید اسی تبادلۂ خیالات سے حق ظاہر ہو جائے ۔ اس کے بہت سے چیلے تھے جن میں سب سے بڑا افلاطون تھا ۔ افلاطون نے بہت سی کتابیں لکھیں جو اب تک موجود ہیں ۔ انھی کتابوں سے ہمیں اس کے استاد سقراط کا، بہت کچھ حال معلوم ہوتا ہے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حکومت ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتی جو ہمیشہ حق کی تلاش میں رہتے ہیں کیونکہ حق کی تلاش اسے نہیں بھاتی ۔ چنانچہ ایتھنس[1] کی حکومت کو بھی سقراط کا رویہ ناگوار ہوا ۔ اس نے اس پر مقدمہ چلایا اور موت کی سزا کا حکم صادر کر دیا ۔ اس نے سقراط سے کہا کہ اگر تم وعدہ کرو کہ لوگوں سے بحث و مباحثہ نہ کرو گے اور آئندہ

---

[1] یہ Pericles کے عہد کے تھوڑے ہی دن بعد کا واقعہ ہے ۔

اپنا طرز عمل بدل دوگے تو تمہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سقراط نے اس سے انکار کیا اور اپنے فرض سے پہلو تہی کرنے پر اس بات کو ترجیح دی کہ زہر کا پیالہ پی کر جان دیدے۔ مرنے سے پہلے اس نے الزام لگانے والوں، ججوں اور تمام ایتھنس والوں کو مخاطب کر کے اس طرح تقریر کی۔

"اگر تم مجھے اس شرط پر چھوڑنے کو تیار ہو کہ میں حق کی تلاش سے باز آؤں تو میرا یہ جواب ہے:۔ اے ایتھنس والو میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن میں تمہارے مقابلہ میں خدا کا حکم مانوں گا جس نے یہ خدمت میرے سپرد کی۔ اس لئے جب تک جان میں جان ہے میں فلسفہ کو ہرگز ترک نہ کروں گا۔ اور اپنی یہ عادت ہرگز نہ چھوڑوں گا کہ جو مجھے ملے اس سے یہی سوال کروں کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم دولت اور عزت کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو اور علم و دانش اور حق کی پروا نہیں کرتے جس سے تمہاری روحانی اصلاح ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ موت کیا چیز ہے؟ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو۔ بہر حال میں اس سے ذرا نہیں ڈرتا۔ مگر یہ مجھے یقین ہے کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا ضرور بری بات ہے اس لئے جس چیز میں اچھائی کا امکان ہے اسے میں اس پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا مجھے یقین ہے۔"

سقراط نے اپنی زندگی میں علم اور حق کی بہت خدمت کی لیکن اس سے زیادہ خدمت اس نے اپنی موت سے کی۔

آج کل تم سنتی ہوگی کہ اشتراکیت، سرمایہ داری اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے مسئلوں پر بہت کچھ بحث مباحثہ جاری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا مصیبت اور بے انصافیوں کا شکار ہو رہی ہے اور

اکثر لوگ اس سے گھبرا اُٹھتے ہیں اس لئے وہ اس حالت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ افلاطون نے بھی آئین حکومت پر غور کیا اور اس مسئلہ پر کتابیں لکھیں۔ گویا اس زمانہ میں بھی لوگ اس پر غور کیا کرتے تھے کہ ملک اور سماج کی حکومت کیسی ہونا چاہیئے تاکہ سب لوگ خوشحال رہیں اور ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آئے۔

جب افلاطون بوڑھا ہوا تو ایک اور یونانی جو کافی مشہور ہو چکا تھا میدان میں آیا۔ اس کا نام ارسطو تھا۔ وہ سکندر اعظم کا اتالیق تھا اور سکندر نے اس کی بڑی مدد کی۔ سقراط اور افلاطون کی طرح ارسطو فلسفے کی الجھنوں میں نہیں پڑا۔ اسے فطرت کے مظاہر کا مطالعہ کرنے اور قانون قدرت کو سمجھنے کا شوق تھا اس علم کا نام فلسفۂ طبیعی ہے۔ جسے آج کل سائنس کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا ارسطو بالکل شروع کے سائنس دانوں میں تھا۔

اب ہم ارسطو کے شاگرد کا تذکرہ کریں گے اور اس کی ترقی کی تیز رفتار کا مطالعہ کریں گے۔ لیکن یہ کل۔ آج تو میں نے بہت لکھ ڈالا۔

آج بسنت پنچمی ہے جو موسم بہار کی آمد کا پیام ہے۔ سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن گذر گئے اور ہوا کی برودت بھی ختم ہو گئی چڑیوں کے غول کے غول آنا شروع ہو گئے ہیں جو سارے دن چہچہایا کرتی ہیں اب سے پندرہ سال پہلے آج ہی کے دن دہلی میں تمہاری اماں سے میری شادی ہوئی تھی!

(۱۷)

ایک مشہور اور مغرور نوجوان فاتح

۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء

پچھلے خط میں اور اس سے پہلے کے خطوں میں بھی میں نے سکندر اعظم کا تذکرہ کیا تھا۔ شاید میں نے اسے یونانی بتایا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے حقیقت میں وہ مقدونیہ کا رہنے والا تھا جو یونان کے شمال میں واقع ہے مقدونیہ والے بھی بہت سی باتوں میں یونانیوں سے ملتے جلتے تھے۔ گویا تم انھیں رشتہ کے بھائی کہہ سکتی ہو۔ سکندر کا باپ فلپ مقدونیہ کا بادشاہ تھا۔ وہ نہایت قابل حکمراں تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی سلطنت کو بہت مستحکم کرلیا اور نہایت ترتیب یافتہ فوج تیار کی۔ سکندر کو "اعظم" کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور وہ تاریخ میں بہت مشہور ہے لیکن جو کچھ اس نے کیا وہ سب اس تیاری کی بدولت تھا جو اس کا باپ فلپ اس سے پہلے کرچکا تھا آیا سکندر واقعی ایک جلیل القدر انسان تھا یا نہیں۔ اس میں شک کی گنجائش ہے کم از کم میں تو اسے سورما نہیں مانتا لیکن اس میں شبہ نہیں اس نے دو براعظموں پر اپنا سکہ جما دیا اور تاریخ میں سب سے پہلا فاتح عالم سمجھا جاتا ہے۔ دور دراز وسطی ایشیا تک آج بھی سکندر کا نام مشہور ہے غرض حقیقت میں وہ چاہئے کچھ بھی نہ ہو لیکن تاریخ نے اس کے نام کو بہت چمکایا ہے۔ بیسیوں شہروں کے نام اس کے نام پر رکھے گئے جن میں سے اکثر اب تک باقی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مصر

کا اسکندریہ شہر ہے۔

اس کی عمر ابھی صرف بیس سال کی تھی کہ وہ بادشاہ ہوگیا اسے جاہ وجلال حاصل کرنے کی ہوس تھی اس لئے اس نے اپنے باپ کی ترتیب دی ہوئی فوج سے اپنے پرانے دشمن ایران پر حملہ کرنا چاہا۔ یونانی فلپ اور سکندر دونوں ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ان کی بڑھتی ہوئی قوت سے کچھ مرعوب ہوگئے تھے اس لئے انھوں نے یکے بعد دیگرے دونوں کو ایران پر حملہ کرنے والی تمام یونانی فوجوں کا سپہ سالار تسلیم کرلیا۔ گویا وہ اس نئی طاقت کے سامنے جو ابھر رہی تھی۔ جھک گئے۔ البتہ ایک یونانی شہر تھیبس نے اس سے بغاوت کی اس لئے اُس نے بڑے ظلم اور تشدد سے اسے کچل ڈالا۔ اس نے اس مشہور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی عمارتیں مسمار کردیں۔ باشندوں کا قتل عام کیا اور ہزاروں کو غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ اس کے اس وحشیانہ طرز عمل سے سارا یونان اس سے کانپنے لگا اس کی زندگی کا یہ واقعہ اور بربریت کی اسی قسم کی دوسری مثالیں ہمارے نزدیک کچھ قابل تعریف نہیں بلکہ ان کی وجہ سے ہمیں اس سے اور نفرت ہوتی ہے۔

مصر کو جو اس زمانہ میں ایرانی بادشاہ کے زیرنگیں تھا سکندر نے بڑی آسانی سے فتح کرلیا۔ وہ ایران کے بادشاہ (Xerxes) کے ایک جانشین دارا ثالث کو ایک بار شکست دے چکا تھا۔ لیکن وہ پھر ایران گیا اور دارا کو دوبارہ شکست دی چونکہ Xerxes نے یونان کو جلایا تھا اس لئے سکندر نے اس طرح اس کا بدلہ لیا کہ شہنشاہ دارا کے محل کو تباہ کرڈالا۔

فارسی میں ایک مشہور کتاب ہے جسے فردوسی شاعر نے اب کر

سکندر کی سلطنت



کوئی ہزار برس پہلے لکھا تھا۔ اس کا نام شاہنامہ ہے۔ یہ ایران کے بادشاہوں کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں سکندر اور دارا کی لڑائیوں کا حال بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ جب دارا کو شکست ہوئی تو اس نے ہندوستان سے مدد طلب کی۔ اور پورس کی خدمت میں جو شمال و مغربی ہند کا راجہ تھا ایک صبا رفتار اونٹ پر پیغام بھیجا۔ لیکن پورس اس کی کوئی مدد نہ کر سکا اور اس کے بعد ہی وہ خود سکندر کی غارت گری کا شکار ہو گیا۔ فردوسی کے شاہنامہ میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ ہے کہ فلاں فلاں ایرانی بادشاہوں اور امرا نے ہندوستانی تلواریں اور خنجر استعمال کیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر کے زمانے میں بھی ہندوستان میں بہترین فولاد کی تلواریں بنتی تھیں جن کی غیر ملکوں میں بڑی قدر ہوتی تھی۔

سکندر ایران سے آگے بڑھا اور اس علاقہ سے گزر کر جہاں اب ہرات، کابل اور سمرقند واقع ہیں۔ وہ دریائے سندھ کی شمالی ترائی میں پہنچا یہاں سب سے پہلے ہندوستانی راجہ سے اس کی مٹ بھیڑ ہوئی یونانی مورخوں نے اپنے یونانی طرز پر اس کا نام پورس لکھا ہے۔ اس کا نام اس سے کچھ ملتا جلتا ہو گا۔ لیکن ہمیں صحیح علم نہیں۔ کہتے ہیں کہ پورس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور سکندر کو اسے شکست دینا مشکل ہو گیا۔ پورس بڑا دلیر اور قد آور جوان تھا۔ سکندر اس کی دلیری اور شجاعت سے اتنا متاثر ہوا کہ شکست دینے کے بعد بھی اسے برسر حکومت رہنے دیا۔ لیکن اب وہ راجہ پورس نہ تھا بلکہ یونانیوں کا صوبہ دار تھا۔

سکندر درۂ خیبر سے ہو کر ٹکسیلا کے راستے سے آیا تھا جو راولپنڈی کے ذرا اوپر واقع ہے۔ اب بھی اس قدیم شہر کے کھنڈر موجود ہیں معلوم ہوتا

ہے کہ پورس کو شکست دینے کے بعد سکندر نے گنگا کی طرف آگے بڑھنے کا بھی ارادہ کیا تھا لیکن وہ اپنے اس ارادے کو پورا نہ کر سکا۔ وہ دریائے سندھ کے آگے نہیں بڑھا بلکہ اس کے کنارے کنارے جنوب کی طرف واپس ہو گیا ذرا تصور کیجیے کہ اگر سکندر خاص ہندوستان کی طرف بڑھا ہوتا تو کیا ہوتا۔ کیا وہ جیتا چلا آتا یا ہندوستانی فوجیں اسے شکست دیدیتیں ؟ جب سرحد کے پورس جیسے چھوٹے سے راجہ نے اس کے دانت کھٹے کر دئے تو بہت ممکن ہے کہ وسط ہند کی بڑی سلطنتیں اتنی طاقتور ثابت ہوتیں کہ سکندر کی پیش قدمی روک دیتیں۔ لیکن سکندر کی خواہش کچھ بھی رہی ہو اس کی فوج نے جواب دیدیا انھیں وطن سے نکلے کئی سال ہو گئے تھے۔ ممکن ہے وہ ہندوستانی سپاہیوں کی دلیری سے بھی مرعوب ہو گئے ہوں اور شکست کا خطرہ مول نہ لینا چاہتے ہوں خیر وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے واپسی پر اصرار کیا اور سکندر کو ان کی بات ماننا پڑی۔ واپسی کا سفر سکندر کے لئے بڑا تباہ کن ثابت ہوا اور فوج کو کھانے پینے کی کمی سے تکلیف اٹھانی پڑی۔ اس کے بعد ہی ۳۲۳ قبل مسیح میں، بابل میں سکندر کا انتقال ہو گیا۔ گویا ایرانی مہم پر روانگی کے بعد سکندر کو پھر اپنے وطن مقدونیہ کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

غرض سکندر کا ۳۳ برس کی عمر میں انتقال ہوا اس عظیم الشان" انسان نے اپنی اس مختصر زندگی میں کیا تیر مارا ؟ بس چند شاندار لڑائیاں جیت لیں، مانا کہ وہ بہت اچھا سپہ سالار تھا لیکن بہت مغرور اور بد دماغ تھا اور کبھی کبھی بڑا ظلم بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دیوتا سے کم تھوڑی سمجھتا تھا وہ غیض و غضب کے جوش یا وقتی جذبہ کے ماتحت اپنے بہتر سے بہتر دوستوں کو قتل کرا دیتا تھا اور بڑے بڑے شہروں کو ان کے باشندوں سمیت مٹی میں ملا دیتا

تھا۔ اس نے اپنے پیچھے اپنی سلطنت میں جسے اس نے خود فتح کیا تھا کوئی پائدار چیز نہ چھوڑی حتیٰ کہ اچھی سڑکیں بھی نہ بنوائیں۔ شہاب ثاقب کی طرح وہ افق پر نمودار ہوا اور چھپ گیا اور نام کے سوا کوئی نشان نہیں چھوڑ گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے خاندان والوں نے آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کرنا شروع کیا اور اس کی یہ زبردست سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی وہ فاتح عالم مشہور ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ یہ خیال کرکے رونے لگا کہ اب میرے فتح کرنے کے لئے اس سرزمین پر کوئی گوشہ باقی نہیں رہا۔ لیکن اس کا رونا غلط تھا۔ ابھی تو ذرا سے شمالی و مغربی علاقے کے علاوہ سارا ہندوستان فتح کرنے کو پڑا تھا۔ چین بھی اس زمانہ میں بہت بڑی سلطنت تھی اور سکندر کو اس کی ہوا تک نہ لگی تھی۔

اس کے مرنے کے بعد سلطنت کو اس کے سرداروں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ مصر بطلیموس کے حصہ میں آیا۔ جس نے وہاں نہایت مستحکم حکومت قائم کی اور اس کا خاندان عرصہ تک وہاں حکمرانی کرتا رہا۔ اس کا پایہ تخت اسکندریہ تھا۔ اس زمانہ میں مصر نے بڑی قوت حاصل کی۔ اور اسکندریہ اپنے علم و فن اور فلسفہ و سائنس کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔

ایران، میسوپوٹامیا اور ایشیائے کوچک کا کچھ حصہ ایک دوسرے سردار سلوکس کو ملا۔ اسی کے حصہ میں ہندوستان کا وہ شمال و مغربی علاقہ آیا۔ جسے سکندر نے فتح کیا تھا۔ لیکن وہ ہندوستان پر کوئی اقتدار قائم نہ رکھ سکا۔ اور سکندر کے انتقال کے بعد ہی یونانی رسالہ یہاں سے نکال باہر کر دیا گیا۔

سکندر ۳۲۶ء قبل مسیح میں ہندوستان آیا تھا اس کا یہ حملہ ایک

حملے کی شکل کا تھا جس سے ہندوستان کے حالات میں کوئی فرق نہیں پڑا
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حملہ کی بدولت ہندوستانیوں اور
یونانیوں کے درمیان ایک رابطہ پیدا ہو گیا۔ لیکن حقیقت میں سکندر
کے حملے سے بہت پہلے مشرق و مغرب میں آمد و رفت جاری تھی اور
ہندوستان کا تعلق ایران اور یونان سے برابر قائم تھا۔ البتہ سکندر کی
آمد سے اس ربط ضبط میں اضافہ ہو گیا اور یونانی اور ہندوستانی تہذیبیں
آپس میں زیادہ مل جل گئیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان
کا نام "انڈیا" خود یونانی نام انڈس سے ماخوذ ہے کیونکہ یونانی دریائے
سندھ کو اسی نام سے پکارتے تھے۔

سکندر کے حملے اور اس کی موت کا ہندوستان پر یہ اثر پڑا
کہ ایک زبردست سلطنت یہاں قائم ہو گئی۔ یعنی سلطنت موریہ۔ یہ
ہندوستانی تاریخ کا بڑا روشن دور گذرا ہے۔ اس لئے ہمیں تھوڑا
سا وقت اس کی نذر بھی کرنا چاہیئے۔

(۱۸)

چندرگپت موریہ اور ارتھ شاستر

۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء

اپنے کسی خط میں، میں نے مگدھ کا ذکر کیا تھا۔ یہ ایک پرانی سلطنت تھی، ٹھیک اس جگہ جہاں اب صوبہ بہار ہے۔ اس کی راجدھانی پاٹلی پتر تھی جسے اب پٹنہ کہتے ہیں۔ جس زمانہ کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں۔ مگدھ میں نندا خاندان کا راج تھا۔ جب سکندر نے شمال و مغربی ہند پر حملہ کیا۔ اس وقت پاٹلی پتر میں ایک نندا راجہ راج کرتا تھا۔ چندرگپت نامی ایک نوجوان اس راجہ کا غالباً رشتہ دار تھا وہ بڑا ہوشیار نہایت مستعد اور اولوالعزم شخص تھا اس لئے نندا راجہ نے اسے خطرناک آدمی سمجھ کر کسی جرم پر ملک بدر کر دیا۔ چندرگپت ٹکسیلا گیا۔ شاید سکندر اور یونانیوں کے قصوں کی کشش اسے وہاں لے گئی اس کے ساتھ ایک بڑا قابل برہمن تھا جس کا نام وشنو گپت اور عرف چانک تھا۔ چندرگپت اور چانک دونوں ایسے مسکین تو تھے نہیں کہ قسمت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ان کے دماغوں میں تو بڑی بڑی تجویزیں چکر لگا رہی تھیں۔ اس لئے وہ دنیا میں کچھ کرنا اور کامیاب ہونا چاہتے تھے۔ شاید چندرگپت سکندر کے جاہ و جلال سے متاثر ہو کر خود بھی اسی جیسا بننا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس مقصد کے لئے چانک جیسا سچا دوست اور مشیر اُسے مل گیا۔ یہ دونوں ٹکسیلا کے واقعات کا بہت غور سے مطالعہ کرتے رہے

اور مناسب موقع کے انتظار میں رہے۔

بہت جلد وہ موقع آگیا۔ جیسے ہی سکندر کی موت کی خبر ٹکسیلا پہنچی چندر گپت نے سمجھ لیا کہ اب عمل کا وقت آگیا ہے۔ لہذا اس نے آس پاس کے لوگوں کو ابھارا اور ان کی مدد سے اس یونانی رسالہ پر جو سکندر چھوڑ گیا تھا حملہ کر دیا اور اسے مار بھگایا۔ اس طرح ٹکسیلا پر قبضہ کرنے کے بعد چندر گپت اور اس کے ساتھیوں نے پاٹلی پتر پر حملہ کر کے نند راجہ کو شکست دے دی۔ یہ ۳۲۱ قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ یعنی سکندر کی موت سے صرف پانچ سال بعد کا۔ اور یہاں سے موریہ خاندان کی حکومت شروع ہوتی ہے۔ معلوم نہیں چندر گپت کو موریہ کیوں کہتے ہیں؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی ماں کا نام مورا تھا اس لئے اسے موریہ کہنے لگے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا نانا راجہ کے موروں کا نگراں اور محافظ تھا۔ اس وجہ سے اس کا یہ لقب پڑ گیا۔ بہر حال وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو، وہ اسی لقب سے مشہور ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس میں اور اس کے ایک ہم نام مشہور و معروف راجہ میں جو کئی سو سال بعد ہندوستان میں گزرا ہے۔ امتیاز کیا جا سکے۔

مہابھارت اور دوسری پرانی کتابوں اور قصے کہانیوں میں چکرورتی راجاؤں کا ذکر ملتا ہے جن کی حکومت سارے بھارت پر تھی۔ لیکن ہمیں اس زمانہ کا صحیح علم نہیں ہے اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس زمانہ میں بھارت ورش کے حدود کیا تھے۔ ممکن ہے ان قصوں میں پرانے راجاؤں کی عظمت اور اقتدار کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہو۔ بہر حال جو صورت بھی ہو۔ ہندوستان کی تاریخ میں وسیع اور مستحکم سلطنت کی سب سے پہلی مثال ہمیں چندر گپت موریہ کے راج میں ملتی ہے۔ آگے چل کر میں بتاؤں

گاکہ اس کی حکومت نہایت طاقتور اور ترقی یافتہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی مکمل حکومت ایک دو دن میں تو بن نہ گئی ہو گی۔ عرصہ تک مختلف مدارج طے ہوتے رہے ہوں گے یعنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مل کر بڑی ریاستیں بننا اور آئین حکومت میں بتدریج ترقی کرنا۔

چندرگپت کے زمانے میں، سکندر کے سردار سلوکس نے جسے ایشیائے کوچک سے لے کر ہندوستان تک کے ملک حصہ میں ملے تھے ایک بہت بڑی فوج لے کر ہندوستان پر حملہ کر دیا اور سندھ ندی کو پار کر لیا۔ لیکن اسے فوراً ہی اپنی نا عاقبت اندیشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا چندرگپت نے اسے بری طرح شکست دی اور سلوکس جس راستہ آیا تھا۔ اسی راستہ واپس گیا۔ اور کچھ حاصل ہونے کی جگہ الٹا اسے کابل اور ہرات تک گندھار یا افغانستان کا علاقہ چندر کے حوالہ کرنا پڑا۔ چندرگپت نے سلوکس کی لڑکی کے ساتھ شادی بھی کی۔ اب اس کی سلطنت تمام شمالی ہند اور افغانستان تک پھیل گئی۔ یعنی کابل سے بنگال تک اور بحر عرب سے خلیج بنگال تک۔ صرف جنوبی ہند اس کے قبضہ میں نہ تھا۔ پاٹلی پتر اس زبردست سلطنت کی راجدھانی تھی۔

سلوکس نے میگس تھینس نامی اپنا ایک سفیر چندرگپت کے دربار میں مقرر کیا۔ میگس تھینس نے اس زمانہ کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا ہے لیکن اس سے زیادہ دلچسپ ایک اور تذکرہ ہے جس میں چندرگپت کے طرز حکومت کی پوری تفصیلات درج ہیں۔ یہ کوتلیہ کا ارتھ شاستر ہے۔ کوتلیہ کون ہے؟ وہی ہمارا پرانا دوست چانک یا وشنوگپت اور ارتھ شاستر کے معنی ہیں "دولت کا علم" یا "اقتصادیات"۔

اس کتاب میں اتنے موضوع ہیں اور اتنے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہاں اس کے متعلق تفصیل سے کچھ لکھنا بالکل ناممکن ہے۔ کون سی چیز ہے جو اس میں نہیں ہے، راجاؤں اور ان کے وزیروں اور مشیروں کے فرائض، مجلس شوریٰ۔ حکومت کے مختلف محکمے اور شعبے، بیوپار اور تجارت، شہر اور دیہات کا نظم ونسق، قانون اور عدالت، سماجی عادات اور رسم و رواج، عورتوں کے حقوق۔ بوڑھوں اور لاوارثوں کی نگہداشت شادی اور طلاق، محصول بندی۔ بری اور بحری۔ جنگ و صلح، سیاسی حکمت عملی۔ زراعت، کاتنا اور بُننا، صناع اور پیشہ ور، پروانہ راہ داری۔ یہاں تک کہ جیلوں کا ذکر بھی نہیں چھوٹا۔ غرض اس میں اتنی چیزوں پر بحث کی گئی ہے کہ اگر میں چاہوں تو اس سلسلہ کو بڑھاتا چلا جاؤں لیکن اس سے کیا فائدہ کہ یہ سارا خط کوتلیہ کی کتاب کی فہرست مضامین سے بھر جائے۔

راجہ کو تاجپوشی کے وقت شاہی اختیارات رعایا سونپتی تھی اس کے بعد وہ رعایا کی خدمت کا ان الفاظ میں حلف اٹھاتا تھا کہ اگر تم پر ظلم کروں تو پرماتما مجھے بیکنٹھ سے، زندگی سے، آل اولاد سے۔ غرض اپنی ہر نعمت سے محروم کر دے۔ اس کتاب میں بادشاہ کے روزمرہ کے مشاغل بھی لکھے ہیں۔ ضروری کام کے لئے اسے ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا کیونکہ رعایا کا کام اس خیال سے روکا نہیں جا سکتا کہ جب راجہ کا جی چاہے کرے۔: اگر راجہ مستعد ہوگا تو اس کی رعایا بھی اتنی ہی مستعد ہوگی رعایا کی خوشی میں راجہ کی خوشی ہے۔ رعایا کی بہبودی میں راجہ کی بہبودی ہے۔ راجہ کو وہ چیز پسند نہ کرنی چاہئے۔ جس میں اس کی خوشی ہو بلکہ وہ جس

میں رعایا کی خوشی ہو۔ آج ہماری دنیا سے بادشاہی کا رواج اُٹھتا چلا جاتا ہے اب تھوڑے سے بادشاہ رہ گئے اور جو رہ گئے ہیں وہ بھی جلد ختم ہو جائیں گے لیکن یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ قدیم ہندوستان میں بادشاہت کا مفہوم رعایا کی خدمت تھا۔ بادشاہوں کو نہ خداداد حقوق حاصل تھے اور نہ وہ مطلق العنان تھے۔ اگر کوئی بادشاہ غلط رویہ اختیار کرتا تو لوگوں کو حق تھا کہ اسے گدّی سے اتار دیں اور اس کی جگہ دوسرے کو بٹھا دیں۔ یہ تھا بادشاہی کا تصور اور اس کا نظریہ، اس میں شک نہیں کہ بہت سے بادشاہ اس معیار پر پورے نہ اُترے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی حماقتوں کی بدولت ملک اور قوم پر مصیبتیں نازل ہوئیں۔

ارتھ شاستر میں اس پرانے اصول پر بھی بہت زور دیا گیا ہے کہ "آریہ کبھی غلام نہیں ہو سکتا"۔ مانا کہ اس وقت بھی ہندوستان میں غلام موجود تھے جو باہر سے آتے تھے یا اپنے ہی ملک کے غیر آریہ ہوتے تھے لیکن اس کا نہایت سختی سے لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کسی آریہ کو غلام نہ بنایا جائے۔

موریہ سلطنت کی راجدھانی پاٹلی پتر تھی۔ یہ بڑا عظیم الشان شہر تھا جو گنگا کے کنارے کنارے نو میل تک آباد تھا۔ اس کی شہر پناہ میں چونسٹھ بڑے بڑے پھاٹک اور سینکڑوں چھوٹے دروازے تھے۔ مکان عموماً لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کی غیر معمولی احتیاط کی جاتی تھی کہ کہیں آگ نہ لگنے پائے۔ چنانچہ خاص خاص سڑکوں پر پانی کے بھرے ہوئے ہزاروں برتن ہر وقت رکھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر گھر کے مالک کے لئے بھی لازم تھا کہ وہ پانی کے بھرے ہوئے برتن، سیڑھیاں، کانٹے اور آگ بجھانے کا دوسرا سامان تیار رکھے تاکہ ضرورت کے وقت فوراً

کام آسکے ۔

تمہیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ ارتھ شاستر میں شہروں کے لئے ایک بہت عمدہ قاعدہ لکھا ہے۔ یعنی جو کوئی گلی میں کوڑا کرکٹ پھینکے گا اس پر جرمانہ ہوگا یا اگر کوئی شخص گلی میں کیچڑ یا پانی جمع ہونے دے گا۔ اس پر جرمانہ کیا جائے گا۔ اگر یہی قانون نافذ تھے تو پاٹلی پتر اور دوسرے شہر بہت صاف ستھرے اور صحت بخش رہے ہوں گے۔ کاش ہماری میونسپلٹیاں بھی اپنے یہاں اسی قسم کے کچھ قانون نافذ کریں!

پاٹلی پتر میں ایک میونسپل کونسل تھی جس کے سپرد شہر کا تمام انتظام تھا۔ اس میں تیس ممبر ہوتے تھے جنھیں شہر کے تمام باشندے منتخب کرتے تھے ان تیس ممبروں کی چھ کمیٹیاں ہوتی تھیں یعنی ہر کمیٹی میں پانچ ممبر ہوتے تھے۔ یہ کمیٹیاں صنعت و حرفت اور دستکاری، مسافروں اور یاتریوں کا انتظام۔ ٹیکس لگانے کی غرض سے فوتی پیدائش کے اندراج۔ اور مصنوعات وغیرہ کی نگرانی کرتی تھیں اور پوری کونسل صفائی اور حفظان صحت، مالیات آب رسانی۔ باغات اور تعمیرات عامہ کا انتظام کرتی تھی۔

مقدمے فیصل کرنے کے لئے پنچایتیں اور اپیل کی عدالتیں۔ اگر کہیں قحط پڑ جاتا تو قحط زدہ علاقہ کو امداد پہنچانے کی خاص کوشش کی جاتی۔ ریاست کے تمام ذخیروں میں آدھی جنس اس لئے محفوظ رکھی جاتی تھی کہ قحط پڑنے پر کام آئے۔

یہ تھی موریہ سلطنت جس کی چندر گپت اور چانک نے اب سے بائیس سو برس پہلے تنظیم کی تھی۔ میں نے ان باتوں میں صرف چند کا تذکرہ کیا ہے جو کوٹلیہ اور میگس تھینیس نے لکھی ہیں۔ انھی باتوں سے تمہیں یہ اندازہ ہوجائے

گا کہ اس زمانہ میں شمالی ہند کی کیا حالت تھی۔ پاٹلی پتر کی راجدھانی سے لے کر تمام بڑے بڑے شہروں اور سلطنت کے ہزاروں قصبوں اور گانوؤں تک زندگی کی ایک لہر دوڑ رہی ہوگی۔ ملک کے ایک حصّہ سے لے کر دوسرے حصّہ تک بڑی بڑی سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ راج پاتھ یعنی شاہراہ پاٹلی پتر سے شمال و مغربی سرحد تک جاتی تھی۔ بہت سی نہریں بھی جاری تھیں اور ان کی نگہداشت کے لئے ایک خاص محکمہ آبپاشی قائم تھا۔ اس کے علاوہ بندرگاہوں۔ گھاٹوں۔ پلوں اور ان بے شمار کشتیوں اور جہازوں کے لئے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے۔ ایک بحری محکمہ بھی قائم تھا اور ہندوستان کے جہاز سمندروں کو پار کر کے برما اور چین تک جاتے تھے

اس سلطنت پر چندر گپت نے ۲۴ برس تک حکومت کی اور ۲۹۶ سنہ قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا۔ دوسرے خط میں بھی موریہ سلطنت کا ذکر رہے گا۔

(۱۹)

یہ تین مہینے!

کریکو ویہ جہاز سے

۲۱ر اپریل ۱۹۳۱ء

تمہیں خط لکھے ایک عرصہ ہو گیا - یعنی قریب قریب تین مہینے گذر گئے کیسے تین مہینے! رنج اور پریشانی اور دوڑ دھوپ کے تین مہینے - ان تین مہینوں میں ہندوستان میں بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔ خصوصاً ہمارے گھرانے میں بہت تغیر ہو گیا ہے - ملک میں تو ستیہ آگرہ یا سول نافرمانی کی تحریک کچھ عرصہ کے لئے روک دی گئی لیکن وہ مشکلات جن کا ہمیں سامنا ہے آسانی سے حل ہونے والی نہیں - اور ہمارا خاندان اپنے اس محبوب ترین سرپرست سے محروم ہو گیا - جس نے ہمیں جوش اور قوت عمل بخشی تھی جس کے سایۂ عاطفت میں ہم پلے بڑھے اور ہم نے اپنی بھارت ماتا کی خدمت کرنا سیکھی

مجھے نینی جیل کا وہ دن خوب یاد ہے۔ ۲۶ر جنوری کی تاریخ تھی اور میں حسب عادت بیٹھا ہوا تمہیں پچھلے زمانہ کا حال لکھ رہا تھا اس سے ایک دن پہلے میں نے چندر گپت موریہ اور اس کی قائم کی ہوئی سلطنت کا حال لکھا تھا اور آخر میں یہ وعدہ کیا تھا کہ موریہ سلطنت کے اس قصّے کو جاری رکھوں گا اور ان لوگوں کا بھی حال لکھوں گا جو چندر گپت کے بادشاہ ہوئے - مثلاً اشوک اعظم کا جو دیوتاؤں کا محبوب تھا - اور جو

ہندوستان کے افق پر ایک درخشاں ستارے کی طرح چمکا اور غروب ہوگیا۔ لیکن دنیا میں اپنا نام چھوڑ گیا جو کبھی نہ مٹے گا اشوک کے خیال کے ساتھ میرا ذہن ادھر اُدھر سرگردان رہا۔ پھر یکایک یعنی ۲۶ر جنوری کی طرف منتقل ہوگیا جب کہ میں قلم دوات اور کاغذ لئے تمہیں خط لکھ رہا تھا۔ یہ دن ہمارے لئے بڑے فخر کے کا دن تھا کیونکہ اب سے ایک سال پہلے اسی دن ہم نے سارے ہندوستان میں، ہندوستان کے ہر شہر اور گاؤں میں "یوم آزادی" یا "پورن سوراج" کا دن منایا تھا۔ اور لاکھوں آدمیوں نے مکمل آزادی کا حلف اُٹھایا تھا۔ اس کے بعد ایک سال گذر چکا ہے۔ یہ جد وجہد کا مصیبت کا اور اس کے بعد کامیابی کا سال تھا آج ہم پھر وہی دن منانے کو تھے۔ میں نینی جیل کے بارک نمبر ۶ میں بیٹھا ہوا ان جلسوں اور جلوسوں اور لاٹھی چارجوں اور گرفتاریوں کا تصور کر رہا تھا جو آج سارے ملک میں ہونے والی ہیں۔ میں فخر، مسرت اور رنج کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اس کا تصوّر کر رہا تھا کہ یکا یک میرے تصور کی دنیا درہم برہم ہوگئی۔ باہر سے مجھے اطلاع ملی کہ دادو بہت سخت بیمار ہیں اور مجھے ان کی خدمت میں حاضر رہنے کے لئے فوراً رہا کیا جائے گا۔ اس تشویش میں اپنے تصورات کو بھول گیا اور وہ خط میں نے تمہارے نام ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا، اٹھا کر رکھ دیا اس کے بعد میں نینی جیل سے آنند بھون کے قصد سے روانہ ہوگیا۔

دادو کے انتقال سے پہلے دس دن رات تک میں ان کے ساتھ رہا۔ اور اس مختصر زمانہ میں، ان کی تکلیف اور بے چینی کو دیکھتا رہا کہ وہ کس ہمت اور دلیری سے موت کے فرشتے سے جنگ کر رہے تھے انھوں

نے اپنی زندگی میں بہت سی لڑائیاں لڑی ہیں اور بہت سی فتحیں حاصل کی ہیں۔ وہ ہار ماننا تو جانتے ہی نہ تھے اس لئے اس وقت بھی جب وہ موت کے سامنے کھڑے تھے، ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔ میں ان کی اس آخری کشمکش کا مشاہدہ کر رہا تھا اور اپنی اس بے بسی پر سخت بےچین تھا کہ جسے میں اتنا پیار کرتا ہوں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس وقت مجھے ایڈگر ایلن پو کے وہ الفاظ یاد آئے جو میں نے اس کے کسی فسانہ میں پڑھے تھے۔ وہ لکھتا ہے "انسان اس وقت تک فرشتوں کے سامنے نہیں جھکتا اور نہ موت سے ہار مانتا ہے جب تک اس کی قوت ارادی کمزور نہ ہو جائے۔"

غرض ۶ / فروری کو صبح سویرے وہ ہمیں چھوڑ کر سدھار گئے اور ہم ان کی لاش کو اس سہ رنگے جھنڈے میں لپیٹ کر جو انھیں بہت محبوب تھا لکھنو سے آنند بھون لائے۔ یہاں چند ہی گھنٹے میں وہ مٹھی بھر راکھ میں تبدیل ہو گئے اور گنگا اس دربے بہا کو سمندر میں بہا لے گئی۔

لاکھوں آدمیوں نے ان کے لئے آنسو بہائے لیکن کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ ہم پر کیا گذری۔ ہم جو ان کے بچے تھے جو ان کا گوشت اور پوست تھے اور ذرا اس نئے آنند بھون پر بھی نظر ڈالو۔ جو ہماری طرح ان کا بچہ ہے اور جسے انھوں نے بڑی محبت اور اہتمام سے بنوایا تھا۔ آج یہ بھی اجڑا اجڑا معلوم ہو رہا ہے جیسے اس کی روح نکل گئی ہو اور بے جان ڈھانچہ کھڑا ہو۔ ہم اس کے برآمدے میں اب بھی ہلکے ہلکے قدم رکھتے ہیں کہ جس شخص نے اسے بنوایا ہے اس کے آرام میں خلل نہ پڑے۔

ہم ان کے لئے افسوس کرتے ہیں اور ہر قدم پر ان کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ دن گذرتے چلے جاتے ہیں لیکن ان کا غم کم نہیں ہوتا اور ان

کی جدائی ویسی ہی ناقابل برداشت ہے۔ لیکن پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ یہ چیز انھیں پسند نہ آئے گی۔ وہ یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ ہم رنج کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ بلکہ ان کی خواہش تو یہ ہو گی کہ ہم مردانہ وار اس کا مقابلہ کریں جیسے وہ اپنی مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے اور اس پر فتح حاصل کریں وہ چاہتے ہوں گے کہ ہم اس کام کو پورا کریں۔ جو وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں جب کام ہمیں پکار رہا ہو اور ہندوستان کی آزادی ہماری خدمات طلب کر رہی تو ہمیں کیا حق ہے کہ بے کار بیٹھے رنج کرتے رہیں۔ اسی مقصد کی خاطر انھوں نے جان دی۔ اور اسی کے لیئے ہم جیئں گے اور لڑیں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو جان دیدیں گے۔ آخر ہم بھی تو انھیں کی اولاد ہیں اور ہمارے اندر بھی وہی آگ بھڑک رہی ہے اور وہی قوت وعزم موجود ہے

میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں اور میری نظروں کے سامنے گہرا نیلا بحر عرب دور تک پھیلا ہوا ہے اور سامنے بہت دور ہندوستان کا ساحل چھپتا جا رہا ہے۔ میں اس کھلی ہوئی وسیع فضا پر نظر ڈالتا ہوں اور پھر اپنی نینی جیل کی بارک سے اس کا مقابلہ کرتا ہوں جس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اٹھی ہوئی تھیں اور جس میں بند ہو کر میں تمہیں خط لکھا کرتا تھا افق کی صاف لکیر میرے سامنے ہے جہاں سمندر اور آسمان ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جیل میں ایک قیدی کا افق اس کے احاطہ کی دیوار کا آخری کنارہ ہوتا ہے۔ آج ہم میں سے بہت سے لوگ جو جیل میں تھے اب باہر ہیں اور کھلی ہوا میں سانس لے سکتے ہیں۔ لیکن ابھی ہمارے بہت ساتھی تنگ کوٹھریوں میں بند ہیں، اور سمندر میں اور افق کے نظارے سے محروم ہیں اور خود ہندوستان ابھی قید ہے اور اس کی آزادی بہت دور ہے ہماری آزادی کس کام کی اگر ہندوستان آزاد نہ ہو؟

(۲۰)

بحرِ عرب

کریکوویہ جہاز سے

۲۲/ اپریل ۳۱ء

کیسا اتفاق ہے کہ ہم بمبئی سے کولمبو اسی کریکوویہ جہاز پر جارہے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اب سے چار سال پہلے وینس میں، میں اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ دادو اس سے آرہے تھے۔ اور میں ان سے ملنے وینس گیا تھا اور تمہیں بیکس کے اسکول میں سوئزرلینڈ میں چھوڑ گیا تھا پھر چند ماہ بعد دادو اسی جہاز سے یورپ سے واپس ہوئے اور میں بمبئی میں انھیں لینے گیا تھا۔ اس سفر میں جو لوگ ان کے ساتھ تھے وہ اتفاق سے اب ہمارے ساتھ جا رہے ہیں اور اکثر ان کی بہت سی باتیں بیان کیا کرتے ہیں۔

میں نے کل تمہیں اس انقلاب کے متعلق کچھ لکھا تھا جو پچھلے تین مہینہ میں ملک میں ہوگیا ہے۔ لیکن پچھلے چند ہفتوں میں ایک واقعہ ایسا ہوا جسے میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ یاد رکھو۔ کیونکہ ہندوستان اسے برسوں تک بھلا نہیں سکتا۔ ابھی پورا مہینہ نہیں ہوا ہے کہ کانپور میں ہندوستان کا ایک بہادر سپاہی گنیش شنکر ودیارتھی مارا گیا۔ وہ اس وقت مارا گیا جب وہ دوسروں کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گنیش جی میرے بڑے پیارے دوست اور بڑے شریف اور مخلص رفیق کار تھے جن کے ساتھ مجھے کام کرنے کا فخر حاصل

ہوا ہے۔ پچھلے مہینے جب کانپور شہر پر ایک جنوں طاری ہوا۔ اور ہندوستانی ہندوستانیوں کا گلا کاٹنے لگے۔ تو گنیش جی اس گھمسان میں گھس پڑے۔ اپنے ہم وطنوں سے لڑنے کے لئے نہیں بلکہ انھیں موت کے چنگل سے بچانے کے لئے انھیں نے سینکڑوں کو بچایا۔ لیکن اپنے آپ کو وہ نہ بچا سکے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کی انھوں نے پرواہی نہ کی بغرض انہی لوگوں کے ہاتھوں سے جنھیں وہ بچانے نکلے تھے مارے گئے۔ کانپور بلکہ سارے صوبہ کے اُفق سے ایک جگمگاتا ہوا ستارا ٹوٹ گیا۔ اور ہم سب ایک عزیز اور دانشمند دوست سے محروم ہو گئے۔ لیکن ان کی موت کتنی شاندار تھی۔ جب کہ سکون اُن کی آنکھوں میں کھل رہا تھا۔ اور مجمع کے پاگل پن کے مقابلہ میں وہ ڈٹے ہوئے تھے۔ اس خطرے اور موت کی منجدھار میں بھی انھیں دوسروں ہی کا خیال تھا کہ کس طرح انھیں بچا لیں۔

انقلاب کے یہ تین مہینے! زمانہ کے سمندر میں صرف ایک قطرے اور قوم کی حیات میں محض ایک لمحہ کی مثال ہیں۔ ابھی تین ہفتہ ہوئے کہ میں سندھ ندی کی ترائی میں موہن جوڈارو کے کھنڈر دیکھنے گیا تھا افسوس کہ تم میرے ساتھ نہ تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک زبردست شہر زمین سے اُبھرتا چلا آرہا ہے۔ وہ شہر جس میں پختہ اینٹوں کے مکان ہیں۔ چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں اور جو پانچ ہزار برس پرانا بتایا جاتا ہے۔ میں نے وہ خوبصورت زیور اور برتن جو اس قدیم شہر سے برآمد ہوئے تھے دیکھے۔ مجھے تصور میں نظر آرہا تھا کہ مرد اور عورتیں خوش رنگ لباس پہنے گلیوں اور سڑکوں پر چل پھر رہی ہیں۔ بچے کھیلتے کودتے پھرتے ہیں (کیونکہ ان کا کام یہی ہے) بازار طرح طرح کے ساز و سامان سے آراستہ ہیں اور لوگ خرید

فروخت میں مصروف ہیں اور مندروں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔

ہندوستان ان پانچ ہزار برس سے برابر اپنی جگہ پر قائم ہے اگرچہ ہزاروں انقلاب آئے اور گذر گئے۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ ہماری یہ بوڑھی ماں جو اپنے سن اور قدامت کے باوجود اب بھی نوجوان اور حسین معلوم ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کی بے صبری پر، ان کی چھوٹی چھوٹی فکروں اور ان کی وقتی خوشی اور رنج پر کیسی مسکراتی ہوگی۔

(۲۱)

تفریح کے چند دن اور خیالی سفر

۲۶ مارچ ۱۹۳۲ء

اس بات کو چودہ مہینے گذر گئے ہیں کہ میں نے نینی جیل سے پچھلی تاریخ کے متعلق تمہیں خط لکھا تھا۔ اس کے تین مہینے بعد، بحر عرب سے دو مختصر خط اور لکھے۔ اس وقت ہم کرکویہ جہاز سے لنکا جارہے تھے جب میں تمہیں خط لکھ رہا تھا تو وسیع سمندر میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ میری آنکھیں اسے تکے جاتی تھیں اور کسی طرح سیر نہ ہوتی تھیں اس کے بعد ہم لنکا پہنچے۔ ایک مہینہ تک خوب جی کھول کر تفریح کی۔ اور اس کی کوشش کی کہ فکر و پریشانی پاس نہ پھٹکنے پائے۔ اس حسین جزیرہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہم خوب گھومے اور ہر ہر قدم پر اس کی انتہائی دلکشی اور قدرت کی عنایتیں اور اس کی نعمتوں کی فراوانی دیکھ دیکھ کر دنگ رہ گئے کینڈی۔ نوارا ایلیہ انورادھ پورہ اور اس کی قدیم عظمت کے آثار، غرض ان سب مقامات کا جن کی ہم نے سیر کی تصوّر کتنا خوشگوار معلوم ہوتا ہے لیکن ان سب سے بڑھ کر مجھے تو خطہ حارہ کا وہ خنک جنگل پسند ہے جو حیات سے معمور تھا اور جہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں آنکھیں تک رہی ہیں۔ پھر وہ چھالیہ کے خوشنما درخت نازک سیدھے اور سچے کھڑے اور وہ ناریل کے بے شمار درخت اور وہ سمندر کا ساحل جس کے کنارے کھجور کے درختوں کا حاشیہ تھا۔ جہاں سبزہ زار کا زمردیں رنگ، سمندر اور آسمان کے نیلے رنگ میں کھپ

جاتا تھا اور وہ سمندر کے پانی کی چمک دمک اور اس کا موجوں سے اٹھکیلیاں کرنا اور ہوا کا کھجور کی پتیوں میں سنسنانا۔

تم تو خطہ حارہ میں یہ پہلی مرتبہ گئی تھیں۔ اور میرے لئے بھی ایک مرتبہ کے مختصر قیام کے علاوہ جس کی یاد بھی اب ذہن سے فراموش ہو چکی ہے۔ یہ نیا تجربہ تھا۔ عموماً مجھے اس سے کچھ زیادہ دلبستگی نہیں ہوتی کیونکہ میں گرمی سے بہت گھبراتا ہوں۔ مجھے تو سمندر اور پہاڑ اور ان کے اوپر اونچا برف اور برف کے ٹیلے بہت بھاتے ہیں لیکن لنکا کے اس مختصر قیام میں بھی خطہ حارّہ کی دلکشی اور اس کے سحر آفرین اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اپنے دل میں یہ شوق لے کر آیا کہ ایک بار اسے پھر دیکھوں گا

لنکا میں ہماری تفریح کا یہ مہینہ دیکھتے دیکھتے گزر گیا اور ہم سمندر پار کر کے ہندوستان کے جنوبی کنارے پر پہنچ گئے۔ تمہیں کنیا کماری کی سیر تو یاد ہو گی جہاں لوگوں کے نزدیک کنیا دیوی براجمان ہے اور ملک کی حفاظت کر رہی ہے۔ مغرب والوں کو ہمارے نام بگاڑنے اور توڑنے مروڑنے کا بڑا ملکہ حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا نام بھی کیپ کامورن رکھدیا ہے۔ اس وقت ہم سچ مچ اپنی بھارت ماتا کے قدموں میں بیٹھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ بحر عرب اور خلیج بنگال کا پانی یہاں آکر ملتا ہے اور اس کے چرنوں کو دھوتا ہے۔ یہاں کیسا سکون چھایا ہوا تھا اس وقت میرا ذہن ہزاروں میل چل کر ہندوستان کے دوسرے سرے پر جا پہنچا۔ جہاں ہمالیہ کی چوٹیاں دائمی برف سے ڈھکی رہتی ہیں اور سکون کا راج ہوتا ہے لیکن ان دونوں سروں کے درمیان کتنے جھگڑے کتنی مصیبت اور کتنا افلاس پھیلا ہوا ہے!

غرض ہم راس کماری سے شمال کی طرف روانہ ہوئے اور ٹراونکور اور کوچین ہوتے ہوئے ملابار کی کھاڑیوں میں سے گذرے۔ یہ کھاڑیاں کیسی خوبصورت تھیں۔ دونوں طرف کے ساحلوں پر لمبے لمبے درخت کھڑے تھے اور ہماری کشتی چاندنی رات میں ان کے درمیان چلی جاتی تھی۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم خواب دیکھ رہے ہوں۔ پھر میسور اور حیدرآباد ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے اور وہاں سے الہ آباد آ گئے۔ یہ اب سے نو مہینے پہلے یعنی جون کا ذکر ہے۔

لیکن آج ہندوستان میں ساری سڑکیں، سیدھی یا پھیر کھا کر ایک ہی منزل کی طرف جاتی ہیں اور ہر سفر چاہے وہ خیالی ہو یا حقیقی جیل خانے پر ختم ہوتا ہے! چنانچہ اب میں پھر انھیں جانی پہچانی دیواروں کے پیچھے آ گیا اب مجھے سوچنے اور تمھیں خط لکھنے کی کافی فرصت ہے۔ چاہے میرے خط تمہارے پاس پہنچ نہ سکیں۔ لڑائی پھر چھڑ گئی ہے۔ اور ہمارے مرد عورتیں۔ لڑکے اور لڑکیاں آزادی کی جنگ کے لئے پھر نکل کھڑے ہوئے ہیں تاکہ اپنے ملک کو افلاس کی لعنت سے نجات دلائیں۔ لیکن آزادی کی دیوی کو منانا بڑا مشکل ہے۔ اس نے اپنے پجاریوں سے ہمیشہ انسانی قربانی کا مطالبہ کیا ہے اور اب بھی یہی مطالبہ کر رہی ہے۔

آج مجھے یہاں آئے تین مہینے ہو گئے ہیں یعنی میں ۲۶ ر دسمبر کو چھٹی مرتبہ گرفتار ہوا تھا۔ تم کہو گی کہ میں نے یہ خط بہت دیر میں لکھنے شروع کئے لیکن بات یہ ہے کہ جب حال کی فکریں انسان کو گھیرے ہوں تو ماضی کا خیال کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے جیل میں باہر کے واقعات سے آنکھیں بند کر کے مجھے سکون نصیب ہوتے ہوتے بھی کچھ دیر لگتی ہے۔

اب میں تمہیں باقاعدہ خط لکھا کروں گا لیکن اس دفعہ میں دوسری جیل میں ہوں اور یہ جگہ مجھے پسند نہیں ہے اس لئے میرے کام میں خلل واقع ہوتا ہے میرا افق اب پہلے سے بہت اونچا ہوگیا ہے۔ میرے سامنے جو احاطہ کی دیوار ہے وہ بلندی میں دیوار چین سے ضرور کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ غالباً یہ کوئی ۲۵ فٹ اونچی ہوگی اور سورج کو اسے پھلانگ کر ہمارے پاس پہنچتے پہنچتے روز صبح اب کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی دیر ہوجاتی ہے۔

ہمارا افق کچھ مدت کے لئے اونچا ہوجائے تو کیا پروا۔ لیکن اس وسیع نیلے سمندر اور پہاڑوں اور ریگستانوں اور اس خیالی سفر کا تصور سلامت رہے جو اب مشکل سے حقیقت معلوم ہوتا ہے اور جس کا لطف دس مہینے پہلے، تم نے، تمہاری اماں نے اور میں نے ساتھ ساتھ حاصل کیا تھا۔

(۲۲)

غذا کی فراہمی کے لئے انسان کی جدوجہد

۲۸ر مارچ ۱۹۳۲ء

آؤ۔ اب دنیا کی تاریخ کا سلسلہ پھر شروع کریں اور ماضی کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کریں ایک الجھاؤ جسے سلجھانا بہت مشکل ہے بلکہ اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنا بجائے خود دشوار ہے۔ عام طور پر ہم اس کے ایک چھوٹے سے حصّے کو لے کر اسی مطالعہ میں کھو جاتے ہیں اور اسے حد سے زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں۔ قریب قریب ہم میں سے ہر شخص کا یہ خیال ہے کہ ہمارے ملک کی تاریخ، خواہ وہ کسی دور کی کیوں نہ ہو دوسرے تمام ملکوں کی تاریخوں سے زیادہ شاندار اور زیادہ توجہ کی مستحق ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی اس لغزش سے تمہیں آگاہ کیا تھا اور اب پھر آگاہ کرتا ہوں۔ کیونکہ اس جال میں انسان بڑی آسانی سے پھنس جاتا ہے۔ سچ پوچھو تو اسی لغزش سے بچانے کے لئے میں نے تمہیں یہ خط لکھنے شروع کئے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں خود اس غلطی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ میں کیا کروں جب خود میری ہی تعلیم ناقص ہو اور مجھے تاریخ الٹی پڑھائی گئی ہو۔ میں نے جیل کی تنہائی میں کتابیں پڑھ پڑھ کر اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی اور شاید کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ لیکن میں اپنے دماغ سے ان افراد اور ان واقعات کی تصویریں کیسے مٹا سکتا ہوں جو لڑکپن اور

جوانی میں اس پر نقش ہوگئی تھیں ایک تو میری تاریخی نظر کم علمی کی وجہ سے یوں ہی محدود ہے اور پھر یہ تصویریں اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہیں، اس لئے میں جو کچھ لکھوں گا اس میں ضرور غلطیاں کروں گا یعنی بہت سے غیر اہم واقعات پر میں زور دوں گا اور بہت سی اہم باتوں کو چھوڑ جاؤں گا لیکن ان خطوں کا یہ مقصد نہیں کہ وہ تاریخ کی کتابوں کا کام دیں۔ میں تو انھیں بے تکلف گفتگو سمجھتا ہوں جو میرے اور تمہارے درمیان ہوتی۔ اگر ہزار میل کا فاصلہ اور بہت سی اونچی اونچی دیواریں بیچ میں حائل نہ ہوتیں۔

ان مشہور شخصوں کے حالات بھی جن سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں تمہیں بتانا ضروری ہیں کیونکہ وہ اکثر بہت دلچسپ ہوتے ہیں اور ان سے ان کے زمانہ کے حالات کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے لیکن تاریخ محض بڑے آدمیوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں وغیرہ کے کارناموں کا تذکرہ نہیں ہے۔ اگر تاریخ کے یہی معنی ہیں تو اسے اب اپنی دوکان اٹھا دینا چاہئے۔ کیونکہ اب بادشاہ اور شہنشاہ بھی دنیا کے پردے سے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان عورتوں اور مردوں کو جو درحقیقت بڑے ہیں اپنی عظمت کے اظہار کے لئے تخت اور تاج اور جواہرات اور القاب اور آداب کی ضرورت نہیں ہوتی ان کی تو صرف بادشاہوں اور رئیسوں کو ضرورت ہوتی ہے جن کے پاس اپنی بادشاہتوں اور ریاستوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور وہ اپنی اس بے مائگی کا پردہ ڈھانکنے کے لئے قیمتی پوشاکیں اور وردیاں پہن لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم سے بہت سے لوگ اس ظاہری ٹیپ

ٹاپ سے دھوکا کھا جاتے ہیں اور بقول شاعر کے یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ

"ہر شخص کو جس کے سر پر تاج ہو
دل کا بادشا سمجھ لیتے ہیں
حالانکہ وہ محض ملک کا بادشاہ ہوتا ہے"

اصل تاریخ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کے چند افراد کا تذکرہ کردے بلکہ ان لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہئے جن سے قوم بنتی ہے ؛ جو محنت کرتے ہیں، جن کی محنت سے زندگی کی ضروریات اور تعیشات مہیا ہوتی ہیں اور جن کا ہزاروں صورتوں سے ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل ہوتا ہے۔ انسان کی اگر ایسی تاریخ لکھی جائے تو وہ یقیناً دلچسپ ہوگی وہ گویا ایک داستان ہوگی جو اس جنگ کی جو انسان ابتدائے آفرینش سے اب تک فطرت اور عناصر، وحشی درندوں اور جنگلوں سے کرتا رہا ہے اور اس شدید تر جنگ کی جو اس نے اپنے بعض ہم جنسوں کے خلاف کی۔ یعنی ان لوگوں کے خلاف جو اسے دبانے اور اپنے نفع کی خاطر لوٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ داستان ہوگی اس جد وجہد کی جو انسان نے غذا کی فراہمی کے لئے کی۔ چونکہ زندہ رہنے کے لئے خوراک، مکان۔ اور سرد آب وہوا میں لباس کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے یہ چیزیں جن لوگوں کے اختیار میں تھیں وہ انسان پر حکومت کرنے لگے۔ ہمارے حاکموں اور آقاؤں کو اسی لئے ہم پر اختیار حاصل ہوا کہ زندگی کی چند ضروریات ان کے قبضہ میں تھیں اور اسی کی بدولت ان کو یہ طاقت مل گئی کہ وہ ہم کو بھوکوں مار مار کر غلام بنائے رکھیں۔ چنانچہ ہم آئے دن یہ عجیب منظر دیکھتے ہیں کہ مٹھی بھر آدمی بڑی بڑی قوموں کو لوٹ رہے ہیں۔ بہت سے

لوگ بغیر محنت کے کما رہے ہیں اور محنت کرنے والے بے شمار انسان بھوکوں مر رہے ہیں۔

اس وحشی آدمی نے جو جنگلوں میں شکار کھیلا کرتا تھا رفتہ رفتہ ایک خاندان بنا لیا۔ اب سارا گھر مل جل کر ایک دوسرے کے فائدے کے لئے کام کرنے لگا۔ پھر بہت سے خاندان مل کر ایک گاؤں بن گیا۔ اس کے بعد مختلف گاؤوں کے مزدوروں۔ تاجروں اور صناعوں نے مل کر پیشہ وروں کی جماعتیں بنا لیں۔ شروع شروع میں صرف ایک فرد تھا۔ یعنی وہی جنگل میں شکار کھیلنے والا وحشی۔ اس وقت کوئی سماج نہ تھی۔ پھر خاندان بنا۔ پھر گاؤں اور آخر میں گاؤوں سے سماج بنی۔ یہ سماج کیوں بنی؟ دراصل روزی کی جدوجہد نے اشتراک عمل اور ارتقا پر انسان کو مجبور کیا۔ مشترکہ دشمن کی مدافعت کرنے یا اس پر حملہ کرنے کے لئے تنہا لڑنے کے مقابلہ میں متحد ہو کر لڑنا زیادہ مؤثر تھا۔ اس سے زیادہ کام کرنے میں اشتراک عمل کی ضرورت تھی کیونکہ تنہا محنت کرنے کے مقابلہ میں ایک ساتھ کام کر کے زیادہ خوراک اور زیادہ ضروریات زندگی مہیا ہو سکتی تھیں۔ اس کام میں اتحاد عمل کے معنی یہ تھے کہ معاشی اکائی کا دائرہ اس وحشی فرد سے جو جنگلوں میں تنہا شکار کھیلتا تھا بڑھ کر ایک پورے گروہ پر مشتمل ہو گیا۔ روزی کے لئے انسان کی جدوجہد اس معاشی اکائی کے دائرہ کو برابر بڑھاتی رہی اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ معاشرتی اکائی یعنی سماج کا دائرہ بڑھتا رہا۔ تاریخ کے شروع سے لے کر آخر تک ہم دیکھتے ہیں کہ گو انسان ہمیشہ لڑائیوں اور مصیبتوں میں گرفتار رہا اور کبھی اسے آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر بھی ارتقا کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اس ارتقا سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا کچھ بہت

ترقی کر گئی یا پہلے کے مقابلہ میں اب زیادہ خوش حال ہے، ممکن ہے پہلے سے کچھ بہتر ہو لیکن تکمیل سے ابھی بہت دور ہے اور ہر جگہ کافی مصیبت و افلاس نظر آتا ہے۔

جیسے جیسے یہ اقتصادی اور سماجی اکائی بڑھتی گئی زندگی زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی۔ تجارت کو فروغ ہوا اور لوگ ایک دوسرے کو تحفہ دینے کی بجائے اشیا کا مبادلہ کرنے لگے۔ پھر زر کا رواج ہوا جس سے تمام کاروبار میں ایک انقلاب ہو گیا۔ چونکہ سونے یا چاندی کے سکوں کے ذریعہ قیمت ادا کرنے سے تبادلہ میں بڑی سہولت ہو گئی تھی اس لئے فوراً تجارت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اس کے بعد سکے بھی ضروری نہ رہے۔ لوگ محض اشارے استعمال کرنے لگے یعنی کاغذ کا صرف ایک ٹکڑا جس پر ادا کرنے کا وعدہ درج ہوتا تھا کافی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح بنک کے نوٹ اور چیک ظہور میں آئے۔ اس کے معنی ہیں ساکھ پر کاروبار کرنا۔ ساکھ سے تجارت میں بہت مدد ملتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ آج کل بنک کے نوٹ اور چیک بہت زیادہ استعمال میں آتے ہیں۔ کیونکہ سمجھدار آدمی سونے چاندی کے تھیلے ساتھ ساتھ لئے نہیں پھرتے۔

غرض تاریخ جس وقت ماضی کے دھندلکے سے نکلتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مختلف پیشے اور کاروبار اختیار کرتے ہیں آپس میں اشیا کا مبادلہ کرتے ہیں اور اس طرح تجارت کو بہت فروغ دیتے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ نئے نئے اور بہتر سے بہتر آمد و رفت کے ذرائع پیدا ہوتے ہیں۔ اس ترقی کی رفتار گذشتہ سو برس میں جب سے اسٹیم انجن چلا ہے زیادہ تیز ہوئی ہے۔ پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دنیا میں دولت کا اضافہ ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ کم سے کم کچھ لوگوں کو فرصت و فراغت نصیب ہوئی۔ اسی کو کہتے ہیں کہ تہذیب نے ترقی کی۔

یہ سب کچھ ہوا اور لوگ اپنے روشن خیال اور ترقی یافتہ زمانہ پر۔ موجودہ تہذیب کے کرشموں پر اور زبردست تمدن اور سائنس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ لیکن غریب آج بھی غریب اور مصیبت زدہ ہیں۔ بڑی بڑی قومیں آج بھی ایک دوسرے سے لڑتی ہیں اور لاکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں اور بڑے بڑے ملکوں پر ہمارے ملک کی طرح آج بھی غیروں کی حکومت ہے۔ پھر یہ تہذیب ہمارے کس کام کی اگر ہمیں خود اپنے گھر میں آزادی حاصل نہ ہو مگر شکر ہے کہ اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہم نے جدوجہد شروع کر دی ہے۔

ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ ایسے طوفانی زمانہ میں پیدا ہوئے جب کہ ہمیں اس کا موقع ملا کہ اس زبردست مہم میں کوئی حصہ لے سکیں اور اپنی آنکھوں سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں انقلاب ہوتے ہوئے دیکھیں تم بڑی خوش قسمت لڑکی ہو۔ کیونکہ ٹھیک اس مہینے اور اس سال میں پیدا ہوئیں جب کہ زبردست انقلاب نے روس میں ایک نئے دور کا آغاز کیا اور اب تم اپنے ملک میں بھی انقلاب ہوتے ہوئے دیکھو گی اور بہت جلد خود اس میں حصہ لو گی۔ اس وقت ساری دنیا مصیبت کا شکار ہو رہی ہے اور ہر جگہ انقلاب کا دور دورہ ہے۔ مشرق بعید میں جاپان چین کا گلا گھونٹنے پر تلا ہوا ہے اور مغرب میں کیا ساری دنیا میں پرانا نظام ڈانواں ڈول ہو رہا ہے اور قریب ہے کہ تباہ ہو جائے۔ اکثر ملک سامان جنگ میں کمی کرنے کے متعلق بڑھ بڑھ کے

باتیں بناتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے جاتے ہیں اور خود سر سے پیر تک مسلح رہتے ہیں۔ دراصل یہ سرمایہ داری کی صبح کا ذب تھی جو اتنے عرصہ تک ساری دنیا پر اپنا سکہ جمائے رہی اور اپنے خاتمے کے وقت جو ایک دن ہو کر رہے گا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی برائیوں کو بہالے جائے گی۔

(۲۳)

جائزہ

۲۹ر مارچ ۳۲ء

ہم نے زمانہ کی سیر کہاں تک کرلی اور اس سفر میں کس جگہ تک پہنچے؟ یونان۔ ہندوستان۔ چین اور ناسس کے پرانے زمانے کا تھوڑا بہت تذکرہ تو ہم کر چکے ہیں۔ ہم نے مصر کی اس قدیم اور حیرت انگیز تہذیب کو بھی جس نے اہرام مصر کو جنم دیا رفتہ رفتہ برباد ہوتے دیکھ لیا حتیٰ کہ اس کا محض سایہ باقی رہ گیا جس میں کچھ شکلیں اور نشانات تو نظر آتے تھے لیکن ان میں کوئی جان نہ تھی۔ پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یونان کی ایک پڑوسی قوم نے کس طرح ناسس کو تباہ کر ڈالا۔ ہندوستان اور چین میں ہم نے تہذیب کی ابتدار بہت دور دھندلی سی دیکھی۔ چونکہ ہمارے پاس اس زمانہ کا حال معلوم کرنے کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ اس لئے ہم کچھ زیادہ تو جان نہ سکے لیکن اتنا ضرور محسوس کیا کہ اُس وقت بھی یہ اعلیٰ تہذیب سے مالا مال تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ چیز دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ دونوں ملک اپنے ماضی سے جسے ہزاروں برس گذر چکے ہیں۔ تمدنی حیثیت سے اب تک کتنے وابستہ ہیں میسوپوٹامیا میں ہم نے یہ تماشا دیکھا کہ سلطنتوں پر سلطنتیں ذراسی دیر کے لئے آتی تھیں اپنی شان و شوکت کی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھیں ہم نے اُن بڑے بڑے مفکرین کا بھی کچھ تذکرہ کیا جو حضرت عیسیٰ

پانچسو برس پہلے مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے۔ یعنی ہندستان کے بودھ اور مہابیر کا، چین کے کانفیوکس اور لاوسی کا، ایران کے زرتشت کا اور یونان کے فیثاغورس کا، ہم نے دیکھا کہ کس طرح بودھ نے پروہتوں اور پنڈتوں پر اور قدیم ویدک دھرم کی بگڑی ہوئی صورتوں پر حملہ کیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ طرح طرح کے توہمات اور پوجا پاٹ کی رسموں کے ذریعہ عوام کو لوٹا جاتا ہے اور انھیں دھوکا دیا جاتا ہے۔ انھوں نے ذات پات کی پھر مخالفت کی اور مساوات کا سبق سکھایا۔

اس کے بعد ہم مغرب کی طرف نکل گئے جہاں ایشیا اور یورپ ملتے ہیں اور یونان اور ایران کو قسمت آزمائی کرتے دیکھا۔ یعنی کس طرح ایران میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی اور شہنشاہ دارا نے اسے ہندوستان میں سندھ ندی تک وسعت دے دی۔ پھر اس سلطنت نے چھوٹے سے ایران کو نگل لینا چاہا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوگئی کہ کس طرح اس حقیر سے ملک نے اس کی عظمت کو ٹھکرا دیا اور اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ اس کے بعد یونانی تاریخ کا بہت مختصر لیکن نہایت شاندار دور آیا جس میں بڑے بڑے قابل اور اہل کمال پیدا ہوئے جنھوں نے حسین ترین آرٹ اور بہترین علم و ادب کے نمونے پیش کیے۔

یونان کا یہ زرین دور زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ مقدونیہ کے بادشاہ سکندر نے اپنی فتوحات سے یونان کی شہرت کا ڈنکا دور دور بجا دیا۔ لیکن اسی زمانہ میں یونان کی اعلیٰ تہذیب کا تنزل بھی شروع ہوگیا۔ سکندر نے ایرانی سلطنت کو تباہ کر ڈالا اور فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں بھی داخل ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سکندر بہت

زبردست سپہ سالار تھا لیکن اس کے نام کے ساتھ اتنے فسانے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے اسے ایسی شہرت حاصل ہو گئی ہے جس کا وہ ہرگز مستحق نہیں ہے۔ سقراط، افلاطون، Phidias-، Sophocles- اور یونان کے دوسرے اہل کمال کا نام تو صرف پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں لیکن ایسا کون ہے جس نے سکندر کا نام نہ سُنا ہو۔

سکندر نے کوئی ایسا تیر نہیں مارا۔ ایرانی سلطنت خود کمزور اور ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ اور زیادہ عرصہ تک اس کے چلنے کی یوں بھی امید نہ تھی۔ ہندوستان پر سکندر کے حملہ کی جسے ہلّہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کوئی اہمیت نہیں ہے ممکن ہے کہ اگر سکندر کی زندگی وفا کرتی تو وہ کوئی معقول کام بھی کر سکتا۔ لیکن وہ عین جوانی میں چل بسا اور اس کی سلطنت فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ سکندر کی سلطنت تو نہیں رہی لیکن اس کا نام رہ گیا۔

مشرق کی طرف سکندر کی پیش قدمی کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک نیا تعلق پیدا ہو گیا۔ بہت سے یونانی مشرق کی طرف آئے اور قدیم شہروں ہی میں یا علیحدہ اپنی نوآبادیاں بنا کر یہاں آباد ہو گئے۔ یوں تو سکندر سے پہلے بھی مشرق اور مغرب کے درمیان ایک تعلق اور تجارت کا سلسلہ قائم تھا۔ لیکن اس کے بعد اس میں بہت اضافہ ہو گیا۔

سکندر کے حملہ کا ایک اور اثر بتایا جاتا ہے اگر یہ اثر واقعی ہوا تھا تو یونانیوں کی بڑی بدنصیبی کا باعث ہوا ہوگا کہا جاتا ہے کہ سکندر کے سپاہی

اپنے ساتھ عراق کی دلدلوں سے ملیریا کے جراثیم لائے۔ جس سے تمام یونان میں ملیریا پھیل گیا اور یونانی قوم کمزور اور ناکارہ ہو گئی۔ یونانیوں کے تنزل کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ محض ایک خیال ہے اور کون جانتا ہے کہ اس میں کتنی حقیقت ہے۔

سکندر کی چند روزہ سلطنت ختم ہو گئی لیکن اس کی جگہ بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک تو بطلیموس کے زیر نگین مصری سلطنت تھی اور دوسری سلیوکس کے ماتحت مغربی ایشیا کی سلطنت۔ بطلیموس اور سلیوکس دونوں سکندر کی فوج میں سردار تھے سلیوکس نے ہندوستان پر ہاتھ صاف کرنا چاہا لیکن یہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا کہ ہندوستان ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا ہے۔ اور اپنے دشمنوں کے دانت کھٹے کر سکتا ہے۔ یہاں تمام شمالی اور وسطی ہند میں چندر گپت موریہ نے نہایت مستحکم سلطنت قائم کر لی تھی۔ چندر گپت اور اس کے مشہور برہمن وزیر چانک اور چانک کی لکھی ہوئی کتاب ارتھ شاستر کا میں نے اپنے خطوں میں ذکر کیا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس کتاب سے ہندوستان کے ڈھائی ہزار برس کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

ہم اپنا جائزہ ختم کر چکے اور اگلے خط سے موریہ سلطنت اور اشوک کا قصہ شروع کریں گے۔ سچ پوچھو تو اب سے چودہ مہینے پہلے یعنی ۲۵ ر جنوری ۱۹۳۱ء کو نینی جیل میں میں نے یہ وعدہ کیا تھا جو ابھی تک ایفا نہ ہو سکا۔ خیر اب پورا کر دوں گا۔

(۲۴)

دیوتاؤں کا محبوب اشوک

۳۰ مارچ ۱۹۳۲ء

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں بادشاہوں اور شہزادوں کی مذمت بہت کیا کرتا ہوں۔ میں کیا کروں۔ اس قسم کے لوگوں میں مجھے کوئی قابل قدر قابل احترام بات نظر نہیں آتی۔ لیکن میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ کروں گا جو شہنشاہ ہونے کے باوجود بڑا قابل قدر تھا۔ وہ چندر گپتا موریہ کا پوتا اشوک تھا۔ ایچ۔ جی ویلز جن کے بعض ناول تم نے پڑھے ہوں گے۔ ایک کتاب "تاریخ کا خاکہ" بھی لکھی ہے۔ اس میں وہ اشوک کے متعلق لکھتے ہیں "ہزاروں لاکھوں بادشاہوں میں جنھیں جہاں پناہ۔ ان داتا۔ اعلیٰ حضرت اور خدا جانے کن کن القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کے ناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اشوک کا نام اس طرح چمکتا ہے جیسے آسمان پر تنہا ایک ستارہ چمکتا ہو۔ والگا ندی سے لے کر جاپان تک اس کا نام اب بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ چین۔ تبت اور ہندوستان میں بھی (جو اگرچہ اس کے مذہب کو ترک کر چکا ہے) اس عظمت کی روایات اب تک محفوظ ہیں قسطنطین اور Charlemegue شارلیمین کے نام تو بہت کم لوگوں نے سنے ہوں گے۔ لیکن اشوک کی یاد آج بھی ان سے کہیں زیادہ لوگوں میں باقی ہے۔"

یہ بہت بڑی تعریف ہے۔ لیکن وہ واقعی اس کا مستحق تھا۔

اور ہندوستان کو تو اپنی تاریخ کا وہ زمانہ یاد کرکے خاص مسرت ہوتی ہے۔
چندرگپت نے عیسوی سنہ شروع ہونے سے کوئی تین سو برس پہلے انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ہندوسار گدی پر بیٹھا اور اس نے پچیس برس حکومت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ میں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔ اس نے بھی یونانیوں سے تعلق قائم رکھا۔ اور اس کے دربار میں بھی مصر کے بطلیموس اور مغربی ایشیا کے سلیوکس کے بیٹے انٹی اوکس (Antiochus) کے سفیر آتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی دوسرے ملکوں سے تجارت جاری تھی۔ چنانچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مصری اپنے کپڑے ہندوستانی نیل سے رنگتے تھے اور اپنی ممیوں کو ہندوستانی ململ میں لپیٹ کر رکھتے تھے۔ بہار میں چند ایسے آثار بھی ملے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موریہ سلطنت سے بہت پہلے وہاں ایک قسم کا شیشہ بھی بنتا تھا۔
تمہیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ یونانی سفیر میگس تھنیس نے جو چندر گپت کے دربار میں آیا تھا۔ ہندوستانیوں کے ذوق جمال کی بہت تعریف کی ہے اور خاص طور پر یہ بھی لکھا ہے کہ لوگ اپنے قد کو بلند کرنے کے لئے جوتے پہنتے تھے۔ گویا آج کل کی اونچی ایڑی کوئی نئی ایجاد نہیں ہے۔
۲۶۸ء قبل مسیح میں ہندوسار کے بعد اشوک اس عظیم الشان سلطنت کا مالک ہوا جس میں تمام شمالی اور وسطی ہندشامل تھا اور وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے راج کے نویں سال میں کالنگ پر حملہ کیا تاکہ ہندوستان کے جنوبی اور جنوب مشرقی حصے بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ کالنگ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر مہاندی گوداوری اور کرشنا ندیوں کے بیچ میں واقع تھا۔ کالنگ والوں

نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن آخرکار زبردست کشت وخون کے بعد انھیں زیر کر لیا گیا۔ اشوک اس جنگ اور کشت وخون سے بہت متاثر ہوا وہ جنگ اور اس کے لوازمات سے بے انتہا متنفر ہو گیا اور اس کے بعد اس نے کوئی جنگ نہیں کی۔ جنوب کے ایک چھوٹے سے علاقہ کے علاوہ سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں تھا اور اس کے لئے نہایت آسان تھا کہ وہ اسے بھی فتح کر لیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز لکھتا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں فوج کشی کرنے والے بادشاہوں میں یہ پہلی مثال ہے جس نے فتح حاصل کرنے کے بعد جنگ سے توبہ کر لی۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خود اشوک کے الفاظ میں ہمارے پاس اس کی شہادت موجود ہے کہ اس کے خیالات اور اس کا عمل کیا تھا۔ اُن بے شمار فرمانوں کی شکل میں جو اس نے پتھر کی چٹانوں یا دھات کے ستونوں پر کندہ کرائے تھے آج بھی ہمارے سامنے اس کے وہ پیغامات موجود ہیں جو اس نے اپنی رعایا اور اپنی اولاد کے نام جاری کئے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ الہ آباد کے قلعہ میں اشوک کی ایک لاٹ ہے۔ اسی طرح کی لاٹیں ہمارے صوبے میں بہت سی ہیں۔

ان فرمانوں میں اشوک نے اس کشت وخون سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے جو جنگ اور فتح کا لازمی نتیجہ ہے وہ کہتا ہے کہ دھرم کے ذریعہ اپنے نفس کو اور لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا اصلی فتح ہے۔ بہتر ہے کہ میں یہاں اس کے فرمانوں کے چند اقتباس درج کر دوں۔ کیونکہ انھیں پڑھ کر دل پر بڑا اثر ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ سے تم اشوک کو زیادہ اچھی طرح پہچان سکو گی۔

ایک فرمان میں درج ہے "جب مہاراج کو گدی پر بیٹھے بیٹھے آٹھ سال ہو گئے تو انھوں نے کالنگ کو فتح کیا۔ اس مہم میں ۱½ لاکھ آدمی قید ہوئے ایک لاکھ ہلاک ہوئے اور اس سے کہیں زیادہ اپنی موت مرے۔ کالنگ کی فتح کے بعد ہی جب مہاراج کو دھرم کی لگن لگی اور اس کے تحفظ اور اشاعت کا جوش پیدا ہوا تو وہ اس فتح پر بہت پچھتائے کیونکہ ہر نئے ملک کے فتح کرنے میں بڑا کشت و خون ہوتا ہے۔ اور بہت لوگ قید کئے جاتے ہیں اس لئے مہاراج کو اس کا دلی صدمہ اور رنج ہے"

اس کے بعد اس فرمان میں درج ہے کہ اب مہاراج ہرگز یہ گوارا نہ کریں گے کہ کالنگہ میں جتنے آدمی ہلاک ہوئے یا قید کئے گئے اس کی ہزارویں تعداد بھی آئندہ قتل یا قید کی جائے۔

علاوہ ازیں اگر مہاراج کے ساتھ کوئی شخص برائی بھی کرے گا تو جہاں تک ممکن ہوگا وہ اس سے درگذر کریں گے۔ اپنے راج کے جنگلی آدمیوں پر بھی مہاراج کی عنایت کی نظر ہے اور مہاراج کوشش کرتے ہیں کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ گنہگار ہوں گے۔ مہاراج کی یہ دلی تمنا ہے کہ تمام جاندار وں کو تحفظ۔ ضبط نفس سلامتی اور مسرت نصیب ہو"

اشوک نے اس کے بعد لکھا ہے کہ دھرم کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرنا حقیقی فتح ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اُسے نہ صرف اپنی سلطنت میں بلکہ دور دور کے ملکوں میں اسی قسم کی حقیقی فتح حاصل ہوئی۔

ان فرمانوں میں جس دھرم کا بار بار ذکر آیا ہے وہ بودھ دھرم ہے۔ اشوک بودھ دھرم کا بہت جوشیلا پیرو ہو گیا تھا اور

اس نے اس کی تبلیغ و اشاعت کی انتہائی کوشش کی ۔ لیکن اس نے کسی پر جبر نہیں کیا بلکہ لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر کے انھیں اپنے مذہب میں داخل کیا ۔ ساری دنیا کے مذہبی آدمیوں میں سے شاید کسی نے اتنی رواداری برتی ہو جتنی اشوک نے برتی ۔ بخلاف اس کے انھوں نے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لئے شاید ہی کبھی جبر دھمکی اور دھوکہ سے پرہیز کیا ہو ۔ دنیا کی تاریخ مذہبی مظالم اور لڑائیوں سے بھری پڑی ہے اور مذہب اور خدا کے نام پر جتنا خون بہایا گیا ہے شاید ہی کسی اور نام پر بہایا گیا ہو ۔ ایسی صورت میں یہ چیز یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہندوستان کے ایک مایۂ ناز سپوت نے جو سخت مذہبی آدمی بھی تھا اور ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک بھی ، مذہب کی اشاعت کے معاملہ میں کیا رویہ اختیار کیا ۔ یہ خیال کرنا کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ کوئی مذہب یا عقیدہ لوگوں سے زبردستی تلوار کے زور سے منوایا جا سکتا ہے ۔

غرض دیوتاؤں کے محبوب اشوک نے جسے فرمانوں میں " دیو نام پریہ " کے لقب سے خطاب کیا گیا ہے ، ایشیا ، یورپ اور افریقہ کے مغربی ملکوں میں اپنے سفیر اور پیامبر بھیجے تمہیں خیال ہوگا کہ لنکا میں اس نے خود اپنے بھائی مہندرا اور اپنی بہن سنگھامتر کو بھیجا تھا ۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ گیا کے مقدس پیپل کی ایک شاخ بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے ۔ انورادھا پورے کے مندر میں ہم نے جو پیپل دیکھا تھا وہ تمہیں یاد ہوگا ۔ وہاں لوگوں نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ یہ درخت اسی شاخ سے اُگا ہے ۔

ہندوستان میں بودھ مذہب بڑی تیزی سے پھیلا چونکہ اشوک

کے نزدیک مذہب چند منتروں کے دہرا لینے یا محض پوجا پاٹ کر لینے کا نام نہیں بلکہ نیک کام کرنے اور سماج کی بہبودی کی کوشش کرنے کا نام تھا اس لئے سارے ملک میں باغ۔ اور اسپتال۔ اور کنوئیں اور سڑکیں بن گئیں۔ عورتوں کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا۔ چار شہروں میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ ایک تو شمال میں پشاور کے نزدیک ٹکسلا میں۔ دوسری متھرا میں تیسری وسطی ہند میں اُجین میں۔ اور چوتھی بہار میں پٹنہ کے قریب نالندہ میں۔ ان میں نہ صرف ہندوستان کے بلکہ چین سے لے کر مغربی ایشیا تک کے دور دور کے طالب علم پڑھنے آتے تھے اور بودھ کا پیغام لے کر اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔ تمام ملک میں بڑی بڑی خانقاہیں کھل گئیں جنھیں ویہار کہتے تھے پاٹلی پتر یعنی پٹنہ کے قرب وجوار میں ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سارے صوبے کو ویہار کہنے لگے۔ ہوتے ہوتے اب وہ بہار ہو گیا۔ عام طور پر جیسا دیکھا گیا ہے۔ ان خانقاہوں میں سے بھی رفتہ رفتہ تعلیم کی اصلی روح فنا ہو گئی اور محض پوجا پاٹ کی جگہ بن کر رہ گئیں۔

اشوک کو جان بچانے میں جو شغف تھا وہ انسانوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ وہ جانوروں کو مارنا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ اس نے خاص طور جانوروں کے لئے اسپتال کھلوائے تھے۔ اور قربانی کی بالکل مخالفت کر دی تھی ان دونوں باتوں میں وہ موجودہ زمانے سے بھی آگے تھا۔ کیونکہ جانوروں کی قربانی اب کسی نہ کسی حد تک جاری ہے اور مذہب کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی ہے، اور جانوروں کے علاج معالجہ کا بھی بہت معمولی انتظام ہے۔

اشوک کی مثال اور بودھ دھرم کی اشاعت کا یہ نتیجہ ہوا کہ گوشت کے بجائے سبزیاں کھانے کا رواج ہو گیا اس وقت برہمن اور چھتری گوشت کھاتے تھے اور شراب بھی پیتے تھے۔ اس کے بعد گوشت خوری اور شراب نوشی دونوں بہت کم ہو گئیں۔

غرض اشوک نے ۲۸ برس تک حکومت کی اس عرصہ میں اس نے نہایت سکون کے ساتھ عوام کی فلاح و بہبود کی انتہائی کوشش کی رعایا کے کام کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ "ہر وقت اور ہر جگہ چاہے میں کھانا کھاتا ہوں یا زنانے میں ہوں، اپنی خوابگاہ میں ہوں یا بیت الخلا میں۔ رتھ میں کہیں جا رہا ہوں یا شاہی باغ میں مصروف گلگشت ہوں۔ سرکاری پرچہ نویسوں کو چاہیئے کہ رعایا کے حالات سے مجھے برابر مطلع کرتے رہیں"۔ اگر کہیں مشکل پیش آتی تو فوراً اسے خبر کی جاتی کیونکہ اس کا مقولہ تھا کہ "ہر جگہ اور ہر لمحہ مجھے رعایا کی خدمت کرتے رہنا چاہیئے"۔

اشوک نے ۲۲۶ء قبل مسیح میں انتقال کیا انتقال سے کچھ دن پہلے اس نے سنیاس لے لیا تھا اور بودھ بھکشو بن گیا تھا۔

موریہ دور کے صرف چند آثار باقی رہ گئے ہیں لیکن جو کچھ بھی ملتے ہیں وہ موہن جو دارو کے آثار سے قطع نظر فی الحال ہندوستان میں آریہ تہذیب کے سب سے پرانے آثار ہیں۔ بنارس کے نزدیک سارناتھ میں بھی اشوک کی ایک خوبصورت لاٹ موجود ہے جس پر شیر بیٹھا ہوا ہے۔

اشوک کی راجدھانی شہر پاٹلی پتر کی پرانی شان و شوکت کا اب کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے اب تو کیا، آج سے پندرہ سو برس پہلے یعنی

اشوک کے صرف چھ سو برس بعد ہی، ایک چینی سیاح فاہیان وہاں گیا تھا وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ شہر خوب آباد تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی اور خوشحالی کا دور دورہ تھا لیکن اس وقت بھی اشوک کا پتھر کا محل ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا ان بچے کھچے آثار ہی کو دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ یہ انسان کے ہاتھ کا کام تو معلوم نہیں ہوتا۔

پتھر کے اس سر بفلک محل کا آج کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ لیکن اشوک کا نام سارے ایشیا میں باقی ہے اور اس کے فرمان اب بھی ہم سے اس زبان میں باتیں کرتے ہیں جو ہم سمجھ سکتے ہیں اور ان کی قدر کرتے ہیں سچ پوچھو تو ہم اب بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

یہ خط بہت لمبا ہو گیا۔ ممکن ہے تم پڑھتے پڑھتے اکتا جاؤ۔ اس لئے میں اسے اشوک کا ایک چھوٹا سا فرمان نقل کر کے ختم کرتا ہوں:۔

کل مذاہب کسی نہ کسی پہلو سے اس کے مستحق ہیں کہ انسان ان کا احترام کرے۔ اس طرح انسان خود اپنے مذہب کی عزت کو بھی بڑھاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ دوسروں کے مذہب کا بھی کچھ حق ادا کرتا ہے۔

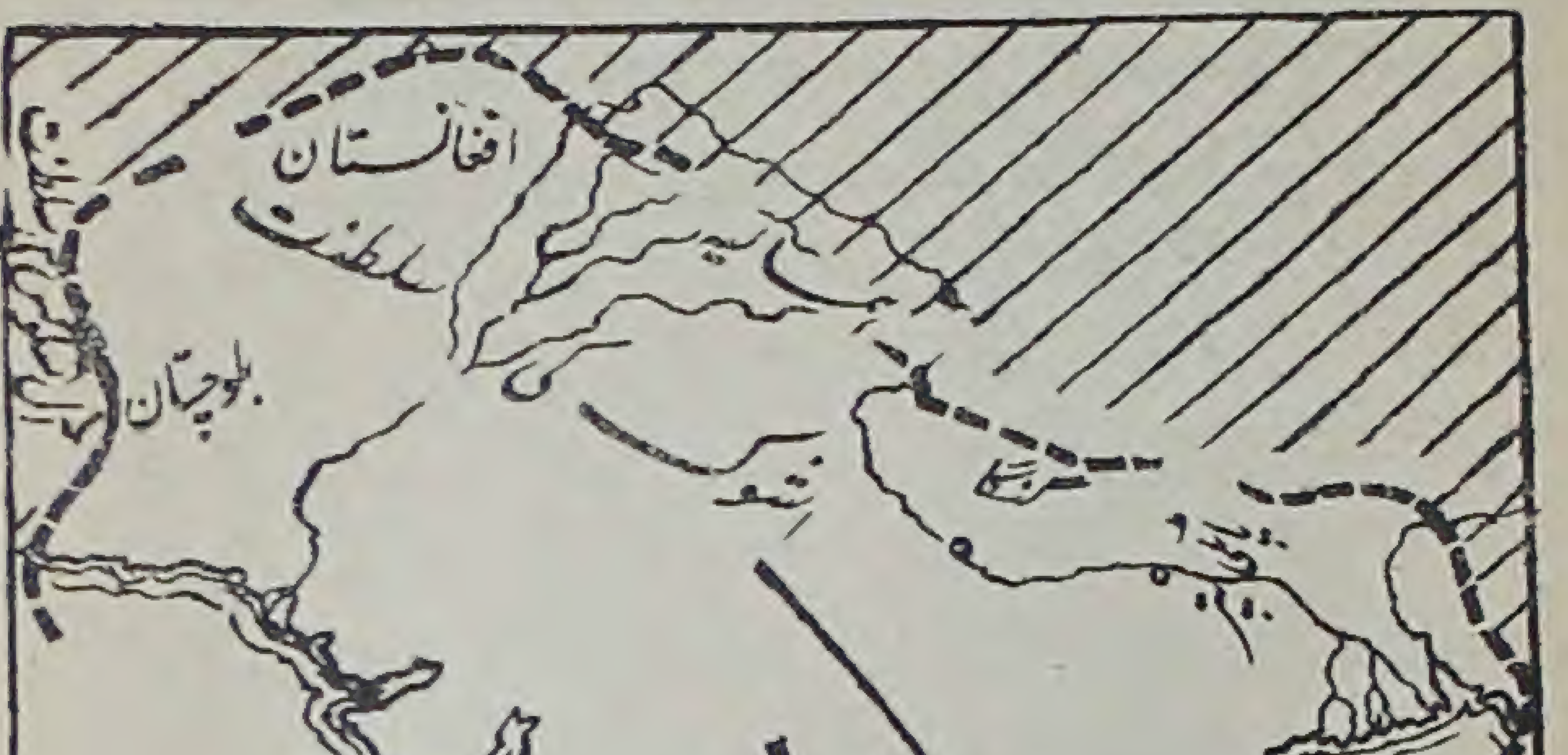
(۴۵)

اشوک کے زمانے میں دنیا کی حالت

۳۱ مارچ ۳۲ء

ہم نے دیکھا کہ اشوک نے دور دور کے ملکوں میں اپنے سفیر اور تبلیغی مشن بھیجے اور ہندوستان اور ان ملکوں کے درمیان برابر ایک رابطہ اور تجارت کا سلسلہ قائم تھا اس زمانہ میں مختلف ملکوں کے درمیان آمدورفت اور تجارت کی یہ صورت نہ تھی جو اس وقت ہے۔ اب تو یہ بہت آسان ہو گیا ہے کہ ریل۔ جہاز اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں۔ اور تجارت کا سامان بھیج سکیں۔ لیکن پرانے زمانے میں ہر سفر بہت طویل اور خطرناک ہوتا تھا۔ اور صرف جفاکش اور جان جوکھم برداشت کرنے والے لوگ اس کی ہمت کیا کرتے تھے اس زمانہ کی تجارت کا آج کل کی تجارت سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

اشوک نے جن "دور دراز ملکوں" کا حوالہ دیا ہے وہ کون سے ملک تھے؟ اور اس زمانہ میں دنیا کی کیا حالت تھی؟ مصر اور بحر روم کے ساحل کے علاوہ براعظم افریقہ کا ہمیں کچھ حال معلوم نہیں اسی طرح شمالی۔ وسطی اور مشرقی یورپ اور شمالی اور وسطی ایشیا کا بھی کچھ یونہی سا حال معلوم ہے۔ امریکہ کے بارے میں بھی ہم کچھ نہیں جانتے۔ تاہم بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ امریکہ کے دونوں براعظموں میں پرانے زمانے ہی میں اعلیٰ تہذیب موجود تھی۔ کولمبس نے تو امریکہ


افغانستان
بلوچستان
گوداوری
اشوک
۲۶۸ - ۲۲۶ ق-م

کو بہت بعد میں یعنی سنہ ۱۵۰۰ء میں دریافت کیا. ہمیں علم ہے کہ اس زمانہ میں جنوبی امریکہ میں پیرو اور اس کے آس پاس کے ملک اچھے خاصے تہذیب یافتہ تھے اس لئے یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں جب ہندوستان میں اشوک کا عروج تھا۔ امریکہ میں بھی مہذب اور متمدن لوگ آباد ہوں اور ان کی سماج بھی نہایت منظم ہو. لیکن ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس لئے محض قیاس سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔ البتہ اس کا اظہار میں نے محض اس لئے کر دیا کہ ہم اس دھوکے میں نہ رہیں کہ مہذب لوگ دنیا کے صرف انہی حصّوں میں رہتے تھے جن کا ہمیں علم ہے. یورپ والوں کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ قدیم تاریخ سے صرف یونان۔ روم اور یہودیوں کی تاریخ مراد ہے۔ ان کے نزدیک باقی ساری دنیا ویران پڑی تھی۔ بعد کو جب خود ان کے علمار اور ماہرین آثار قدیمہ نے انھیں چین۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کا حال بتایا تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کا علم کتنا محدود تھا. اس لئے ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ہمارا محدود علم ساری دنیا کے واقعات پر حاوی ہے

خیر فی الحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشوک کے زمانے کی مہذب دنیا میں خاص طور پر یورپ اور افریقہ کے وہ ملک جو بحر روم کے ساحل پر واقع تھے۔ اور مغربی ایشیار۔ چین اور ہندوستان شامل تھے۔ چین مغربی ممالک بلکہ مغربی ایشیار سے بھی کم و بیش بالکل الگ تھلگ تھا اور مغرب والوں میں اس کے متعلق عجب عجب لغو قصے مشہور تھے غرض چین اور مغربی ملکوں میں ہندوستان درمیانی کڑی تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سکندر کی موت کے بعد اس کی سلطنت سرداروں نے آپس میں تقسیم کرلی تھی۔ ان میں سے تین حصّے خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۱) سلیوکس کے ماتحت مغربی ایشیا۔ ایران اور عراق (۲) بطلیموس کے ماتحت مصر اور (۳) انٹی گونس کے ماتحت مقدونیہ پہلی دو سلطنتیں بہت مدت تک قائم رہیں۔ تمہیں خیال ہوگا کہ سلیوکس ہندوستان کا پڑوسی تھا اور اسکو یہ ہوس تھی کہ ہندوستان کا تھوڑا بہت حصّہ بھی اسے مل جائے۔ لیکن چندرگپت اس سے زبردست نکلا اور نہ صرف اُسے پسپا کیا بلکہ اس پر مجبور کیا کہ افغانستان کا کچھ حصّہ بھی اس کے حوالے کرے۔

مقدونیہ اتنا خوش نصیب نہ تھا۔ اس کو شمال کی گال قوم اور دوسری اقوام نے بہت جلد تباہ کر ڈالا۔ اس سلطنت کا صرف ایک حصّہ اس قوم کے مقابلہ کی تاب لاسکا اور کچھ دن آزاد رہا۔ اس کا نام پرگیمم (Pergamum) تھا۔ جو ایشیائے کوچک میں ٹھیک اس جگہ واقع تھا جہاں اب ترکی سلطنت ہے۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی سی یونانی ریاست تھی۔ لیکن تقریباً سو برس تک یونانی تہذیب و تمدن اور علم و فن کا گہوارہ رہی۔ اس زمانہ میں یہاں بہت سی خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ایک کتب خانہ اور عجائب خانہ بھی قائم ہوا گویا ایک طرح سے یہ اسکندریہ کی مدمقابل تھی۔

اسکندریہ مصر کے بطلیموس خاندان کے بادشاہوں کی دارالسلطنت تھا۔ اس شہر نے بہت ترقی کی اور پرانے زمانہ میں بہت مشہور تھا۔ ایتھنس کی شان و شوکت بہت کچھ ختم ہوچکی تھی۔ اس لئے اسکندریہ رفتہ رفتہ یونانیوں

کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا۔ اس کے کتب خانے اور عجائب خانے میں دور دور کے طالب علم آتے تھے اور فلسفہ۔ ریاضی۔ مذہب وغیرہ پر جتنا اس زمانہ میں چرچا تھا تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ اقلیدس کا نام تو تم نے سنا ہوگا کیونکہ سب لڑکے لڑکیاں جو کبھی کسی مدرسہ میں پڑھی ہیں اس کا نام ضرور جانتی ہیں۔ وہ اسکندریہ ہی کا رہنے والا اور اشوک کا ہم عصر تھا۔

یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ بطلیموس خاندان کے بادشاہ دراصل یونانی نسل سے تھے لیکن انھوں نے اکثر مصری رسم و رواج اختیار کرلئے تھے حتیٰ کہ وہ بعض مصری دیوتاؤں کو بھی ماننے لگے تھے۔ جیسے مہابھارت میں ویدک دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ اسی طرح ہومر کے رزم ناموں میں جوپیٹر، اپولو اور بہت سے یونانی دیوی دیوتاؤں کا تذکرہ ہے۔ مصر میں یہ پرانے دیوتا یا تو بالکل نابود ہو گئے یا ان کے نام اور ہیئت بدل گئی اور ایک نئی شکل میں ظاہر ہوئے قدیم مصر کے ایپس اوسیرس اور ہواس اور قدیم یونان کے مذکورہ بالا دیوی دیوتاؤں کو خلط ملط کرکے اب عوام کی پرستش کے لئے نئے دیوتا پیش کئے گئے۔ عوام کو اس سے کیا مطلب کہ وہ کس کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور کس کی پوجا کرتے ہیں اور اس کا نام کیا رکھا جاتا ہے۔ انھیں تو بس پوجا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ چاہئے۔ ان نئے دیوتاؤں میں سے سب سے مشہور دیوتا کا نام سیراپیس تھا۔

اسکندریہ بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور ساری مہذب دنیا کے تاجر یہاں آتے تھے۔ سنا ہے کہ اسکندریہ میں ہندوستانی تاجروں کی ایک

نوآبادی بھی تھی اور یہ تو ہمیں علم ہے کہ جنوبی ہند میں ملابار کے ساحل پر اسکندریہ کے تاجر آباد تھے۔

بحر روم کے دوسری طرف، مصر سے تھوڑی دور پر شہر ردمہ تھا جو ترقی کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا اور اس کی قسمت میں ابھی اس سے زیادہ طاقت وعروج پانا لکھا تھا۔ اس کے سامنے ہی افریقہ کے ساحل پر اس کا رقیب اور دشمن کارتھیج تھا۔ قدیم دنیا کا صحیح تصور قایم کرنے کے لئے ہم ان کی داستان ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

مشرق میں چین بھی اسی طرح اُبھر رہا تھا جیسے مغرب میں روم اس لئے اپنے ذہن میں اشوک کے زمانہ کی صحیح تصویر کھینچنے کے لئے اس پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

(۲۶)

چی ین اور ہان

پچھلے سال نینی جیل سے میں نے تمہیں جو خط لکھے تھے ان میں چین کے ابتدائی زمانہ کا کچھ حال بتایا تھا یعنی ہانگ ہوندی کے کنارے آبادیاں قائم ہونے کا اور سیا۔ شنگ یا ین اور چاؤ خاندانوں کا حال لکھا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح چینی سلطنت بنی اور رفتہ رفتہ مرکزی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے بعد ایک ایسا زمانہ آیا جب ایک عرصہ تک اگرچہ برائے نام چاؤ خاندان کی حکومت رہی لیکن مرکزیت کی ترقی رک گئی اور طوائف الملوکی پھیل گئی۔ چھوٹے چھوٹے مقامی حاکم عملاً خود مختار ہو گئے اور ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ یہ افسوسناک حالت بھی سینکڑوں برس تک جاری رہی (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چین میں ہر چیز سینکڑوں ہزاروں برس تک چلتی رہتی ہے) حتیٰ کہ چی ین کے صوبہ دار نے قدیم اور ناکارہ چاؤ خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے جانشین چی ین خاندان کے نام سے مشہور ہوئے اور اس ملک کا نام چین بھی اسی خاندان کے نام پر پڑا۔

چی ین کا دور ۲۵۵ء قبل مسیح میں شروع ہوا اس سے تیرہ برس پہلے ہندوستان میں اشوک کا راج شروع ہو چکا تھا۔ گویا اب ہم چین میں اشوک کے ہم عصروں کے تذکرے پر آگئے۔ چی ین بادشاہوں میں پہلے تین کی حکومت بہت تھوڑے دن رہی۔ اس کے بعد ۲۴۶ء قبل مسیح

میں جو تھا چی ین بادشاہ ہوا۔ وہ نہایت ہی عجیب وغریب انسان تھا۔ اس کا اصلی نام ونگ چنگ تھا۔ لیکن اس نے شیہ ہوانگ ٹی کا لقب اختیار کیا اور اسی نام سے وہ مشہور ہے اس کے معنی ہیں "پہلا شہنشاہ" اس کی نظر میں اپنی اور اپنے زمانہ کی بہت زیادہ وقعت تھی اور ماضی کا بالکل قائل نہ تھا بلکہ چاہتا تھا کہ لوگ ماضی کو بھول جائیں اور یہ سمجھیں کہ تاریخ اسی سے یعنی "پہلے شہنشاہ" سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ تقریباً دو ہزار سال تک چین میں متواتر بادشاہ ہوتے رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سرزمین سے ان کی یاد بھی محو ہو جائے اور نہ صرف پچھلے شہنشاہوں کو بلکہ تمام دوسرے مشہور لوگوں کو بھی بھلا دیا جائے لہٰذا اس نے حکم جاری کیا کہ ایسی تمام کتابیں جن میں پچھلے زمانے کا کوئی تذکرہ ہو خصوصاً تاریخ کی اور کانفیوکس کے زمانے کی علم و ادب کی سب کتابیں جلا دی جائیں حتیٰ کہ ان کا ایک نسخہ بھی کہیں دستیاب نہ ہو سکے۔ صرف طب اور اسی قسم کے بعض دوسرے علوم کی کتابوں کو مستثنیٰ کیا تھا۔
اپنے فرمان میں اس نے لکھا تھا کہ :-

"جو لوگ موجودہ زمانہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے ماضی کی اہمیت کو بڑھائیں گے۔ انھیں ان کے اہل وعیال سمیت قتل کر دیا جائے گا۔"

یہی نہیں کہ اس نے صرف یہ حکم جاری کر دیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کیا اور سینکڑوں عالم فاضل جنھوں نے اپنی محبوب کتابوں کو چھپانے کی کوشش کی زندہ دفن کر دیئے گئے، واہ واہ کیسا اچھا۔ رحم دل اور ہر دلعزیز ہوگا۔ یہ پہلا شہنشاہ! لیکن جب میں ہندوستان میں لوگوں کو ماضی کے گیت گاتے سنتا ہوں تو ہمیشہ مجھے وہ "پہلا شہنشاہ" یاد آجاتا ہے

اور ایک حد تک اس کی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ ہم میں سے بعض اصحاب ہمیشہ ماضی کی طرف دیکھنے کے عادی ہیں اُسی کی ثنا خوانی کیا کرتے ہیں اور اسی کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ماضی سے بڑے بڑے کام کرنے کی توفیق پیدا ہو تو اس کی پیروی میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اصولی حیثیت سے کسی قوم یا فرد کے لئے یہ کبھی مفید نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھا کرے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر انسان پیچھے کی طرف چلنے یا دیکھنے کے لئے بنایا گیا ہوتا تو ضرور اس کی آنکھیں گدّی میں ہوتیں ماضی کے حالات سے ضرور واقفیت پیدا کر لی چاہئے اور اس میں جو قابل قدر باتیں ہوں، ان کی قدر بھی کرنی چاہئے۔ لیکن ہماری نظر ہمیشہ سامنے رہنی چاہئے اور قدم آگے بڑھنے چاہئیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شی ہوانگ ٹی نے پرانی کتابوں کو جلوا کر اور ان کے پڑھنے والوں کو زندہ دفن کرا کے بڑی بربریت کا ثبوت دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کا سب کیا کرایا اسی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ وہ تو پہلا شہنشاہ ہے اس کے بعد دوسرا ہو۔ پھر تیسرا ہو۔ اور یہ سلسلہ ابد تک قائم رہے۔ لیکن ہوا یہ کہ چین کے تمام شاہی خاندانوں میں چی ین کی حکومت سب سے کم مدت تک رہی۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہاں کے بہت سے خاندان تو سینکڑوں برس تک حکمراں رہے، خود چی ین کے پیش رُووں میں سے ایک خاندان کی حکومت ۸۶۷ برس تک رہی لیکن اس جلیل القدر چی ین خاندان کا ابھرنا پھلنا پھولنا ایک عظیم الشان سلطنت پر حکومت کرنا۔ پھر ان کا زوال اور خاتمہ سب کچھ پچاس سال کے اندر اندر ہو گیا۔ شی ہوانگ ٹی کا خیال تھا کہ وہ بڑے بڑے طاقتور

شہنشاہوں کے سلسلے کا بانی ہے۔ لیکن اس کی موت کے تین سال بعد ہی یعنی ۲۰۹ قبل مسیح میں اس کا خاندان نیست نابود ہو گیا اور تمام ممنوعہ کتابیں خصوصاً کانفیوشش کے زمانے کی علمی وادبی تصانیف زمین سے کھود کھود کر نکال لی گئیں اور انھیں پھر دینی عزت کا درجہ حاصل ہوا۔

بادشاہ کی حیثیت سے شی ہوانگ ٹی چین میں سب سے زیادہ طاقتور گزرا ہے۔ اس نے بے شمار مقامی حاکموں کے خود مختاری کے دعووں کا خاتمہ کر دیا اور نظام جاگیری کو مٹا کر نہایت مضبوط مرکزی حکومت قائم کی اس نے پورے چین کو حتیٰ کہ اَنام کو بھی فتح کر لیا۔ یہی وہ بادشاہ تھا جس نے دیوارِ چین بنانی شروع کی۔ اس کام میں بہت روپئے کا صرف تھا۔ لیکن چینیوں نے بیرونی دشمنوں سے بچنے کے لئے بہت بڑی مستقل فوج رکھنے کے مقابلہ میں اس دیوار پر روپیہ خرچ کرنے کو ترجیح دی۔ اس دیوار سے کوئی بڑا حملہ نہیں رک سکتا۔ صرف چھوٹے چھوٹے ہلّون کی روک تھام ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ چینی امن چاہتے تھے اور اپنی طاقت کے باوجود انھیں اس کا شوق نہ تھا کہ فوجی کارناموں کے ذریعے سے شہرت اور عظمت حاصل کریں۔

پہلے شہنشاہ شی ہوانگ ٹی، کا انتقال ہو گیا۔ اور اس خاندان کا کوئی دوسرا فرد صحیح معنوں میں اس کا جانشین نہیں ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے زمانے سے چین ہمیشہ متحد رہا۔

اس کے بعد ہان خاندان برسر اقتدار آیا۔ یہ چار سو برس تک حکمراں رہا۔ اس کے شروع زمانہ میں ایک عورت شہنشاہ بھی گذری ہے۔ اس خاندان کے چھٹے بادشاہ کا نام وو ٹی تھا۔ اس کا شمار

بھی چین کے زبردست اور مشہور بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس نے پچاس برس سے زیادہ حکومت کی اس نے تاتاریوں کو شکست دی جو شمال کی طرف سے برابر حملے کرتے رہتے تھے۔ اس کی سلطنت مشرق میں کوریا تک اور مغرب میں بحر کیسپین تک پھیلی ہوئی تھی اور وسطی ایشیا کے تمام قبیلے اسے اپنا آقا تسلیم کرتے تھے۔ ذرا ایشیا کے نقشے میں دیکھو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ اس کا اثر و اقتدار کتنا زبردست تھا اور پہلی اور دوسری صدی قبل مسیح میں چین کی قوت کا کیا عالم تھا۔ اس زمانہ میں روم کی عظمت اور عروج کے ہم نے بہت سے فسانے پڑھے ہیں جن سے خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید روم ساری دنیا پر چھا رہا تھا۔ بلکہ روم کو "ملکہ عالم" کہتے بھی تھے لیکن اگرچہ رومی سلطنت بہت بڑی تھی اور اس کا اقتدار روز بروز بڑھ رہا تھا چین کی سلطنت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور کہیں زیادہ طاقتور تھی۔

غالباً وو ٹی کے زمانے میں چین اور روم کے درمیان ربط ضبط پیدا ہوا۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان (**Parthian**) کے واسطے سے جو ایران اور عراق کے علاقے میں آباد تھے تجارت شروع ہوئی لیکن جب روم اور (**Parthia**) کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو تجارت کا یہ سلسلہ بھی رک گیا۔ اس وقت روم والوں نے سمندر کے راستہ سے براہ راست تجارت کرنے کی کوشش کی اور ایک رومی جہاز چین آیا بھی۔ لیکن یہ تو حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد دوسری صدی کا قصہ ہے۔ ہم تو ان کی پیدائش سے پہلے کے زمانے کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

غالباً اسی ووٹی کے زمانہ میں چین اور روما میں باہمی تعلقات پیدا ہوئے ان دونوں ملکوں میں تجارت پارتھیوں کے توسط سے ہوتی تھی یہ لوگ اس خطہ میں آباد تھے جو آج ایران اور عراق کہلاتا ہے۔ آگے چل کر روما اور پارتھیا میں جنگ چھڑ گئی اور یہ تجارت بند ہو گئی اب رومیوں نے چین سے براہ راست سمندر کے راستہ تجارت کرنے کی کوشش کی اور اور ایک رومی جہاز چین تک پہنچ بھی گیا۔ مگر یہ تو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور ہم ابھی تک حضرت مسیح سے پہلے کا ذکر کر رہے ہیں۔ چین میں بودھ دھرم ہان خاندان کے زمانے میں یوں تو حضرت عیسٰی کی پیدائش سے پہلے بھی وہاں کہیں کہیں اس کا پتہ چلتا ہے لیکن سارے ملک میں یہ بعد میں پھیلا۔ اس کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ وقت نے خواب میں ایک سولہ فٹ لمبا انسان دیکھا جس کے سر کے چاروں طرف بڑا روشن ہالہ پڑا ہوا تھا۔ چونکہ اس نے یہ صورت مغرب کی سمت دیکھی اس لئے اس نے اسی طرف اپنے پیغامبر بھیجے۔ یہ لوگ بودھ کی ایک مورتی اور ان کی تصانیف لے کر واپس آئے اس طرح یہاں بودھ دھرم پھیلا۔ بودھ دھرم کے ساتھ چین میں ہندوستانی آرٹ آیا۔ جو پہلے کوریا، پھر جاپان تک پہنچ گیا۔

ان زمانے کے دو اہم واقعات اور قابل ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ لکڑی کے بلاکوں سے چھاپنے کا فن اسی زمانہ میں وہاں ایجاد ہوا۔ لیکن تقریباً ایک ہزار برس تک اس کا کچھ زیادہ چرچا نہیں ہوا۔ پھر بھی چین اس معاملہ میں یورپ سے پانچ سو برس آگے تھا۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے سرکاری ملازموں

کے لئے امتحان کا طریقہ رائج کیا۔ سب لڑکے لڑکیاں امتحان سے بہت گھبراتے ہیں اور مجھے ان کے ساتھ ہمدردی ہے لیکن اس زمانہ میں چینیوں کا سرکاری ملازموں کو امتحان لے کر مقرر کرنا بہت ہی عجیب بات تھی دوسرے ملکوں میں تو اب تک سرکاری عہدے ذاتی تعلقات کی بنا پر یا خاص طبقہ اور قوم کے لحاظ سے دیئے جاتے ہیں لیکن چین میں ذات پات کا کوئی خیال نہ تھا جو کوئی امتحان پاس کر لیتا اس کا تقرر ہو جاتا۔ مانا کہ یہ کوئی بہترین طریقہ نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی شخص کا نفوشی علم وادب میں امتحان پاس کرے۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ اچھا افسر بھی ہو سکے۔ مگر پھر بھی اس میں شک نہیں کہ رعایتی تقرر کے مقابلہ میں یہ بہت بہتر طریقہ تھا اور چین میں کوئی دو ہزار برس تک جاری رہا۔ لیکن ابھی حال ہی میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

(۴۷)

روم اور کارتھیج کا مقابلہ

۵ اپریل ۱۹۳۲ء

اب ذرا مشرق بعید سے مغرب کو چلیں اور رومی سلطنت کے عروج کا تماشہ دیکھیں۔ کہتے ہیں کہ رومہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں آباد ہوا ابتدائی زمانہ کے رومیوں کی جو غالباً آریوں کی نسل سے تھے ٹائبر ندی کے پاس سات پہاڑوں پر کچھ بستیاں تھیں یہ بستیاں رفتہ رفتہ بڑھ کر ایک شہر بن گئیں اور یہ شہری ریاست برابر بڑھتی اور اٹلی میں پھیلتی رہی حتیٰ کہ انتہائی جنوب میں سسلی کے بالمقابل سینا تک پہنچ گئی۔

تمہیں یونان کی شہری ریاستوں کا تو خیال ہوگا۔ جہاں کہیں یونانی پہنچے اپنے ساتھ ان شہری ریاستوں کا تخیل لیتے گئے۔ چنانچہ بحرروم کے کنارے کنارے بہت سی یونانی نوآبادیاں اور شہری ریاستیں قائم ہوگئیں۔ لیکن رومہ میں بالکل دوسری صورت تھی۔ شروع میں تو شاید رومہ بھی یونان کی شہری ریاستوں کی طرح ہوگا لیکن اپنی پڑوسی قوموں کو شکست دے کر بہت جلد بڑھ گیا اور اٹلی کا بیشتر حصہ اس میں شامل ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے علاقہ کو شہری ریاست تو نہیں کہہ سکتے۔ حکومت کا مرکز شہر رومہ تھا اور خود رومہ میں عجیب طرز کی حکومت تھی۔ نہ تو کوئی شہنشاہ یا بڑا بادشاہ تھا اور نہ موجودہ طرز کی جمہوریت تھی۔ پھر بھی اسے ایک قسم کی جمہوریت کہنا چاہیے۔ جس پر بڑے بڑے زمیندار حاوی تھے۔ حکومت کی

باگ ڈور سینٹ کے ہاتھ میں تھی اور اس سینٹ کو دو منتخب شدہ شخص جنھیں قنصل کہتے تھے نامزد کرتے تھے۔ ایک مدت تک صرف روسا ر سینٹ کے رکن ہو سکتے تھے۔ رومی لوگ دو طبقوں میں تقسیم تھے یعنی روسا ر جو عموماً زمیندار ہوتے تھے اور عام شہری رومی ریاست یا جمہوریت کی سینکڑوں برس کی تاریخ انھی دو طبقوں کی باہمی کشمکش کا نام ہے۔ روسار کے ہاتھ میں ساری طاقت تھی۔ اور طاقت اور دولت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عوام ان کے ماتحت تھے جن کے پاس نہ دولت تھی نہ طاقت۔ یہ لوگ برابر جد وجہد کرتے اور قوت حاصل کرنے کے لئے لڑتے اور کبھی کبھی کچھ تھوڑے بہت اختیارات ان کو بھی مل جاتے تھے۔ ہمارے لئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ عوام نے اپنی اس طویل جد وجہد میں ایک قسم کی ترک موالات بھی کی اور اس میں کامیاب ہوئے وہ سب کے سب ایک جماعت میں رومہ سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنا ایک نیا شہر آباد کر لیا۔ اس سے روسار گھبرا اُٹھے کیونکہ عوام کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے انھوں نے ان سے سمجھوتہ کر لیا اور انھیں تھوڑے بہت حقوق دیدئے۔ رفتہ رفتہ عوام کو اعلیٰ عہدے بھی ملنے لگے اور وہ سینٹ کے رکن بھی ہونے لگے۔

چونکہ ان جھگڑوں میں صرف روسار اور عوام کا ذکر آتا ہے اس لئے ہمیں یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ شاید ان کے علاوہ وہاں کوئی تیسرا طبقہ نہ تھا لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ ان دو طبقوں کے علاوہ رومہ میں غلام بھی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ جنھیں کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ نہ وہ شہری تصور کئے جاتے تھے اور نہ ملکی معاملات میں ووٹ دے سکتے تھے بلکہ اپنے مالک کی اسی طرح ذاتی ملکیت سمجھے جاتے تھے جیسے کتا یا گائے۔ ان

کا مالک انھیں فروخت کر سکتا تھا یا من مانی سزا دے سکتا تھا بعض شرائط کے ماتحت انھیں آزاد بھی کیا جا سکتا تھا لیکن آزاد ہونے کے بعد بھی وہ عوام کے طبقہ میں شامل نہ ہو سکتے تھے بلکہ "آزاد شدگان" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت تصور ہوتے تھے۔ مغرب میں قدیم زمانہ میں غلاموں کی ہمیشہ بہت مانگ رہتی تھی اس لئے مانگ کو پورا کرنے کے لئے غلاموں کی بڑی بڑی منڈیاں کھل گئیں اور دور دور کے ملکوں میں مہمیں بھیجی جانے لگیں تاکہ مرد ول۔ عورتوں حتیٰ کہ بچوں کو بھی گرفتار کر لائیں اور غلام کی حیثیت سے انھیں بیچ ڈالیں قدیم یونان روم اور مصر کی تمام شان و شوکت بیشتر غلامی کے اسی وسیع نظام کی بدولت تھی۔

کیا یہ غلامی ہندوستان میں بھی اسی طرح جاری تھی؟ غالباً ایسا نہیں تھا۔ نہ چین میں یہ صورت تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدیم چین اور ہندوستان میں غلامی کا نام ہی نہ تھا۔ تھی ضرور مگر خانگی قسم کی تھی۔ یعنی چند خانگی ملازموں کو غلام سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں غلام مزدور نہیں تھے جن سے گروہ کی صورت میں جگہ جگہ کام لیا جاتا ہو۔ گویا یہ دونوں ملک غلامی کی اس انتہائی ذلیل صورت سے مبرا تھے۔

غرض روما ترقی کرتا رہا اور رؤسا نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور امیر سے امیر تر ہوتے گئے۔ لیکن عوام ویسے ہی غریب رہے اور رؤساء ان پر چھائے رہے یہ دونوں مل کر بے چارے غلاموں کا سر کچلتے رہے۔

روما میں اس کے ترقی کے دور میں کس طرح کی حکومت تھی؟ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہاں ایک سینٹ تھا جسے دو منتخب شدہ قنصل نامزد

کرتے تھے۔ اور ان قنصلوں کو وہ شہری جو ووٹر ہوتے تھے منتخب کرتے تھے۔ شروع شروع میں رومہ ایک چھوٹی سی ریاست تھا اور تمام شہری رومہ یا اس کے قرب وجوار ہی میں رہتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے ایک جگہ جمع ہو کر کسی مسئلہ پر رائے دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن جب رومہ کی ریاست بڑھی تو شہر رومہ کے باہر دور دور کے لوگوں کو شہریت کے حقوق حاصل ہو گئے اور اب ایک جگہ جمع ہو کر ووٹ دینا آسان نہ رہا۔ آج کل کی سی "نمائندہ حکومت" کی اس وقت تک ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو تم جانتی ہو کہ آج کل ہر حلقہ یا علاقہ قومی اسمبلی پارلیمنٹ یا کانگریس کے لئے اپنا نمائندہ منتخب کرتا ہے اور اس طرح گویا ایک چھوٹی سی جماعت کے ذریعہ ساری قوم کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ یہ بات شاید روم والوں کی سمجھ میں نہیں آئی اس لئے جب انھوں نے دیکھا کہ دور دور کے ووٹروں کو جمع کرنا ممکن نہیں ہے تو صرف روم کے باشندوں سے ووٹ لے لینا کافی سمجھا دور کے ووٹروں کو یہ علم بھی نہ ہوتا تھا کہ رومہ میں کیا ہو رہا ہے۔ نہ اس زمانہ میں اخبار اور رسالے تھے اور نہ کتابیں، اور گنے چنے آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ گویا رومہ کے رہنے والے اپنے ووٹ کو استعمال نہ کر سکتے تھے۔ انھیں حق تو حاصل تھا لیکن فاصلہ نے انھیں اس حق سے محروم کر دیا تھا۔

غرض تم نے دیکھا کہ انتخاب میں اور اہم مسائل کا فیصلہ کرنے میں صرف رومہ شہر کے ووٹر حصہ لے سکتے تھے وہ کھلے میدان میں ووٹ دیتے تھے۔ اس طرح کہ مختلف احاطے بنا دیئے جاتے تھے اور لوگ ان میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ ان ووٹروں میں بہت سے غریب عوام

بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ رؤسا جو اعلیٰ عہدے اور اقتدار چاہتے تھے ان غریبوں کو رشوت دے کر ووٹ حاصل کر لیتے تھے۔ گویا رومہ کے انتخابات میں بھی ایسی ہی چالبازیاں ہوتی تھیں اور رشوت چلتی تھی جیسے بعض اوقات آج کل کے انتخابات میں ہوتا ہے۔

جس زمانہ میں اٹلی میں رومہ کا عروج تھا، اسی زمانہ میں شمالی افریقہ میں کارتھیج قوت پکڑ رہا تھا۔ کارتھیج والے فنیقیوں کی نسل سے تھے اس لئے انھوں نے جہازرانی اور تجارت کا ملکہ ورثہ میں پایا تھا۔ ان کے یہاں بھی جمہوریت تھی۔ لیکن اس میں رومہ سے زیادہ امرا کا دخل تھا یہ شہری جمہوریت تھی جس میں غلاموں کی بہت بڑی آبادی تھی۔

ابتدائی زمانہ میں رومہ اور کارتھیج کے درمیان میں اٹلی اور مسینا کے نیچے یونانی آبادیاں تھیں۔ لیکن دونوں نے مل کر یونانیوں کو نکال دیا۔ کارتھیج نے سسلی پر قبضہ کر لیا اور رومہ سلطنت اٹلی کے جنوبی سرے تک پہنچ گئی۔ مگر رومہ اور کارتھیج کی یہ دوستی اور اتحاد زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہا۔ چند دن بعد ہی یہ دونوں آپس میں ٹکرانے لگے اور ان میں سخت رقابت پیدا ہو گئی۔ بحر روم ان دو زبردست طاقتوں کے لئے جو سمندر بیچ آمنے سامنے واقع تھیں کافی نہ تھا۔ دونوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ رومہ ترقی کے زینے طے کر رہا تھا اور اسے اپنے شباب کا زعم تھا۔ کارتھیج نے شروع شروع میں شاید رومہ کے اُبھرنے کو حقارت سے دیکھا۔ اسے اپنی جہازرانی کے کمال پر اعتماد تھا۔ تقریباً ایک سو برس تک وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے درمیان میں کبھی کبھی صلح بھی ہو جاتی تھی۔ درحقیقت وہ وحشی جانوروں کی

طرح لڑے جس کی وجہ سے ساری آبادی کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں تین بڑی لڑائیاں ہوئیں جنھیں پیونی جنگیں Punic Wars کہتے ہیں۔ پہلی جنگ ۲۳ برس تک رہی (یعنی ۲۶۴ء قبل مسیح سے ۲۴۱ء قبل مسیح تک) اور اس میں رومہ کو فتح حاصل ہوئی اس کے ۲۲ برس بعد دوسری جنگ ہوئی اس کی کمان کے لئے کارتھیج نے ایک جنرل بھیجا جو تاریخ میں بہت مشہور گذرا ہے۔ اس کا نام ہنی بال تھا۔ پندرہ برس تک ہنی بال نے رومہ کا ناک میں دم کئے رکھا اور رومیوں کے دل ہلا دیئے۔ اس نے ان کی فوجوں کو شکست دی اور بہتوں کو تہ تیغ کر دیا۔ خاص کر کینائی میں ۲۱۶ء قبل مسیح میں۔ اور اس نے یہ سب کچھ کارتھیج کی کمک کے بغیر کیا۔ کیونکہ سمندر پر رومیوں کا قبضہ تھا اور انھوں نے راستہ روک رکھا تھا لیکن باوجود اس شکست اور قتل و غارت کے اور باوجود ہنی بال کے دائمی خطرہ کے رومیوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور اپنے جانی دشمن کے خلاف برابر ڈٹے رہے۔ ہنی بال کا دو بدو مقابلہ کرنے سے وہ ڈرتے تھے۔ اس لئے وہ جنگ سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ بس اسے ستانے اور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ رسد یا کمک نہ آنے پائے۔ رومیوں کے جنرل کا نام جو اس ترکیب میں استاد تھا فے بیس تھا۔ دس سال تک اس نے اسی طرح جنگ سے پہلو بچایا۔ میں نے اس کا نام اس لئے نہیں لکھا ہے کہ وہ کوئی بہت بڑا آدمی نہ تھا جس کا نام یاد رکھنے کے قابل ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے نام سے انگریزی زبان کا ایک لفظ فے بین Fabian نکلا ہے۔ Fabian چالوں سے

مراد ہے۔ جنگ یا معرکہ سے بچنا اور کسی چیز کا دو ٹوک فیصلہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ بلکہ آہستہ آہستہ فریق کو دبا کر اپنا مقصد حاصل کرنا۔ انگلستان میں ایک فےبین سوسائٹی بھی ہے جو اشتراکیت کے اصول کو تو مانتی ہے لیکن فوری انقلاب یا تبدیلی کی قائل نہیں ہے۔

ہنی بال نے اٹلی کے بیشتر حصے کو اجاڑ دیا لیکن رومہ بھی برابر ڈٹا رہا۔ جس کی وجہ سے آخر کار اس کی فتح ہوئی۔ ۲۰۲ء قبل مسیح میں ہنی بال جنگ زاما میں ہارا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جگہ جگہ چھپتا پھرتا تھا اور جہاں وہ جاتا تھا اس کے خون کے پیاسے رومی اس کا پیچھا کرتے تھے حتیٰ کہ اس نے زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

اس کے بعد نصف صدی تک رومہ اور کارتھیج کے درمیان صلح رہی۔ کارتھیج بہت کچھ ذلیل اور کمزور ہو چکا تھا اور اب رومہ کے مقابلہ کی مشکل سے ہمت کر سکتا تھا لیکن رومہ کے دل کی بھڑاس نہیں نکلی تھی۔ چنانچہ اس نے کارتھیج کو ایک تیسری جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کارتھیج بالکل تباہ ہو گیا اور سخت کشت و خون ہوا۔ بلکہ سچ مچ اس زمین پر ہل چلا دیا گیا جہاں بحر روم کی ملکہ یعنی کارتھیج کا زبردست شہر کبھی آباد تھا۔

(۲۸)

رومی جمہوریت سلطنت بن گئی

۹ را پریل ۳۲ء

کارتھیج کی آخری شکست اور مکمل تباہی کے بعد روم کا طوطی بولنے لگا اور مغربی دنیا میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں رہا، یونانی ریاستوں کو تو وہ پہلے ہی فتح کرچکا تھا۔ اب کارتھیج کے علاقہ پر بھی اس نے قبضہ کرلیا۔ اس طرح دوسری پیونک جنگ کے بعد اسپین پر بھی روم کا تسلط ہوگیا۔ لیکن اب بھی رومی سلطنت صرف ان ملکوں تک محدود تھی جو بحر روم کے ساحل پر واقع تھے اور تمام شمالی اور وسطی یورپ روم کے اثر سے بالکل آزاد تھا۔

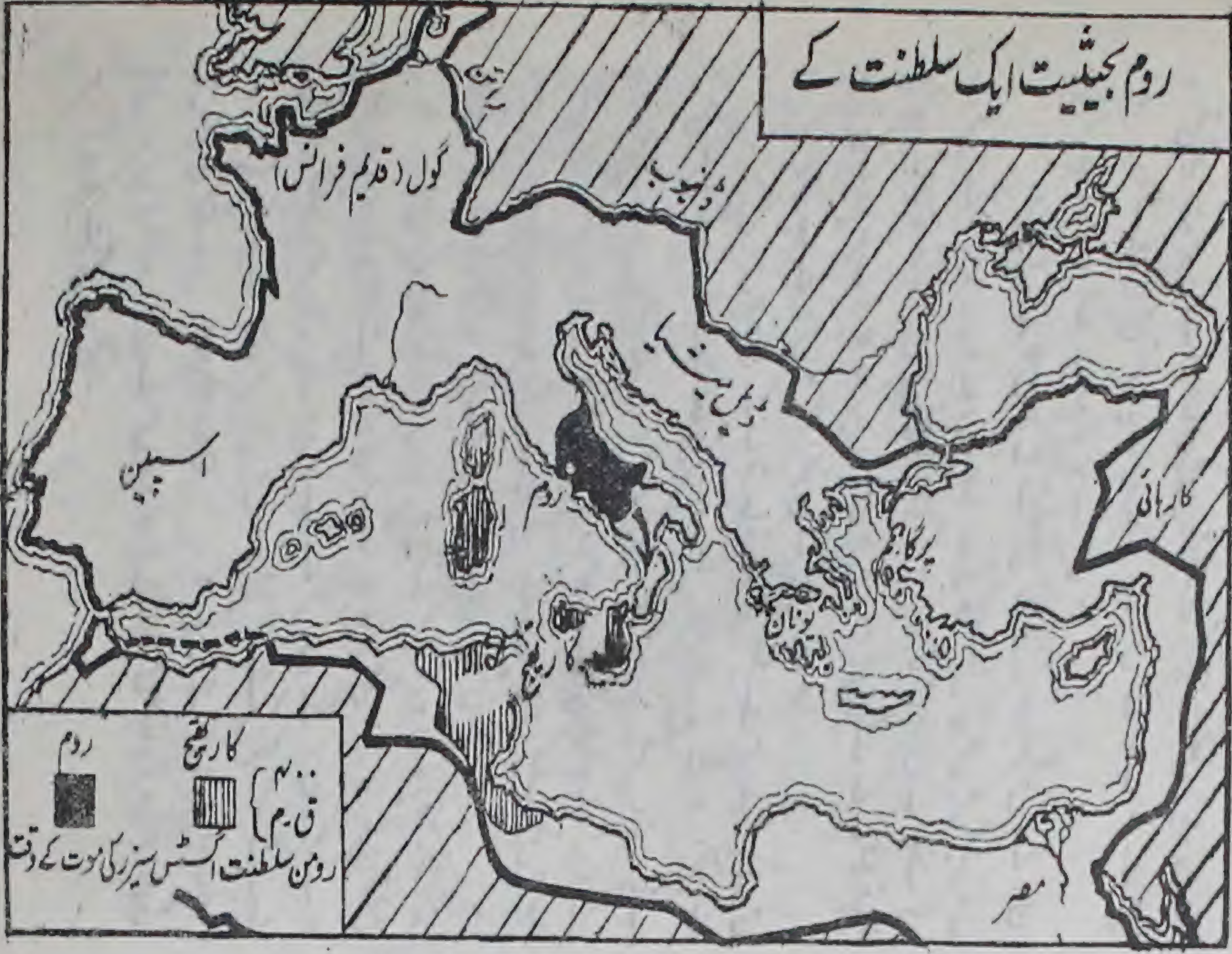
روم کی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں دولت اور عیش وعشرت کی فراوانی ہوگئی۔ مفتوحہ علاقوں سے سونے اور غلاموں کی ریل پیل ہونے لگی مگر یہ سب کچھ کس کے حصے میں آیا؟ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ روم میں سینٹ کی حکمرانی تھی اور سینٹ امرار پر مشتمل تھا اس لئے امرار کا یہ طبقہ رومی جمہوریت اور اس کی تمام ہستی پر چھایا ہوا تھا چنانچہ جیسے جیسے روم کی طاقت اور وسعت میں اضافہ ہوا، ان لوگوں کی دولت بھی دن دونی رات چوگنی ہوتی گئی۔ گویا امیر اور بھی امیر ہوگئے اور غریب غریب ہی رہے بلکہ اور زیادہ غریب ہوگئے۔ اس کے علاوہ غلاموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ گویا عیش اور مصیبت نے پہلو بہ پہلو ترقی کی جب کبھی ایسی صورت واقع ہوتی ہے تو عموماً کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر

واقعی حیرت ہوتی ہے کہ انسان میں برداشت کی قوت کتنی زیادہ ہے۔ لیکن برداشت کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے اس لئے جب سر سے اونچا پانی ہوجاتا ہے تو انقلاب رونما ہوتے ہیں۔

امیروں نے طرح طرح کے کھیل تماشوں اور سرکس کے ان مقابلوں کے ذریعہ سے غریبوں کو بہلانے کی کوشش کی جن میں شمشیر زنوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ آپس میں تیغ آزمائی کریں اور تماشائیوں کے لطف کی خاطر ایک دوسرے کو ہلاک کریں۔ اس طرح روم میں جنگ کے بے شمار قیدی اور غلام مارے گئے اس کا نام انھوں نے کھیل رکھا تھا۔

لیکن اس عروج کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت میں بدنظمیاں بھی بڑھتی گئیں جگہ جگہ بلوے۔ بغاوتیں اور قتل عام ہونے لگے اور انتخابات میں رشوت اور بدعنوانیاں عام ہوگئیں۔ حتیٰ کہ اسپارٹکس نامی ایک شمشیر زن کی سرکردگی میں ذلیل و خوار غلاموں نے بھی بغاوت کردی لیکن انھیں بڑی سفاکی اور بے رحمی سے کچلا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں چھ ہزار غلاموں کو روم کی ایپین سڑک پر پھانسی دے دی گئی۔

اس کے بعد بہادروں اور فوج کے سرداروں کو رفتہ رفتہ اقتدار حاصل ہوا اور وہ سینٹ پر حاوی ہوگئے۔ پھر خانہ جنگی اور غارتگری شروع ہوئی اور مختلف سردار ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارتھیا یعنی عراق میں رومی لشکر کو ۵۳ء قبل مسیح کی جنگ (Carrhae) کاریائی میں سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور پارتھیا والوں نے اس رومی فوج کا بالکل صفایا کردیا جو ان کی سرزنش کے لئے بھیجی گئی تھی۔


روم بحیثیت ایک سلطنت کے
گول (قدیم فرانس)
ڈینیوب
اسپین
روم
کارتھیج
یونان
مصر
روم
کارتھیج
۲۰۰ ق.م
رومن سلطنت اگسٹس سیزر کی موت کے وقت

رومی سرداروں کے انبوہ میں دو نام خاص طور پر ممتاز ہیں یعنی پامپے اور جولیس سیزر۔ تمہیں علم ہے کہ سیزر نے گال (یعنی فرانس) اور برطانیہ کو فتح کیا تھا اور پامپے مشرق کی طرف گیا اور وہاں اس نے کچھ فتوحات کیں لیکن ان دونوں میں سخت رقابت تھی۔ دونوں کو اقتدار حاصل کرنے کی ہوس تھی۔ اس لئے اپنے مدمقابل کو ایک آنکھ نہ دیکھ سکتے تھے اگرچہ زبان سے دونوں سینٹ کی اطاعت کا اقرار کرتے تھے لیکن حقیقت میں ان کے سامنے سینٹ عضو معطل ہو کر رہ گئی۔ کچھ دن بعد سیزر نے پامپے کو شکست دے دی اور رومی دنیا میں سب سے بڑا آدمی بن گیا لیکن روم میں جمہوریت قائم تھی اور وہ ضابطے سے سیاہ و سفید کا مالک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس کی کوشش کی گئی کہ اس کے سر پر تاج رکھ کر شہنشاہ بنا دیا جائے۔ دل میں تو وہ راضی تھا لیکن قدیم جمہوری روایات کی وجہ سے اسے کچھ تامل تھا۔ بالآخر یہ روایات اتنی مضبوط ثابت ہوئیں کہ بروٹس وغیرہ کے ہاتھوں وہ اسی ایوان کی سیڑھیوں پر قتل ہوا جہاں سینٹ کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ تم نے شیکسپیر کا ڈراما "جولیس سیزر" تو پڑھا ہوگا اس میں یہ منظر بہت تفصیل سے درج ہے۔

جولیس سیزر ۴۴ھ قبل مسیح میں قتل ہوا لیکن اس کی موت جمہوریت کے زوال کو نہ روک سکی، سیزر کے بھتیجے اور متبنیٰ آکٹیوین نے اور اس کے دوست مارک انٹونی نے اس کی موت کا پوری طرح بدلا لیا شاہی طرز حکومت دوبارہ رائج ہو گیا۔ آکٹیوین بادشاہ ہوا۔ اور جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا اس کے بعد اگرچہ سینٹ نام کو باقی رہی لیکن

اس کے تمام اختیارات سلب ہو گئے تھے
آکٹیوین نے بادشاہ ہونے پر آگسٹس سیزر کا لقب اختیار کیا۔
اس کے بعد تمام جانشین سیزر ہی کہلانے لگے۔ گویا سیزر کا لفظ شہنشاہ کا مرادف ہو گیا۔ لفظ قیصر بھی سیزر ہی سے نکلا ہے۔ یہ لفظ ہماری ہندستانی زبان میں بھی موجود ہے مثلاً قیصر روم۔ قیصر ہند وغیرہ۔ انگلستان کے شہنشاہ جارج اب قیصر ہند کہلاتے ہیں۔ قیصر جرمنی مدت ہوئی کہ ختم ہو چکے۔ اسی طرح آسٹریا۔ ترکی اور روس کے قیصروں کا بھی کہیں پتہ نہیں لیکن یہ کتنی دلچسپ اور عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ آج صرف ایک انگلستان کے بادشاہ ایسے رہ گئے ہیں جنھیں اس جولیس سیزر کے نام یا لقب سے یاد کیا جاتا ہے جس نے خود انھیں کے ملک برطانیہ کو فتح کیا تھا۔

غرض جولیس سیزر کا نام شاہی جاہ وحشم کا مظہر بن گیا ہے۔
اچھا ذرا سوچو تو۔ اگر پامپے یونان میں فارسیلس Pharsalus کے مقام پر سیزر کو شکست دے دیتا تو کیا صورت ہوتی؟ غالباً پامپے شہنشاہ ہو جاتا۔ اور پھر لفظ پامپے شہنشاہ کے معنی میں استعمال ہونے لگتا اس وقت شاید ہم ولیم ثانی کو قیصر جرمنی کے بجائے پامپے جرمنی اور شہنشاہ جارج کو پامپے ہند کہا کرتے۔

رومی حکومت کی اس تبدیلی کے دور میں جب کہ وہاں جمہوریت کے بجائے سلطنت قائم ہو رہی تھی۔ مصر میں ایک ایسی عورت حکمراں تھی جو تاریخ میں اپنے حسن وجمال کے لئے مشہور گذری ہے۔ اس کا نام کلیوپاٹرا تھا۔ وہ کچھ نیک نام نہیں ہے لیکن اس کا شمار اُن چند عورتوں

یں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنے حسن کی بدولت تاریخ یں ایک انقلاب کردیا
جب جولیس سیزر مصر گیا ہے تو وہ بہت کمسن تھی بعد یں مارک انٹونی سے
اس کی بہت دوستی ہوگئی لیکن اس نے انٹونی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک
نہیں کیا اور گھمسان کی بحری لڑائی یں اسے دغا دے کر اپنے جہازوں
سمیت چلی گئی۔ چنانچہ ایک مشہور فرانسیسی مصنف پیسکل اس کے
متعلق لکھتا ہے کہ ”اگر کلیوپاٹرا کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو آج دنیا کا
نقشہ کچھ اور ہوتا۔“ اس یں کچھ مبالغہ ضرور ہے۔ کلیوپاٹرا کی ناک سے
دنیا یں کوئی بہت بڑا فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ سیزر کو
مصر جانے کے بعد ہی سے یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ وہ شہنشاہ یا دیوتا ہے
مصر یں جمہوریت نہ تھی بلکہ شہنشاہی تھی اور بادشاہ نہ صرف حاکم مطلق
ہوتا تھا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ قدیم مصری تخیل تھا۔ یونان کے بطلیموس
خاندان کے بادشاہوں نے جو سکندر کی موت کے بعد مصر پر حکمراں ہوئے
بہت سی مصری رسمیں اور مصری عقائد اختیار کر لئے تھے۔ کلیوپاٹرا بھی
بطلیموس خاندان سے تھی۔ اس لئے وہ نسلاً یونانی بلکہ یوں کہئے کہ مقدونی
شہزادی تھی کہتے ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو سانپ سے کٹوا کر خودکشی کرلی۔

خواہ کلیوپاٹرا کو اس یں دخل ہو یا نہ ہو لیکن بہرحال یہ واقعہ
ہے کہ بادشاہ کے دیوتا ہونے کا مصری تخیل روم پہنچ گیا اور یہاں اس
نے گھر کرلیا جولیس سیزر کی زندگی ہی یں جب کہ جمہوریت ہنوز موجود تھی اس
کے مجسمے بنائے گئے اور انکی پرستش ہونے لگی آگے چل کر ہم بتائیں
گے کہ کس طرح یہ چیز رومی شہنشاہوں کے آداب یں داخل ہوگئی۔
اب روم کی تاریخ یں بہت بڑا انقلاب ہوگیا۔ یعنی جمہوریت ختم ہوگئی

اور ۲۷ء اکٹیوین آگسٹس سیزر کا لقب اختیار کر کے شہنشاہ بن گیا روم اور اس کے شہنشاہوں کی بقیہ کہانی کا سلسلہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے اس وقت تو ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں کہ جمہوریت کے آخری دنوں میں رومی مقبوضات کا دائرہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

روم کی حکومت ساری اٹلی پر تھی اس کے علاوہ وہ مغرب میں اسپین اور فرانس اور مشرق میں یونان اور ایشیائے کوچک جہاں کبھی پرگامم کی یونانی ریاست واقع تھی اس کے زیر نگیں تھے۔ شمالی افریقہ میں مصر اس کے زیر اثر تھا اس کے علاوہ کارتھیج اور بحر روم کے چند ساحلی ملک بھی اس کے ماتحت تھے۔ گویا شمال میں رومی سلطنت صرف رائن ندی تک تھی جرمنی روس اور شمالی اور وسطی یورپ اس میں شامل نہ تھے۔ اسی طرح مشرق میں عراق کے آگے اس کا کوئی دخل نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں روم کو بہت عروج حاصل تھا لیکن اکثر یورپ والے جو دوسرے ملکوں کی تاریخ سے ناواقف ہیں غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی ساری دنیا پر حکمرانی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا تمہیں خیال ہوگا کہ ٹھیک اسی زمانہ میں چین کا ہان خاندان بحر الکاہل سے لے کر بحر اخضر تک ایک بڑے علاقہ پر حکومت کر رہا تھا یا اس پر حاوی تھا۔ بہت ممکن ہے کہ مسوپوٹامیا میں جنگ کارہائی (Carrhae) کے موقع پر جب رومیوں کو شکست فاش ہوئی تھی۔ منگولیوں نے پارتھیوں کی مدد کی ہو۔

لیکن رومی تاریخ، خاص کر رومی جمہوریت کے زمانے کی تاریخ یورپ والوں کو بہت عزیز ہے کیونکہ وہ قدیم رومی جمہوریت

کو موجودہ یورپی ریاستوں کا مورث اعلیٰ سمجھتے ہیں اور یہ خیال کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ اس لئے انگلستان کے اسکولوں میں لڑکوں کو چاہے وہ موجودہ زمانے کی تاریخ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، یونان اور روم کی تاریخ ضرور پڑھائی جاتی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ فتح فرانس کا خود جولیس سیزر کا لکھا ہوا تذکرہ مجھے اصل لاطینی زبان میں پڑھایا گیا تھا۔ سیزر محض ایک سپاہی نہ تھا بلکہ مصنف بھی تھا اور ایک دلکش اور مؤثر طرز تحریر رکھتا تھا۔ اس کی کتاب De Bello Gallico یعنی گیلک جنگ کا تذکرہ اب بھی یورپ کے ہزاروں اسکول میں پڑھایا جاتا ہے۔

ابھی چند روز ہوئے کہ ہم نے یہ جائزہ لینا شروع کیا تھا کہ اشوک کے زمانے میں دنیا کی کیا حالت تھی لیکن ہم نے یہ جائزہ ختم کر لیا بلکہ چین اور یورپ میں اس زمانہ سے کچھ آگے بڑھ گئے۔ اب ہم حضرت عیسیٰ کی پیدائش سنہ عیسوی شروع ہونے کے لگ بھگ پہنچ گئے ہیں اس لئے ہمیں ہندوستان پر پھر ایک نظر ڈالنی ہوگی تاکہ یہاں کے لوگوں کے متعلق اس عہد تک اپنی معلومات مکمل کر لیں کیونکہ اشوک کے مرنے کے بعد یہاں بڑے بڑے انقلاب ہو گئے اور شمالی اور جنوبی ہند میں دونوں جگہ نئی نئی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔

میں نے تمہیں یہ نصیحت کی تھی کہ ساری دنیا کی تاریخ کو ایک مسلسل زنجیر کی طرح سمجھنا چاہیئے جس کی ایک کڑی دوسری سے ملی ہوئی ہے۔ لیکن تم جانتی ہو کہ اس زمانہ میں دور دور کے ملکوں میں باہم کچھ زیادہ ربط و تعلق نہ تھا اگرچہ روم بہت سی باتوں میں بہت آگے تھا لیکن جغرافیہ

اور نقشوں سے تقریباً ناواقف تھا اور اس نے اس کے سیکھنے کی بھی کوئی
کوشش نہیں کی۔ آج ہمارے اسکولوں کے لڑکے اور لڑکیاں اس سے
کہیں زیادہ جغرافیہ جانتے ہیں۔ جتنا رومی سینٹ کے مدبر اور بڑے بڑے
سردار جانتے تھے حالانکہ وہ اپنے آپ کو ساری دنیا کا مالک سمجھتے تھے اور
جیسے وہ اپنے آپ کو دنیا کا مالک سمجھتے تھے اسی طرح ان سے چند ہزار
میل کے فاصلہ پر براعظم ایشیا میں چین کے بادشاہ اسی خیال میں مست
تھے۔

(۲۹)

جنوبی ہند شمالی ہند پر چھا جاتا ہے

۱۰ اپریل ۳۲ء

اب ہم مشرق بعید میں چین اور مغرب میں روم کی سیر کر کے ایک مدت کے بعد پھر ہندوستان واپس آتے ہیں۔

اشوک کی موت کے بعد موریہ سلطنت زیادہ عرصہ تک نہیں چلی چند سال کے اندر اندر وہ مرجھا کر رہ گئی۔ شمالی صوبے خود مختار ہوئے اور جنوب میں ایک نئی طاقت یعنی آندھرا کا عروج ہوا۔ تاہم اشوک کی اولاد کوئی پچاس سال تک اس زوال پذیر سلطنت پر حکمرانی کرتی رہی حتیٰ کہ خود انھی کے سپہ سالار پشیہ متر نامی ایک برہمن نے انھیں گدی سے اتار دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے زمانے میں برہمن مت میں پھر سے نئی جان پڑ گئی۔ بودھ بھکشوؤں کو کسی حد تک ستایا بھی گیا۔ لیکن اگر تم ہندوستان کی تاریخ غور سے پڑھو گی تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ برہمن مت نے بودھ مت پر بڑی ترکیب سے حملہ کیا۔ اس نے ستانے یا دق کرنے والی بھونڈی حرکتوں سے کام نہیں لیا۔ مانا کہ تھوڑا بہت تشدد ہوا لیکن اس کی نوعیت مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی اُس وقت بودھ سنگھ بڑی طاقت ور جماعتیں تھیں اس لئے اکثر راجہ ان کے سیاسی اثر سے ڈرتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ آخرکار برہمن مت بودھ مت کو اس کی جنم بھومی

سے نکال دیتے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح کہ ایک حد تک اپنے میں اسے جذب کرلیا اور خود اپنے یہاں اس کے لئے ایک جگہ پیدا کرلی۔

غرض نئی برہمن تحریک کے معنی یہ نہیں تھے کہ لوگ پرانی حالت کی طرف لوٹ جائیں اور بودھ مت کی ہر چیز کی مخالفت کریں۔ برہمن مت کے پرانے رہنما بڑے ہوشیار لوگ تھے۔ ہمیشہ سے ان کی یہ عادت تھی کہ ہر چیز کو اپنے میں جذب کرلیتے تھے۔ شروع شروع میں جب آریہ ہندوستان آئے تو انھوں نے دراوڑی تہذیب کی بہت سی چیزوں کو لے لیا۔ ان کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ ان کا یہی عمل رہا ہے۔ یہی رویہ انھوں نے بودھ مت کے ساتھ اختیار کیا اور مہاتما بودھ کو بھی ہندو دیوتاؤں کے زمرّہ میں شامل کرلیا۔ بودھ کا نام ہندوستان میں موجود رہا اور ان کی پوجا بھی ہوتی رہی لیکن ان کی خاص تعلیم نہایت چپ چاپ سے اٹھا کر طاق پر رکھدی گئی اور برہمن مت یا ہندو دھرم تھوڑی بہت ترمیم کے بعد اپنی معمولی روش پر چلتا رہا لیکن بودھ مت کو برہمن مت کے سانچے میں ڈھالنے کا کام کافی مدت میں انجام پایا۔ ابھی ہمیں اس تذکرے پر نہ آنا چاہیئے کیونکہ اشوک کی موت کے بعد تو کئی سو برس تک ہندوستان میں بودھ مت کا چرچا رہا۔

مگدھ میں جو بادشاہ اور جو خاندان یکے بعد دیگرے برسر حکومت آتے رہے ان کے ذکر میں ہمیں سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے اشوک کی موت کے دو سو برس بعد سلطنت کی حیثیت سے مگدھ کا خاتمہ ہوگیا مگر پھر بھی ایک مدت تک بودھ تہذیب کا وہ بہت بڑا مرکز رہا۔

اس عرصہ میں شمالی اور جنوبی ہند میں بہت سے اہم واقعات

رونما ہوتے رہے۔ شمال میں وسطی ایشیا کی مختلف قوموں مثلاً باختری ساکا۔ سیتھی، ترکی۔ اور کوشن وغیرہ کے پے در پے حملے ہوئے۔ شاید میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ وسطی ایشیا میں ٹڈی دل کی طرح لوگ پیدا ہوتے تھے۔ پھر یہ نکل کھڑے ہوتے تھے اور تمام ایشیا اور یورپ میں پھیل جاتے تھے۔ تاریخ میں بار بار ان کا ذکر آتا ہے حضرت عیسیٰ کی پیدائش دو سو برس کے اندر ہندوستان پر بھی ان کے بہت سے حملے ہوئے لیکن ان حملوں کا مقصد ملک گیری یا لوٹ نہ تھا بلکہ ان لوگوں کو سکونت کے لئے زمین کی ضرورت تھی۔ وسطی ایشیا کے ان قبیلوں میں سے اکثر خانہ بدوش تھے۔ جب ان کی تعداد زیادہ بڑھ جاتی تھی اور جہاں یہ مقیم ہوتے تھے وہاں گنجائش نہیں رہتی تھی تو یہ لوگ نئے مقامات کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ہجرت کی اس سے زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ پیچھے سے ان پر دباؤ پڑتا تھا۔ یعنی کوئی بڑا قبیلہ پیچھے سے آکر انھیں بھگا دیتا تھا۔ اس لئے یہ دوسرے ملکوں کا رُخ کرنے پر مجبور رہتے تھے۔ گویا ہندوستان میں جو لوگ حملہ آوروں کی حیثیت سے آتے تھے وہ اکثر اپنے ملک سے بھاگے ہوئے پناہ گزیں ہوتے تھے اس کے علاوہ جب کبھی چینی سلطنت طاقتور ہوتی تھی جیسے ہان کے زمانے میں تھی تو وہ بھی ان خانہ بدوشوں کو بھگا دیتی تھی اور یہ بیچارے نئے مسکنوں کی تلاش پر مجبور ہوتے تھے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وسطی ایشیا کے یہ خانہ بدوش قبیلے ہندوستان کو دشمن کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان کو وحشی اور جنگلی کہا جاتا ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ اس زمانہ کے ہندوستانیوں کے مقابلہ میں وہ مہذب

نہ تھے۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر بودھ مذہب کے پیرو تھے اس لئے ہندوستان کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہی وہ ملک تھا جس نے ان کے دھرم کو جنم دیا تھا۔

پشیہ متر کے زمانے میں بھی شمال و مغرب سے ایک حملہ ہوا تھا یہ باختر بادشاہ کے مناندر نے کیا تھا۔ باختر کا علاقہ شمال کی جانب ہندوستان سے بالکل ملحق تھا۔ کسی زمانہ میں یہ سلیوکس کی سلطنت میں شامل تھا لیکن بعد کو خود مختار ہو گیا تھا۔ اگرچہ مناندر کو پسپا ہونا پڑا۔ پھر بھی کابل اور سندھ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ مناندر خود بڑا متقی و پرہیزگار بودھ تھا۔

اس کے بعد ساکا قوم کا حملہ ہوا وہ بہت بڑی تعداد میں یہاں آئے اور سارے شمالی اور مغربی ہند میں پھیل گئے۔ ترکی خانہ بدوشوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ساکا کہلاتا تھا انھیں ایک دوسرے بڑے قبیلے کوشن نے ان کی چراگاہوں سے نکال دیا وہ باختر اور پارتھیا ہوتے ہوئے۔ ہندوستان پہنچے اور انھوں نے شمالی ہند خصوصاً پنجاب راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ میں سکونت اختیار کر لی۔ ہندوستان نے انھیں تہذیب سکھائی اور رفتہ رفتہ انھوں نے خانہ بدوشی کی عادت ترک کر دی

یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اگرچہ ان باختری اور ترکی راجاؤں کی حکومت رہی لیکن ہندی آریہ سماج میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا۔ چونکہ یہ راجہ خود بودھ تھے اس لئے بودھ مت کے نظام کے پیرو تھے اور اس نظام کی بنیاد تھی قدیم ہندی آریہ نظام پر جس میں جمہوری دیہی حکومتوں کا رواج تھا۔

اس لئے ان راجاؤں کے زمانے میں بھی ہندوستان میں مرکزی حکومت کے ماتحت خود مختار دیہی جمہورتیں قائم رہیں ٹیکسیلا اور متھرا اب بھی بودھ علم وفن کے بڑے بڑے مرکز تھے جہاں چین اور مغربی ایشیا سے طالب علم آیا کرتے تھے۔

لیکن شمال ومغرب کے مسلسل حملوں اور سلطنت موریہ کے زوال کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم ہندی آریہ تہذیب کی نمائندگی کا فخر جنوبی ہند کی ریاستوں کو حاصل ہو گیا اور اس کا اصلی مرکز وہیں منتقل ہو گیا۔ غالباً ان حملوں کی وجہ سے بہت سے اہل کمال بھی جنوب کی طرف چلے گئے۔ آگے چل کر تم دیکھو گی کہ جب ایک ہزار برس بعد مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس وقت بھی یہی صورت پیش آئی اب بھی شمالی ہند کے مقابلہ میں جنوبی ہند میں بیرونی حملوں اور باہر کے سابقہ کا بہت کم اثر پایا جاتا ہے۔ ہم شمال کے رہنے والوں کا تمدن تو ایک معجون مرکب بن گیا ہے۔ یعنی کچھ ہندو ہے اور کچھ مسلم ہے اور ایک ہلکا سا رنگ مغرب کا ہے۔ ہماری زبان بھی خواہ اسے ہندی کہو یا اردو یا ہندوستانی ایک مخلوط زبان ہے لیکن یہ تو تم نے بھی دیکھا ہے کہ جنوب میں اب تک ہندو اور کٹر ہندو رنگ غالب ہے، جنوب نے سینکڑوں برس تک آریوں کی قدیم روایات کو برقرار اور بیرونی اثر سے محفوظ رکھا۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی سماج کا نظام بہت سخت ہو گیا جس میں آج بھی اتنی عدم رواداری پائی جاتی ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے سچ پوچھو تو ہر قسم کی دیواریں جو ان کے درمیان ہوں خطرناک چیز ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ کبھی کبھی بیرونی آفت

سے پناہ دے دیں اور بن بلائے مہمان کو روک سکیں۔ لیکن حقیقت میں وہ لوگوں کو قیدی اور غلام بنا دیتے ہیں اور جس چیز کو ہم شدہ ہونا کہتے ہیں وہ آزادی کو کھو کر حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ خطرناک وہ دیواریں ہوتی ہیں جو ذہن میں کھڑی ہو جائیں۔ ان کی بدولت انسان ماضی کی بُری باتوں کو محض اس وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ وہ قدیم ہیں اور نئے خیالات محض اس وجہ سے اختیار نہیں کرتا کہ وہ جدید ہیں

لیکن اس میں شک نہیں کہ جنوبی ہند نے نہ صرف مذہب بلکہ سیاست اور آرٹ کی ہندی آریہ روایات کو ہزاروں برس سے محفوظ اور برقرار رکھا ہے اور اس طرح ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اگر کسی کو ہندوستان کے قدیم آرٹ کے نمونے دیکھنا ہوں تو جنوبی ہند ہی میں ملیں گے۔ سیاست کے سلسلے میں میگس تھینس (یونانی) کا بیان ہے کہ جنوب میں جمہور کی مجلسیں بادشاہوں کے اختیارات کی روک تھام کیا کرتی تھیں۔

جب مگدھ کی سلطنت کا زوال ہوا تو نہ صرف اہل علم بلکہ ہر طرح کے اہل کمال مثلاً مصوّر۔ معمار۔ دستکار۔ صناع وغیرہ جنوب میں چلے گئے۔ یورپ اور جنوبی ہند کے درمیان تجارت خوب چمکی۔ موتی ہاتھی دانت۔ سونا، چاول۔ مرچ۔ مور حتیٰ کہ بندر تک، بابل، مصر، یونان اور بعد میں روم کو بھیجے جانے لگے۔ ساحل ملابار کی ساگون کی لکڑی تو اس سے پہلے ہی کلدیا (Chaldaea) اور بابل کو جاتی تھی۔ اس میں کا بیشتر تجارتی مال ہندوستانی جہازوں میں جاتا تھا جنھیں دراوڑ لوگ چلاتے تھے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتی ہو کہ پرانے زمانے میں جنوبی ہند کتنا ترقی یافتہ تھا یہاں اکثر مقامات پر رومی سکے برآمد ہوئے ہیں۔ اور یہ تو میں

تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ملابار کے ساحل پر مصری نوآبادیاں اور اسکندریہ میں ہندوستانی نوآبادیاں موجود تھیں۔

اشوک کے انتقال کے بعد ہی آندھرا کا علاقہ خود مختار ہوگیا تھا یہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر مدراس کے شمال میں واقع ہے اور کانگریس کے آئین میں اسے ایک علیحدہ صوبہ مانا جاتا ہے۔ آندھرا دیس کی زبان تلنگی ہے۔ اشوک کے بعد آندھرا کی قوت بڑی تیزی سے بڑھی اور اس کی سلطنت خلیج بنگال سے بحر عرب تک پھیل گئی۔

دوسرے ملکوں میں نوآبادیاں قائم کرنے کی مہمیں جنوب ہی سے روانہ ہوئیں۔ لیکن اس کا تذکرہ ہم پھر کبھی کریں گے۔

اوپر میں ساکا اور سیتھی اور دوسری قوموں کا تذکرہ کر چکا ہوں جنھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور شمال میں آباد ہوگئے وہ ہندوستان ہی کے ہو کر رہ گئے۔ اس لئے ہم شمال کے رہنے والے جس طرح آریوں کی نسل سے ہیں اسی طرح ان کا خون بھی ہماری رگوں میں موجود ہے بہادر اور خوبصورت راجپوت اور جفاکش کاٹھیا واڑی خاص کر ان کی اولادیں ہیں۔

(۳۰)

کوشن قوم کی سرحدی سلطنت

۱۱ راپریل ۱۹۳۲ء

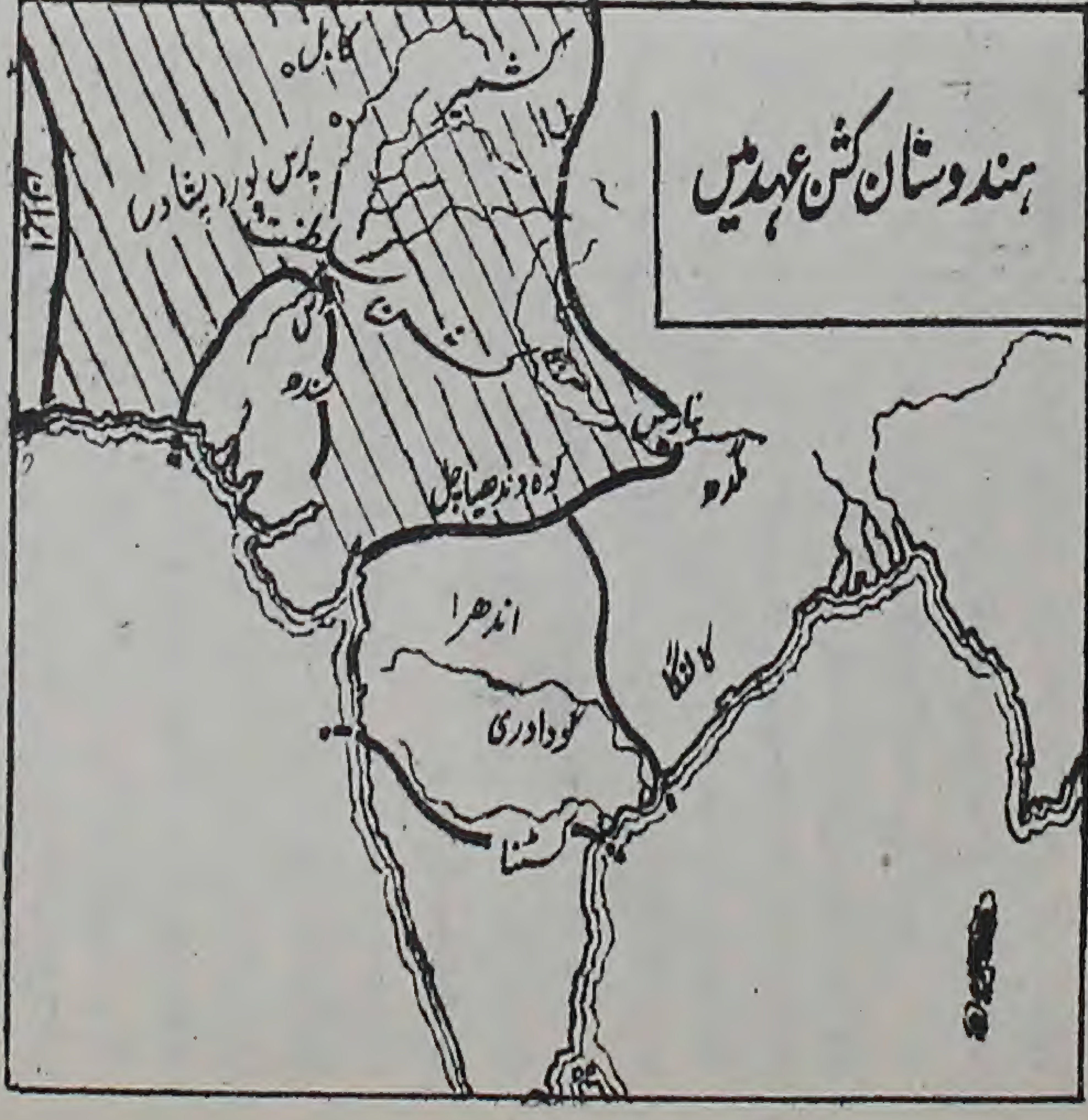
پچھلے خط میں میں نے ساکا اور ترکی قوموں کے ہندوستان پر متواتر حملوں کا تذکرہ کیا تھا اور آندھرا کی زبردست سلطنت کے عروج کا حال بھی لکھا تھا جو تمام جنوبی ہند میں بحرِ عرب سے خلیج بنگال تک پھیلی ہوئی تھی یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ ساکا لوگوں کو۔ کوشن قوم نے ہندوستان کی طرف بھگا دیا تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد خود کوشن لوگ بھی ہندوستان وارد ہوئے۔ پہلی صدی قبل مسیح میں انھوں نے ہندوستان کی سرحد پر ایک سلطنت قائم کرلی۔ کوشنوں کی یہ سلطنت جنوب میں بنارس اور کوہ وندھیاچل تک۔ شمال میں کاشغر، یارقند اور ختن تک اور مغرب میں ایران اور کار تھیا کے کنارے تک تھی۔ گویا تمام شمالی ہند یعنی صوبجات متحدہ۔ پنجاب اور کشمیر، اور وسطی ایشیا کا کافی علاقہ ان کوشن راجاؤں کے زیرِ نگیں تھا۔ یہ سلطنت کوئی تین سو برس تک قائم رہی ٹھیک اس زمانہ میں جب جنوبی ہند میں آندھرا کی سلطنت کا عروج تھا۔ شروع میں تو شاید کابل کوشنوں کی دارالسلطنت تھا۔ اس کے بعد منتقل ہو کر پشاور میں آگیا جسے اس زمانہ میں پُرش پورہ کہتے ہیں اور آخر تک یہیں رہا۔

یہ کوشن سلطنت کئی لحاظ سے بہت دلچسپ ہے یہ بودھوں کی ریاست تھی اور اس کا ایک مشہور راجہ کنشک بڑا پکا بودھ تھا۔

پشاور کے نزدیک ہی ٹکسیلا تھا جو عرصہ سے بودھ تہذیب و تمدن کا مرکز تھا کوشنوں کے متعلق میں شاید تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ منگولی تھے یا ان سے قریب کی نسبت رکھتے تھے ظاہر ہے کہ کوشنوں کی راجدھانی سے ان ملکوں تک جہاں منگولی قومیں آباد تھیں مسلسل آمد و رفت رہتی ہوگی اس لئے بودھ علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا اثر چین اور منگولیا تک پہنچا ہوگا۔ اسی طرح مغربی ایشیا پر بھی بودھ خیالات کا گہرا اثر پڑا ہوگا۔ سکندر کے زمانہ سے مغربی ایشیا میں یونانیوں کی حکومت تھی اور بہت سے یونانی یہاں آبسے تھے اور اپنے ساتھ یونانی تہذیب و تمدن بھی لائے تھے۔ اب گویا کوشنوں کے ذریعہ سے یونانی ایشائی تہذیب، ہندی بودھی تہذیب سے مل جل گئی۔

یوں ہندوستان کا اثر چین اور مغربی ایشیا تک پہنچا۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کا اثر ہندوستان پر بھی ہوا۔ کوشن سلطنت کی مثال ایسی تھی جیسے کوئی دیو ایشیا کی پیٹھ پر سوار ہو اور اس کی ایک ٹانگ مغرب میں یونان اور روم کی طرف ہو اور دوسری ٹانگ مشرق میں چین اور ہندوستان کی طرف۔ یہ گویا ایک طرف ہندوستان اور روم کی اور دوسری طرف ہندوستان اور چین کی درمیانی کڑی تھی۔

کوشن سلطنت کی اس درمیانی حیثیت کی وجہ سے ہندوستان اور روم میں گہرا ربط و ضبط پیدا ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رومی جمہوریت دم توڑ رہی تھی اور جولیس سیزر زندہ تھا اس کے بعد کوشن دور رومی سلطنت کے قائم ہونے کے دو سو برس بعد تک جاری رہا کہتے ہیں کہ کوشن راجہ نے آگسٹس سیزر کے دربار میں اپنا سفیر بھی بھیجا تھا۔ بحری اور


ہندوستان کشن عہد میں
کابل
پرش پور (پشاور)
سندھ
کوہ وندھیاچل
اندھرا
گوداوری
کالنگا

بری دونوں راستوں سے آپس کی تجارت بھی خوب فروغ پر تھی۔ ہندوستان سے جو چیزیں روم بھیجی جاتی تھیں ان میں خاص طور پر عطر۔ مسالے۔ ریشم کمخواب، ململ زرین کپڑے اور جواہرات قابل ذکر ہیں۔ پلینی نامی ایک رومی مصنف نے اس پر بڑی واویلا بھی کی تھی کہ روم سے ہندوستان کو سارا سونا کھنچا چلا جا رہا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس سامان تعیش کی بدولت رومی سلطنت کو ہر سال ڈیڑھ کروڑ روپئے سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

اس زمانہ میں بودھ خانقاہوں اور سنگھ کے جلسوں میں بڑے بڑے مباحثے ہوتے تھے۔ جنوب اور مغرب سے نئے خیالات یا نئے رنگ میں پرانے خیالات کی یورش ہو رہی تھی اور بودھ خیالات کی سادگی پر رفتہ رفتہ اثر پڑ رہا تھا۔ تدریجی تغیر کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بودھ مت کی دو شاخیں ہوگئیں یعنی مہایان (بڑا چکر) اور ہن یان (چھوٹا چکر) پھر ان نئے خیالات اور نئی توضیحات سے جیسے جیسے زندگی اور مذہب کے تصور میں فرق آیا۔ فن عمارت اور دوسرے فنون لطیفہ میں بھی اس کا اظہار ہونے لگا۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ یہ تبدیلیاں کیونکر واقع ہوئیں شاید دو خاص اثرات ساتھ ساتھ کام کر رہے تھے۔ اور دونوں بودھ خیالات کی رو کو ایک ہی سمت لے جا رہے تھے۔ یہ برہمنی اور یونانی اثرات تھے۔

یہ میں تمہیں بار ہا بتا چکا ہوں کہ بودھ دراصل ذات پات رسم درواج اور پروہتوں کے خلاف بغاوت کا نام تھا گوتم مورتی پوجا کے خلاف تھے۔ انھیں دیوتا ہونے کا دعویٰ نہ تھا وہ تو محض بودھ یعنی روشن ضمیر تھے۔ ان عقاید کی بنا پر بودھ کی مورتیں نہیں بنائی جاتی تھیں بلکہ اس زمانہ کی عمارتوں میں ہر طرح کی مورتوں سے پرہیز کیا جاتا تھا لیکن

برہمن فرقہ بودھ مت اور ہندو مت کو ایک دوسرے سے قریب لانا چاہتا تھا اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ ہندو عقاید اور اعمال کو بودھ مت میں داخل کر دے۔ اس کے علاوہ وہ کاریگر جو یونان اور روم سے آئے تھے دیوتاؤں کی مورتیں بنانے کے عادی تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بودھ مندروں میں مورتیں داخل ہو گئیں۔ شروع میں یہ گوتم بودھ کی نہیں بلکہ بودھی ستوؤں کی تھیں اس سے بودھ کے پچھلے سات جنم مراد ہیں غرض یہ سلسلہ برابر جاری رہا حتیٰ کہ خود بودھ کی مورتیں بننے لگیں اور ان کی پوجا ہونے لگی۔

بودھ مت کا مہایان فرقہ ان تبدیلیوں کے حق میں تھا۔ اس لئے کہ وہ برہمنوں کے خیالات سے قریب تر تھا۔ کوشن راجہ مہایان فرقے میں شامل ہو گئے اور ان کی وجہ سے اسے بہت فروغ حاصل ہوا لیکن ہنیان فرقے کے ساتھ یا دوسرے مذہبوں کے ساتھ انھوں نے تعصب کا برتاؤ نہیں کیا بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ کنشک نے تو پارسی مذہب کی بھی ہمت افزائی کی۔

ان بڑے بڑے مناظروں کا حال پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے جو مہایان اور ہنیان عقائد کی برتری کے بارے میں اہل علم میں ہوا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے سنگھ کے بڑے بڑے جلسے کئے جاتے تھے جس میں ہزاروں آدمی جمع ہوتے تھے۔ کنشک نے بھی کشمیر میں سنگھ کی اسی قسم کی ایک عام مجلس منعقد کی تھی۔ اس مسئلہ پر یہ اختلاف رائے اور یہ مناظرے سینکڑوں برس تک جاری رہے۔ مہایان فرقہ کا شمالی ہند میں زور رہا اور ہنیان فرقہ کا جنوبی ہند میں حتیٰ کہ ہندوستان میں دونوں کو ہندو مت

نے جذب کر لیا۔ آج مہایان فرقہ چین، جاپان اور تبت میں پایا جاتا ہے اور ہنایان فرقہ برما اور لنکا میں۔

فنون لطیفہ لوگوں کی ذہنی کیفیت کا آئینہ ہوتے ہیں چنانچہ بودھ مت کے خیالات میں وہ سادگی باقی نہیں رہی جو ابتدائی دور میں تھی اور اس کی جگہ دقیق اور پیچیدہ اشاریت نے لے لی تو ہندوستان کا فنون لطیفہ بھی روز بروز زیادہ پیچیدہ اور پر تکلف ہو گیا۔ خاص کر گندھار دیس کی مہایان دور کی سنگتراشی تو تکلف اور آرائش بھری پڑی تھی۔ ہنایان دور کا فن تعمیر بھی اس نئے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ رفتہ رفتہ اس کی ابتدائی زمانے کا اعتدال اور سادگی بھی ختم ہو گئی اور اس نے بھی آرایشی تکلفات اور اشاریت کو اختیار کر لیا۔

اس زمانہ کی اب بہت کم یادگاریں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سب سے دلچسپ اجنتا کے وہ خوبصورت نقش و نگار اور تصویریں ہیں جو دیواروں کی استرکاری پر بنائے گئے ہیں

اب ہم کوشنوں سے رخصت ہوتے ہیں۔ لیکن ایک چیز یاد رکھنا وہ یہ کہ ساکا اور دوسرے ترکی قبیلوں کی طرح کوشن لوگ بھی نہ تو غیر بن کر ہندوستان آئے اور نہ انھوں نے اس طرح اس پر حکومت کی جیسے کوئی مفتوحہ علاقہ پر کرتا ہے۔ وہ ہندوستان اور اس کے باشندوں کے ساتھ مذہب کے رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ طرز حکومت میں بھی انھوں نے ہندوستان کے قدیم آریوں کی پیروی کی۔ اور چونکہ وہ بڑی حد تک آریوں کے نظام میں کھپ گئے تھے۔ اس لئے شمالی ہند پر تین سو برس تک حکومت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

(۳۱)

حضرت عیسیٰ اور عیسائی مذہب

۲۱ اپریل ۳۲ء

ہندوستان کے شمال و مغرب کی کوشن سلطنت اور چین کے ہان خاندان کا تذکرہ کرتے کرتے ہم تاریخ کے ایک نہایت اہم واقعہ کو چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ اس لئے ہمیں پلٹ جانا چاہئے۔ اب تک ہم نے زمانہ قبل مسیح (یعنی B. C) کا تذکرہ کیا تھا۔ اب ہم حضرت عیسیٰ کے بعد کے زمانے (یعنی A D یا A. C) میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ سنہ جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی مفروضہ تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ دراصل گمان غالب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اس مفروضہ تاریخ سے چار سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے لیکن اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ عام طور پر حضرت عیسیٰ کے بعد کے زمانے کو A. D سے تعبیر کرتے ہیں یہ لاطینی الفاظ (Anno Domini) کے پہلے حروف ہیں۔ ان الفاظ کے معنی ہیں "خداوند کا سال" اس قدیم رواج کی پیروی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن مجھے A. C کے حروف استعمال کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس طرح B. C کے حروف الفاظ (Before Christ) کے مخفف ہیں، اسی طرح A. C کے حروف، الفاظ (After Christ) کے مخفف ہیں بہر حال میں A. C ہی استعمال کروں گا۔

مسیح کا نام عیسیٰ تھا ان کا قصہ انجیل میں درج ہے اور تم اس

سے کچھ نہ کچھ واقف ہوگی اس میں ان کی جوانی کا کوئی ذکر نہیں ہے، صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ناصرہ میں پیدا ہوئے، گلیلی میں انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور تیس برس کی عمر میں بیت المقدس آئے۔ یہاں آتے ہی رومی گورنر پانٹیس پائلٹ کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں سزا کا حکم سنایا گیا مگر نہیں معلوم کہ اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کرنے سے پہلے وہ کہاں کہاں گئے اور کیا کرتے رہے۔ تمام وسطی ایشیا میں یعنی کشمیر، لداخ، تبت بلکہ اس سے بھی آگے تک لوگوں کو یہ کامل یقین ہے کہ حضرت عیسٰی یہاں آئے تھے۔ بعض کا یہ خیال بھی ہے کہ وہ ہندوستان تک آئے تھے لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا بلکہ اکثر عالموں کی جنھوں نے حضرت عیسٰی کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے یہ قطعی رائے ہے کہ وہ ہندوستان یا وسطی ایشیا تک نہیں گئے۔ لیکن ان کا جانا کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں خاص کر شمال و مغرب کی ٹکسیلا یونیورسٹی میں دور دور سے طالب علم آتے تھے ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسٰی بھی علم کی تلاش میں یہاں آئے ہوں بہت سی صورتوں میں حضرت عیسٰی کی تعلیم گوتم بودھ کی تعلیم سے ملتی جلتی ہے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ انھیں اس کا پورا علم ہو لیکن ان کے ہندوستان آنے کے ثبوت میں یہ دلیل کافی نہیں ہے کیونکہ بودھ مذہب سے اس وقت تک دوسرے ملکوں کے لوگ اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ حضرت عیسٰی کو ہندوستان آئے بغیر اس کے متعلق واقفیت ہو گئی ہو۔

اسکول کی ہر لڑکی بھی اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ مذہب ہمیشہ سخت لڑائی جھگڑوں کا باعث ہوا ہے لیکن دنیا کے مذہبوں کی ابتدا

کا مطالعہ کرنا اور ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ان کی تعلیم اور ان کا مقصد اتنا ملتا جلتا ہے کہ لوگوں کا جزوی اور غیر ضروری باتوں پر لڑنا حماقت معلوم ہوتا ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اصل تعلیم میں لوگ اتنی تحریف اور اضافے کر دیتے ہیں اور اس کی صورت کو اتنا مسخ کر دیتے ہیں کہ حقیقت کا امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہادی کے بعد رفتہ رفتہ اس کی جگہ تنگ نظر اور متعصب لوگ آجاتے ہیں۔ اکثر مذہب کو سیاست اور ملوکیت کے آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم رومی عوام میں خود توہمات پیدا کرتے تھے تاکہ انھیں خوب لوٹ سکیں کیونکہ جو لوگ توہم پرست ہوتے ہیں۔ انھیں دبانا اور غلام بنائے رکھنا آسان ہوتا ہے۔ رومی امراء خود تو اعلیٰ فلسفے کا دم بھرتے تھے۔ لیکن اسی چیز کو جسے وہ اپنے لئے اچھا سمجھتے تھے عوام کے لئے بُرا اور خطرناک جانتے تھے۔ بعد کے زمانے میں ایک مشہور اطالوی مصنف میکاولی (Machiavelli) گزرا ہے۔ اس نے سیاسیات پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ مذہب ہر حکومت کے لئے نہایت ضروری ہے اور ہر بادشاہ کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی نہ کسی ایسے مذہب کی ضرور تائید اور حمایت کرے جسے وہ جھوٹا سمجھتا ہو۔ موجودہ دور میں بھی ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ ملوکیت نے مذہب کی آڑ میں ترقی کی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر کارل مارکس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "مذہب عوام کے حق میں افیون ہے"۔

حضرت عیسیٰ یہودی تھے۔ اور یہودیوں میں ہر قسم کی سختیاں جھیلیں

کر زندہ رہنے کا عجیب وغریب مادہ ہے۔ داؤد اور سلیمان کے
وقت میں تو ان کا کچھ زمانہ شان وشوکت سے گزرا۔ اس کے بعد برے
دن آگئے۔ یہ شان وشوکت بھی بہت معمولی پیمانے کی تھی لیکن ان کے
تصوّر نے اسے آسمان تک پہنچا دیا۔ حتیٰ کہ وہ زمانہ ان کے لئے ماضی کا
زرین دور بن گیا۔ اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ ایک وقت مقررہ پر یہ پھر پلٹ
پلٹ کر آئے گا اور یہودی پھر عظمت وجلال کے مالک ہوں گے
وہ تمام رومی سلطنت میں اور دوسرے ملکوں میں پھیل گئے لیکن نہایت
متحد اور اس خیال میں مگن رہے۔ کہ ایک مسیح نازل ہونے والا ہے جو
ان کے کھوئے ہوئے عروج کو پھر واپس لائے گا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ
چیز ایک کرشمہ معلوم ہوتی ہے کہ یہودیوں کا نہ کوئی وطن تھا نہ پناہ کی جگہ
انھیں ہر جگہ حد سے زیادہ پریشان کیا گیا اور ستایا گیا حتیٰ کہ قتل بھی کیا گیا
لیکن اس کے باوجود وہ دو ہزار برس سے زیادہ سے اپنے جداگانہ وجود کو
قائم رکھے ہوئے ہیں اور آج بھی وہ نہایت متحد۔ دولت مند اور طاقتور ہیں۔

یہودیوں کو ایک مسیح کا انتظار تھا اور شاید ابتدا میں انھیں
حضرت عیسیٰ سے بہت کچھ امید رہی ہوگی۔ لیکن انھیں جلد ہی مایوسی
سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ نے موجودہ حالات اور
سماجی نظام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ خاص کر وہ امیروں اور
ریاکاروں کے سخت خلاف تھے جنھوں نے مذہب کو چند رسوم ومعمولات
کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ دولت اور عظمت کی امید دلانے کے بجائے انھوں نے
لوگوں سے الٹا یہ مطالبہ کیا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اسے بھی وہ ایک خیالی
آسمانی بادشاہت کی خاطر ترک کر دیں۔ وہ اپنی گفتگو میں عموماً تمثیلوں سے

سے کام لیتے تھے لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ پیدائشی مجاہد تھے جو ایک لمحے کے لئے موجودہ حالات کو گوارا نہ کر سکتے تھے! اور انھیں بدلنے پر تلے تھے۔ یہودیوں کا یہ مدعا نہیں تھا اس لئے وہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں رومی حکام کے حوالے کر دیا۔

مذہب کے معاملے میں رومیوں میں کافی رواداری موجود تھی اور حکومت نے تمام مذاہب کو آزادی دے رکھی تھی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص رومیوں کے دیوتاؤں کو برا بھلا بھی کہتا تو اسے کوئی سزا نہ دی جاتی تھی۔ چنانچہ اُن کا ایک بادشاہ ٹائبریس (Tiberius) کہتا تھا کہ "اگر کوئی دیوتاؤں کی بے ادبی کرتا ہے تو وہ خود اس سے نبٹ لیں"۔ غرض رومی گورنر (Pontius Pilate) کو جس کے سامنے حضرت عیسیٰ پیش ہوئے تھے ان کی تبلیغ کے مذہبی پہلو سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اصل بات یہ تھی رومی حضرت عیسیٰ کو سیاسی باغی اور یہودی انھیں سماجی باغی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں گول گوتھا کے مقام پر صلیب دے دی گئی۔ اس مصیبت کے وقت میں ان کے برگزیدہ حواریوں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس دغا کی وجہ سے حضرت عیسیٰ کی تکلیف ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ چنانچہ مرتے وقت یہ عجیب دردناک الفاظ ان کی زبان پر جاری تھے۔

"اے میرے خدا! اے میرے خدا!! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے"

حضرت عیسیٰ بالکل نوجوان تھے یعنی انتقال کے وقت ان کی عمر تیس برس سے کچھ زیادہ تھی۔ انجیل کے مؤثر الفاظ میں ان کی موت کا دردناک قصہ پڑھ کر ہمارا دل بھر آتا ہے۔ بعد کے زمانے میں جب

عیسائیت کو فروغ ہوا تو لاکھوں آدمی حضرت عیسیٰ کے نام کی عزت کرنے لگے چاہے ان کی تعلیم پر انھوں نے کبھی عمل نہ کیا ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب انھیں صلیب دی گئی۔ اس وقت فلسطین کے باہر بہت کم لوگ انھیں جانتے تھے۔ روم والوں کو ان کے متعلق کوئی علم نہ تھا اور خود گورنر (Pontius Pilate) نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی ہوگی۔

حضرت عیسیٰ کے خاص شاگرد اور پیرو خوف کے مارے اُن سے پھر گئے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ایک نیا شخص (Paul) نمودار ہوا جس نے حضرت عیسیٰ کو دیکھا بھی نہ تھا مگر عیسوی مذہب کے اصول جو کچھ اس کی سمجھ میں آئے، ان کی تبلیغ اس نے شروع کر دی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ پال نے جس عیسائیت کی تبلیغ کی وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے بہت مختلف تھی۔ پال بہت قابل اور عالم شخص تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی طرح سماج کے خلاف جہاد کرنے والا نہ تھا۔ بہرحال پال کامیاب ہوا اور عیسائیت رفتہ رفتہ پھیلنے لگی۔ شروع شروع میں یونانیوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی انھوں نے سمجھا کہ عیسائی بھی یہودیوں کا ایک فرقہ ہیں لیکن خود عیسائیوں نے جارحانہ طرز اختیار کی انھیں تمام دوسرے مذہبوں سے دشمنی تھی اور انھوں نے بادشاہ کی مورت کی پوجا کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ رومی اس ذہنیت پر حیران رہ گئے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تو بڑی تنگ نظری تھی اس لئے وہ عیسائیوں کو یہ سمجھنے لگے کہ یہ خبطی لوگ ہیں جو اپنی ضد اور جہالت کی وجہ سے انسانی ترقی کے مخالف ہیں یہ ممکن تھا کہ رومی دوسرے مذاہب کی طرح عیسائی مذہب کے ساتھ بھی رواداری برتتے لیکن جب عیسائیوں نے بادشاہ

کی مورت کی پوجا کرنے سے انکار کر دیا تو ان کا یہ فعل سیاسی بغاوت کا مرادف سمجھا گیا اور اس کی سزا موت قرار پائی۔ اس کے علاوہ عیسائیوں نے شمشیر زنی کے ان تماشوں پر بھی سخت اعتراض کیا جو اس زمانہ میں روم میں رائج تھے غرض اس کے بعد عیسائیوں پر مظالم شروع ہو گئے۔ ان کی جائدادیں ضبط ہوئیں اور وہ شیروں کے آگے ڈالے گئے۔ تم نے ان عیسائی شہیدوں کے قصے پڑھے ہوں گے اور شاید سینما میں ان کے فلم بھی دیکھے ہوں۔ لیکن یاد رکھو کہ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لئے اپنی جان نذر کرنے کو تیار ہو جائے اور ایسی موت پر فخر کرنے لگے تو اس کو دبانا یا اس کے مقصد کو مٹانا ناممکن ہو جاتا ہے چنانچہ رومی سلطنت عیسائیوں کو دبانے میں قطعاً ناکام ہوئی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ عیسائیت کو فتح ہوئی۔ کیونکہ چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں ایک رومی بادشاہ خود عیسائی ہو گیا اور عیسائیت حکومت کا سرکاری مذہب بن گئی۔ اس بادشاہ کا نام قسطنطین تھا جس نے شہر قسطنطنیہ آباد کیا۔ اس کا تذکرہ ہم بعد کو کریں گے

جب عیسائیت کو عروج حاصل ہوا تو حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے متعلق زبردست اختلاف چھڑ گیا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ کس طرح لوگوں نے گوتم بودھ کو دیوتا اور اوتار بنا لیا اور ان کی پوجا کرنے لگے حالانکہ انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ان کے اس قول کا کہ وہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے ہیں۔ لازمی طور پر یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خدا یا کوئی فوق البشر ہستی ہونے کا دعویٰ کیا تھا لیکن لوگوں کو تو اس کی عادت ہے کہ اپنے بڑے آدمیوں کو دیوتا بنا دیتے ہیں حالانکہ پھر ان کی پیروی نہیں کرتے اس کے چھ سو برس

بعد محمد رسول اللہ نے ایک دوسرے مذہب کی بنا ڈالی اور شاید ان مثالوں سے سبق حاصل کر کے نہایت صاف صاف اور بار بار اس کا اعلان کیا کہ وہ محض انسان ہیں، خدا ہرگز نہیں ہیں۔

غرض حضرت عیسیٰ کی تعلیم کو سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے کے بجائے عیسائیوں نے ان کی الوہیت اور تثلیث کے مسئلہ پر بحث مباحثہ کرنا اور لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا وہ ایک دوسرے کو بدعتی کہتے تھے۔ ان پر ظلم کرتے تھے اور ان کے گلے کاٹتے تھے ایک زمانہ میں تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں ایک لفظ کے تلفظ کے متعلق بہت سخت بحث جنگ وجدل ہوتی رہی۔ ایک فریق کا کہنا تھا کہ دعا میں "ہوموسین" (Homo—Osuion) کہنا چاہیئے اور دوسرا فریق کہتا تھا کہ" ہوموئی سین" (Homoi Ousion) کہنا چاہیئے۔ اس فرق کا حضرت عیسیٰ کی الوہیت پر اثر پڑتا تھا۔ چنانچہ اُس ذرا سے لفظی فرق کی بدولت بڑی خوفناک جنگ ہوئی اور سینکڑوں آدمی قتل ہوئے۔

یہ اندرونی اختلافات اس وقت پیدا ہوئے جب عیسائیت کو قوت حاصل ہوئی۔ مغرب میں تو ابھی کچھ عرصہ تک عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں یہ اختلافات جاری تھے۔

تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ عیسائی مذہب انگلستان یا مغربی یورپ سے پہلے ہندوستان آگیا تھا۔ یعنی اس وقت جب کہ روم میں لوگ اس سے نفرت کرتے تھے اور اسے ممنوع قرار دیدیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے انتقال کے کوئی سو برس کے اندر اندر عیسائی مبلغ سمندر کے راستہ سے جنوبی ہند میں آئے۔ یہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا اور انھیں اجازت دے

دی گئی کہ اپنے نئے مذہب کی تبلیغ کریں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنالیا۔ یہ لوگ زمانے کے نشیب و فراز دیکھتے ہوئے آج تک وہاں موجود ہیں۔ اِن میں سے اکثر تو ان قدیم عیسائی فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کا اب یورپ میں نام و نشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔ ان فرقوں میں سے بعض کا صدر مقام اب ایشائے کوچک میں ہے۔

آج عیسائیت سیاسی حیثیت سے سب سے مقتدر مذہب ہے کیونکہ یہ یورپ کے صاحب اقتدار لوگوں کا مذہب ہے لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ کہاں حضرت عیسیٰ عدم تشدد اور اہنسا کی تعلیم دیتے تھے اور سماجی نظام کے خلاف جہاد کی تلقین کرتے تھے اور کہاں یہ گلا پھاڑ پھاڑ کر ان کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے آج ملوکیت کے حامی ہیں۔ اسلحہ جات اور جنگ کے قائل ہیں اور دولت کے پرستار ہیں۔ ذرا ایک طرف پہاڑی وعظ پر غور کرو اور دوسری طرف یورپ اور امریکہ کی جدید عیسائیت پر نظر ڈالو؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!

پھر کیا تعجب ہے اگر بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آج مغرب کے نام نہاد پیروؤں کے مقابلہ میں باپولہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم سے قریب تر ہیں۔

لہ گاندھی جی

(۳۲)

سلطنت روم

۲۳ / اپریل ۱۹۳۲ء

میں نے تمہیں بہت دن سے خط نہیں لکھا ہے۔ مجھے الہ آباد کی اور خاص کر تمہاری دادی "ڈول اماں" کی خبروں نے بے چین اور پریشان کر رکھا تھا۔ مجھے اس بات پر غصہ آتا تھا کہ میں تو یہاں جیل میں آرام سے بیٹھا ہوں اور میری ضعیف اور کمزور ماں پولیس کی لاٹھیاں کھا رہی ہے مگر مجھے چاہیے کہ میں اپنے خیالات کو روکوں تاکہ اس قصہ میں جو میں بیان کر رہا ہوں خلل نہ پڑنے پائے۔

اب ہم پھر روم واپس چلتے ہیں جسے سنسکرت کی پرانی کتابوں میں رومکا لکھا گیا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے رومی جمہوریت کے ختم ہونے اور رومی سلطنت کی بنیاد پڑنے کا تذکرہ کیا تھا۔ جولیس سیزر کا متبنیٰ آکٹیوین پہلا بادشاہ ہوا اور اس نے آگسٹس سیزر کا لقب اختیار کیا وہ اپنے آپ کو بادشاہ نہیں کہتا تھا کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ اس خطاب کو اپنے سے فروتر سمجھتا تھا اور کچھ اس خیال سے کہ وہ جمہوریت کی ظاہری شکل برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے (**Imperator**) یعنی حکمراں یا فرماں روا کا خطاب اختیار کیا۔ چنانچہ یہ لفظ سب سے بڑا خطاب سمجھا جانے لگا اور شاید تمہیں معلوم ہو کہ انگریزی کا لفظ امپرر **Emperor** اسی سے نکلا ہے گویا روم کی سلطنت کے ابتدائی دور میں دو لفظوں کا

اضافہ ہوا۔ یعنی امپیرر اور سیزر (جس سے قیصر یا زار بھی نکلا ہے) دنیا کے قریب قریب تمام بادشاہ ان الفاظ کو اپنے لئے استعمال کرنے کی تمنا کرتے تھے شروع شروع میں تو یہ خیال تھا کہ دنیا میں ایک وقت میں صرف ایک ہی شہنشاہ ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کا مالک ہو۔ روم کو لوگ ملکۂ عالم کہتے تھے اور مغرب والے یہ سمجھتے تھے کہ ساری دنیا پر روم چھایا ہوا ہے ظاہر ہے کہ یہ خیال قطعاً غلط تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جغرافیہ اور تاریخ سے ناواقف تھے رومی سلطنت صرف بحر روم تک محدود تھی، مشرق میں مسوپوٹامیا سے آگے وہ کبھی نہ بڑھ سکی اور چین اور ہندوستان میں وقتاً فوقتاً اس سے زیادہ وسیع، طاقتور اور مہذب سلطنتیں گذری ہیں پھر بھی جہاں تک مغربی دنیا کا تعلق ہے۔ رومی سلطنت ہی واحد سلطنت تھی اس لئے قدیم قوموں کی نظر میں عالم گیر حیثیت رکھتی تھی اور اس کی زبردست دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

روم کے متعلق خاص بات جو قابل ذکر ہے وہ عالم گیر سلطنت کا تخیل، دنیا کی سرداری کا تخیل ہے۔ جب روم کا زوال ہوا اس وقت بھی اس خیال نے اس کا ساتھ دیا اور اسے تقویت بخشی۔ یہ اس وقت بھی باقی رہا جب اس کا روم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہاں تک کہ جب رومی سلطنت تباہ ہو گئی اور اس کا محض نام ہی نام رہ گیا اس کے بعد بھی یہ تخیل دنیا میں موجود رہا

روم اور اس کے جانشینوں کا حال بیان کرنا مجھے کسی قدر مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کون سی باتیں منتخب کر کے تمہیں سناؤں۔ وہ تصویریں جو میں نے پرانی کتابیں پڑھ پڑھ کر خصوصاً قید کے

زمانہ میں جمع کی ہیں بے ترتیبی سے میرے دماغ میں بھری ہوئی ہیں۔ روم کی ایک مشہور تاریخ تو شاید میں کبھی نہ پڑھ سکتا اگر قید نہ ہوا ہوتا۔ یہ کتاب اتنی بڑی ہے کہ دوسری مصروفیتوں کے ہوتے ہوئے اسے شروع سے آخر تک پڑھنے کا وقت نکالنا ناممکن ہے۔ اس کا نام ہے "رومی سلطنت کا زوال اور خاتمہ" اور یہ ایک انگریز مصنف گبن کی تصنیف ہے۔ کوئی ڈیڑھ سو برس گذرے کہ سوئزرلینڈ کی جھیل سیمان کے کنارے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ لیکن اب بھی اس کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے اور مجھے اس کا قصہ جو ذرا شاندار لیکن بڑی رسیلی زبان میں لکھا گیا ہے۔ ناول سے کہیں زیادہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دس سال ہوئے جب لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں، میں نے اسے پڑھا تھا۔ ایک مہینے سے کچھ زیادہ وقت میں نے گبن کی صحبت میں گذارا اور ماضی ان تصویروں کے مشاہدہ میں ڈوبا رہا جو اس نے الفاظ کے ذریعے کھینچی ہیں۔ لیکن اس کتاب کو ختم کرنے سے پہلے میں یکایک رہا کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر نہ مجھے اتنا وقت مل سکا اور نہ طبیعت اس طرف راغب ہوئی کہ قدیم روم اور قسطنطنیہ کی سیر کرتا اور سو صفحے کے قریب جو باقی بچ رہے تھے انھیں ختم کر لیتا۔

لیکن یہ کوئی دس برس پہلے کا ذکر ہے اب تو جو کچھ میں نے پڑھا تھا اس کا بیشتر حصہ بھول چکا ہوں۔ پھر بھی اتنا باقی رہ گیا ہے کہ دماغ کو پریشان کر دینے کے لئے کافی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ پریشان خیالات تم تک پہنچاؤں۔

اچھا آؤ پہلے ہم رومی سلطنت یا سلطنتوں کی تاریخ کا ایک خاکہ تیار کر لیں۔ پھر شاید ہم ان خاکوں میں کچھ رنگ بھرنے کی کوشش کر سکیں۔

رومی سلطنت اگسٹس سیزر سے شروع ہوتی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب عیسوی سنہ کا آغاز ہونے والا تھا۔ شروع شروع میں تو رومی بادشاہ سینٹ کا کچھ لحاظ کرتے رہے لیکن بہت جلد جمہوریت کے بچے کھچے آثار بھی ختم ہوگئے اور بادشاہ مختار کل، مطلق العنان حکمراں بلکہ قریب قریب دیوتا بن گیا۔ اس کی زندگی میں اس کی پرستش ایک اوتار کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس زمانہ کے مصنفوں نے ابتدائی بادشاہوں خصوصاً اگسٹس میں دنیا کی تمام خوبیاں گنادی ہیں، انھوں نے اگسٹس کے دور کو زرّین دور لکھا ہے جب کہ ہر طرف نیکی کا دور دورہ تھا۔ نیکوں کو ان کی نیکی کا انعام ملتا تھا اور بُرے اپنی سزا کو پہنچتے تھے۔ مطلق العنان حکومتوں کے تمام مصنفوں کا یہی حال ہے۔ کیونکہ وہاں بادشاہ کی مدح و ثنا کرنے میں نفع رہتا ہے۔ ورجل اوِوڈ۔ ہوریس جیسے مشہور لاطینی مصنف جن کی کتابیں ہمیں اسکول میں پڑھائی جاتی ہیں، اسی زمانہ میں گذرے ہیں۔ جمہوریت کے آخری زمانہ میں برابر خانہ جنگیوں اور مصیبتوں کا سامنا رہتا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ جب اس کے بعد امن وسکون قائم ہوا تجارت کو فروغ ہوا اور تہذیب کا کچھ چرچا ہوا تو لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا ہو اور اس وجہ سے انھوں نے اتنے مبالغہ سے کام لیا ہو۔ اور اس وجہ سے انھوں نے اتنے مبالغہ سے کام لیا ہو۔

لیکن یہ تہذیب کیسی تھی؟ امیروں کی تہذیب تھی اور وہ بھی صاحب ذوق اور ذہن، قدیم یونانی امرا کی سی تہذیب نہیں بلکہ ایک معمولی کوڑھ مغز جماعت کی تہذیب تھی جس کو عیش و عشرت کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ان کے لئے ساری دُنیا سے کھانے پینے اور عیش و عشرت کا سامان آتا تھا اور شان و شوکت اور نمود و نمائش کے سارے سامان مہیا تھے۔ اس قسم کے لوگوں سے

آج بھی دنیا خالی نہیں ہے! غرض وہاں بڑی شان و شوکت کے مظاہرے ہوتے تھے۔ زرق برق جلوس نکلتے تھے۔ سرکسوں میں تماشے ہوتے تھے اور شمشیر زن غلام لوگوں کی تفریح کی خاطر مارے جاتے تھے۔ لیکن اس شان و شوکت کے پیچھے کیا تھا۔ عوام مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ ٹیکس بہت بھاری تھا جو زیادہ تر انھیں کو ادا کرنا پڑتا تھا اور محنت مشقت کا بوجھ بے شمار غلاموں کے سر تھا۔ حتیٰ کہ طب اور فلسفے اور علم و فکر کی تمام خدمت بھی امرار روم نے یونانی غلاموں کے لئے چھوڑ دی تھی! لوگوں کو تعلیم دینے کی یا اس دنیا کے حالات معلوم کرنے کی جس کا وہ اپنے آپ کو مالک کہتے تھے محض برائے نام کوشش کی جاتی تھی

بادشاہ پر بادشاہ ہوتے رہے۔ کچھ برے ہوئے کچھ بہت ہی برے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ فوج حاوی ہو گئی اور بادشاہ گر بن گئی۔ چنانچہ اب فوج کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آپس میں مقابلہ ہونے لگا۔ اور انھیں رشوت دینے کے لئے عوام سے یا مفتوحہ علاقوں سے روپیہ کھینچا جانے لگا آمدنی کا ایک خاص ذریعہ غلاموں کی تجارت تھی اور رومی فوجیں مشرق میں غلام پکڑنے کی باضابطہ اور منظم مہموں پر روانہ ہوتی تھیں۔ غلاموں کے تاجر فوجوں کے ساتھ جاتے تھے تاکہ موقع پر اچھے اچھے غلام خرید لیں۔ جزیرہ ڈیلوس جو قدیم یونانیوں کے نزدیک بہت مقدس تھا، غلاموں کی بہت بڑی منڈی بن گیا جہاں ایک ایک دن میں دس ہزار غلام تک فروخت ہوئے ہیں، روم کے عظیم الشان کلوسیم (Colosseum) میں ایک ہر دلعزیز بادشاہ نے ایک وقت میں بارہ ہزار شمشیر زنوں کا کھیل دکھایا ہے یعنی ان غلاموں کا جو بادشاہ اور عوام کی تفریح کی خاطر اپنی جان دینے کے لئے رکھے جاتے تھے۔

یہ تھی رومی تہذیب سلطنت کے زمانے میں۔ پھر بھی ہمارا دوست گبن

لکھتا ہے کہ "اگر کسی شخص سے پوچھا جائے کہ تاریخ عالم میں وہ کون سا زمانہ تھا جب بنی نوع انسان سب سے زیادہ مسرور اور خوش حال تھے تو وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ ڈومیشین کے انتقال سے لے کر کموڈس کی تخت نشینی تک کا زمانہ" یعنی ۹۶ء سے ۱۸۰ء تک کے ۸۴ سال۔ میرا خیال ہے کہ گبن نے باوجود اپنے علم وفضل کے ایسی بات کہہ دی ہے جس سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہوگا۔ وہ بنی انسان کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس سے ان کا مطلب صرف بحر روم کی دنیا سے تھا کیونکہ چین، ہندوستان یا قدیم مصر کا اسے کیا علم ہو سکتا تھا۔

شاید میں روم کے ساتھ کچھ زیادتی کر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ عرصہ کی خانہ جنگیوں کے بعد رومی سلطنت کے حدود کے اندر کسی حد تک امن و امان قائم ہو جانے سے لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا ہوگا اور یہ تبدیلی بہت خوشگوار معلوم ہوئی ہوگی۔ سرحد پر تو اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن سلطنت کے اندر کم از کم شروع زمانہ میں بالکل امن رہا جسے وہ لوگ "رومی امن" کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ امن کے ساتھ لازمی طور پر تجارت کو فروغ ہوا۔ اس کے علاوہ ساری رومی دنیا کو شہریت کا حق عطا کیا گیا لیکن یہ ملحوظ رہے کہ بے چارے غلاموں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا نیز یہ کہ بادشاہ حاکم مطلق تھا اور شہریوں کو بہت تھوڑے حقوق حاصل تھے۔ سیاست پر اظہار خیال کرنا۔ فرمانروا سے بغاوت کرنے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ طبقہ کے لئے کسی حد تک یکساں طرز حکومت اور ایک قانون تھا۔ اس کو ان لوگوں نے یقیناً ایک نعمت سمجھا ہوگا جو اس سے پہلے بدترین مطلق العنانی کا شکار رہے تھے۔

رفتہ رفتہ رومی بہت سست اور ناکارہ ہو گئے اور اس قابل بھی نہ رہے کہ خود اپنی فوجوں میں بھرتی ہو کر لڑ سکیں۔ گاؤں کے کسان اُس بوجھ سے دب کر جو ان کے کاندھوں پر لدا ہوا تھا غریب سے غریب تر ہو گئے اور شہر والوں کا بھی یہی حشر ہوا لیکن بادشاہ شہر والوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے کہ وہ کوئی فساد نہ کھڑا کر دیں۔ اس خیال سے روم کے باشندوں کو مفت روٹی دی جاتی تھی اور سرکسوں میں ان کی تفریح کا سامان بھی مفت مہیا کیا جاتا تھا۔ اس طرح انھیں بہلایا جاتا تھا۔ لیکن یہ لنگر معدودے چند مقامات پر جاری ہو سکتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ مصر وغیرہ دوسرے ملکوں کے غلاموں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ کیونکہ آٹا انہی کو مفت دینا پڑتا تھا۔

چونکہ رومی آسانی سے فوج میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے باہر کے لوگ جو "وحشی" کہلاتے تھے بھرتی کئے جانے لگے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ رومی فوجیں انہی لوگوں سے بھر گئیں جو روم کے "وحشی" دشمن کہلاتے تھے۔ سرحد پر یہ "وحشی" قومیں رومیوں کو برابر دبائے رہتی تھیں۔ پھر جیسے جیسے روم کمزور ہوا یہ وحشی زیادہ طاقتور اور جری ہوتے گئے۔ خاص کر مشرق میں خطرہ زیادہ بڑھ گیا اور چونکہ یہ سرحد روم سے بہت دور تھی اس لئے اس کی حفاظت کرنا بڑا مشکل تھا۔ اسی وجہ سے آگسٹس سیزر کے تین سو برس بعد بادشاہ قسطنطین نے ایک زبردست قدم اٹھایا۔ جس سے آگے چل کر بہت اہم نتائج رونما ہوئے۔ اس نے اپنا صدر مقام روم سے مشرق کو منتقل کر دیا اور بحر روم اور بحر اسود کے درمیان باسفورس کے کنارے، قدیم شہر بیزنیٹم کے قریب ایک نیا شہر آباد کیا جس

کا نام اس نے اپنے نام پر قسطنطنیہ رکھا۔ اُسے نیا روم بھی کہتے تھے۔
اب یہ شہر رومی سلطنت کا صدر مقام بن گیا۔ آج بھی ایشیا کے اکثر
حصّوں میں قسطنطنیہ کو روم ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۴۲)

سلطنت روم دو ٹکڑے ہو گئی

۲۴ اپریل ۱۹۳۲ء

آج بھی ہم سلطنت روم کی سیر کریں گے۔ چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں (یعنی ۳۲۶ء میں) قسطنطین نے قدیم شہر بازن ٹیم کے قریب قسطنطنیہ کو آباد کیا اور اپنی سلطنت کا صدر مقام پرانے روم سے منتقل کر کے باسفورس کے کنارے نئے روم میں لے گیا۔ ذرا نقشہ پر ایک نظر ڈالو۔ تم دیکھو گی کہ یہ نیا شہر قسطنطنیہ یورپ کے آخری کنارے پر واقع ہے اور سامنے زبردست ایشیا نظر آرہا ہے۔ گویا دونوں براعظموں کے درمیان یہ ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑے بڑے بری اور بحری تجارتی راستے یہاں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ شہر آباد کرنے اور صدر مقام بنانے کے لئے واقعی یہ نہایت موزوں جگہ تھی۔ قسطنطین کا انتخاب نہایت اچھا تھا لیکن اس کو اور اس کے جانشینوں کو صدر مقام کی اس تبدیلی کا خمیازہ بھگتنا پڑا کیونکہ جیسے پرانا صدر مقام روم ایشیائے کوچک اور مشرق سے کچھ دور پڑتا تھا اسی طرح یہ نیا مشرقی صدر مقام گال اور برطانیہ وغیرہ مغربی ممالک سے دور تھا۔

اس مشکل کا حل یوں کیا گیا کہ کچھ عرصہ تک دو بادشاہ ہوتے رہے ایک روم میں رہتا تھا اور دوسرا قسطنطنیہ میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی یعنی مغربی سلطنت اور مشرقی سلطنت۔ لیکن

مغربی سلطنت جس کا صدر مقام روم تھا اس صدمے کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکی۔ یہ ان لوگوں کی مدافعت نہیں کر سکتی تھی۔ جنھیں یہ "وحشی" کہتی تھی، چنانچہ ایک جرمن قوم گوتھ نے روم پر حملہ کیا اور اسے خوب لوٹا۔ اس کے بعد ونڈال اور ہن کے حملے ہوئے۔ بالآخر مغربی سلطنت بالکل تباہ ہو گئی۔ تم نے اکثر ہن کا لفظ استعمال ہوتے ہوئے سُنا ہوگا۔ پچھلی جنگ عظیم میں انگریز یہ لفظ جرمنوں کے لئے استعمال کرتے تھے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ بڑے ظالم اور وحشی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں قریب قریب ہر ایک بدحواس ہو جاتا ہے اور تہذیب واخلاق کے جو سبق اس نے سیکھے ہیں۔ بھول جاتا ہے اور ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ جرمنوں نے بھی یہی کیا اور انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ گویا ان دونوں میں اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔

غرض لفظ ہن سخت مذمت کا لفظ بن گیا ہے۔ اور لفظ ونڈال کا بھی یہی حال ہے۔ غالباً یہ ہن اور ونڈال بہت اکھڑ اور ظالم قسم کے لوگ تھے اور انھوں نے بہت کچھ خرابی ڈھائی تھی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کے تمام حالات کے راوی ان کے دشمن رومی ہیں اور ان سے غیر جانب داری کی توقع کرنا عبث ہے۔ بہر حال گوتھ اور ونڈال اور ہن قوم نے مغربی سلطنت روم کو اس طرح گرا دیا جیسے کوئی گھروندے کو توڑ پھینکتا ہے۔ اس آسانی سے ان کے کامیاب ہو جانے کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ رومی کسانوں کی حالت اس زمانہ میں بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ ان پر ٹیکس اتنا زبردست تھا اور وہ اتنے زیادہ مقروض

تھے کہ وہ ہر تبدیلی کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج ہمارے غریب ہندوستانی کسان اپنے موجودہ افلاس اور مصیبت کی وجہ سے ہر انقلاب کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔

بہر حال مغربی رومی سلطنت کا اس طرح خاتمہ ہوگیا اگرچہ چند صدی بعد وہ ایک دوسری شکل میں پھر ابھری۔ لیکن مشرقی سلطنت عرصہ تک جاری رہی اگرچہ ہن وغیرہ کا مقابلہ کرنے میں اس کے بھی دانت کھٹے ہوگئے۔ پھر بھی وہ نہ صرف ان حملوں کو جھیل گئی بلکہ عربوں اور ترکوں سے مسلسل جنگ کرنے کے باوجود صدیوں تک قائم رہی۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ گیارہ سو برس تک باقی رہی اور کہیں ۱۴۵۳ء میں ختم ہوئی۔ جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے اب تک جسے پانچ سو برس کا عرصہ ہونے آتا ہے، قسطنطنیہ یا استنبول (یہ ترکوں کا رکھا ہوا نام ہے) ترکوں ہی کے قبضہ میں ہے۔ یہاں سے انھوں نے برابر یورپ پر حملے کئے اور وائنا تک پہنچ گئے۔ بعد میں رفتہ رفتہ یہ مقامات ان کے قبضے سے نکل گئے اور ابھی کوئی بارہ برس ہوئے کہ جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد قسطنطنیہ سے بھی انھیں ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اس پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا اور ترکی سلطان ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھے لیکن ایک زبردست قائد، مصطفےٰ کمال پاشا، اس مصیبت کے وقت میں اپنے ملک کو بچانے کے لئے اٹھے اور بڑی جانبازانہ جدوجہد کے بعد کامیاب ہوئے۔ اب ترکی میں جمہوری حکومت ہے اور سلطان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا ہے۔ کمال پاشا اس جمہوریت کے صدر ہیں۔ قسطنطنیہ جو پہلے مشرقی رومیوں کے زمانہ میں، اس کے بعد ترکوں کے زمانہ میں، ڈیڑھ ہزار برس تک سلطنت

کا صدر مقام رہا اگرچہ اب بھی ترکی سلطنت میں شامل ہے لیکن اس کا صدر مقام نہیں ہے۔ ترکوں نے اس کے شاہانہ اثرات سے علیحدہ رہنا ہی مناسب سمجھا اور دور ایشیائے کوچک میں انگورا (یا انقرہ) کو اپنا صدر مقام بنایا۔

ہم نے دو ہزار برس کا عرصہ آندھی کی طرح طے کر ڈالا اور ان واقعات سے بڑی تیزی کے ساتھ گذر گئے جو قسطنطنیہ کے آباد ہونے اور رومی سلطنت کے تبدیل ہونے کے بعد پے در پے ہوتے رہے۔ یہ تو خیر ہوا لیکن قسطنطین نے ایک اور نئی بات کی۔ وہ عیسائی ہو گیا اور چونکہ وہ بادشاہ تھا اس لئے عیسائیت لازمی طور پر سلطنت کا سرکاری مذہب بن گئی۔ عیسائی مذہب کی حیثیت میں یہ کایا پلٹ ایک عجیب و غریب چیز رہی ہوگی۔ یعنی کہاں تو یہ مذہب مورد عتاب اور کہاں یکایک شاہی مذہب ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک اس تبدیلی سے عیسائیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ مختلف فرقوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ یعنی لاطینی فرقہ اور یونانی فرقہ۔ لاطینی فرقہ کا مرکز روم تھا اور روم کا بشپ اس کا پیشوا مانا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہی پاپائے روم ہو گیا۔ یونانی فرقہ کا مرکز قسطنطنیہ تھا۔ لاطینی فرقہ تمام شمالی اور مغربی یورپ میں پھیل گیا اور اس کا نام رومن کیتھولک چرچ پڑا۔ یونانی فرقہ جو قدیم عقائد کا نہایت سختی سے پابند تھا۔ آرتھوڈاکس چرچ کہلانے لگا۔ مشرقی رومی سلطنت کے زوال کے بعد اس کٹر یونانی فرقے کو خاص طور پر روس میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ لیکن جب سے وہاں اشتراکیت کا زور ہوا ہے، اس فرقہ کی کیا کسی مذہبی فرقہ کی بھی کوئی سرکاری حیثیت

نہیں رہی ہے۔

میں مشرقی رومی سلطنت کا تذکرہ کر رہا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے روم سے کوئی تعلق نہ تھا حتیٰ کہ اس نے لاطینی زبان بھی ترک کر دی تھی اور اس کے بجائے یونانی زبان اختیار کر لی تھی۔ گویا ایک طرح سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ سکندر کی یونانی سلطنت کا تتمہ تھی۔ مغربی یورپ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر بھی ایک عرصہ تک وہ مغربی ملکوں کو اپنا ماتحت سمجھتی رہی اور یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئی کہ انھیں آزاد اور خود مختار ہونے کا حق ہے۔ روم سے اس بے تعلقی کے باوجود مشرقی سلطنت نے "رومی" لقب کو نہ چھوڑا اور اس کے باشندے بھی رومی کہلاتے رہے۔ جیسے اس لفظ میں کوئی جادو کا اثر ہو۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ شہر روم سلطنت کا صدر مقام نہیں رہا لیکن اس سے اس کے وقار میں کوئی کمی نہیں آئی حتیٰ کہ ان وحشیوں نے بھی جو اسے فتح کرنے آئے تھے بہت پس و پیش کے بعد اس پر حملہ کیا لیکن بڑے احترام سے پیش آئے۔ دیکھا۔ بڑے نام میں یہ جادو ہوتا ہے اور عقیدے میں یہ قوت ہوتی ہے۔

جب یہ سلطنت روم کے ہاتھ سے نکل گئی تو اس نے ایک نئی لیکن بالکل دوسرے قسم کی سلطنت کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ کے شاگرد پطرس روم آئے تھے اور یہاں کے پہلے بشپ ہوئے تھے۔ چنانچہ اس وجہ سے روم اکثر عیسائیوں کی نظر میں مقدس ہو گیا۔ اور روم کے بشپ کے عہدہ کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ شروع شروع میں روم کا بشپ بھی دوسرے بشپوں ہی کی طرح تھا لیکن جب شہنشاہ قسطنطنیہ چلا گیا تو رفتہ رفتہ اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اب منصب میں اس سے

برقرار رہا۔ اور پطرس کا جانشین ہونے کی حیثیت سے وہ تمام بشپوں کا سردار سمجھا جانے لگا۔ بعد کو اسے پوپ کا خطاب ملا۔ تمہیں معلوم ہے کہ پوپ آج بھی موجود ہیں۔ اور رومن کیتھولک فرقے کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ رومی فرقے اور یونانی فرقے کے درمیان اختلاف کی خاص وجہ مورتوں کا استعمال تھا۔ رومی فرقہ اپنے پیشواؤں اور خاص کر حضرت عیسیٰ کی ماں مریم کی مورتوں کی پوجا کا حامی تھا اور کٹر یونانی فرقہ اس کا سخت مخالف تھا۔

عرصہ تک روم پر شمالی قوموں کے سرداروں کا قبضہ اور حکومت رہی۔ لیکن اکثر وہ بھی قسطنطنیہ کے شہنشاہ کی سرداری کو تسلیم کرتے رہے۔ اس درمیان میں روم کے بشپ کی قوت بڑھتی گئی حتیٰ کہ اسے قسطنطنیہ سے سرکشی کرنے کی ہمت ہو گئی۔ چنانچہ جب مورتوں کی پوجا کے مسئلہ پر جھگڑا چھڑا تو پوپ نے روم کو مشرق سے بالکل علیحدہ کر لیا۔ اس عرصہ میں اور بہت سے واقعات ہو گئے جن کا ہم بعد میں تذکرہ کریں گے۔ مثلاً عرب میں ایک نیا مذہب اسلام پیدا ہوا اور عرب لوگ تمام شمالی افریقہ اور اسپین پر چھا گئے اور یورپ کے قلب پر حملہ آور ہونے لگے۔ اس کے علاوہ شمالی اور مغربی یورپ میں نئی نئی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں اور عرب لوگ مشرقی رومی سلطنت پر بڑے زور شور سے حملے کر رہے تھے۔

پوپ نے شمال کی ایک جرمن قوم فرنیکس کے سردار سے مدد مانگی۔ اور بعد کو اس سردار کارل یا چارلس کو روم کی گدی پر بٹھا دیا گیا اور اسے بادشاہ بنا دیا گیا۔ یہ بالکل نئی سلطنت تھی۔ لیکن اس کا نام بھی انھوں نے رومی سلطنت رکھا جسے بعد میں "مقدس رومی سلطنت" کہنے لگے۔

دراصل ان کے نزدیک صرف وہی سلطنت، سلطنت ہو سکتی ہے جو رومی ہو۔ اس کے بغیر کوئی سلطنت، سلطنت نہیں سمجھی جاتی تھی، اگرچہ شارلیمین جو چارلیس اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ روم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی وہ "امپراطور" قیصر اور اگسٹس بن گیا۔ یہ نئی سلطنت قدیم سلطنت کا تتمہ سمجھی جاتی تھی لیکن اس کے نام کے ساتھ ایک لفظ کا اور اضافہ ہوا۔ یہ "مقدس" بھی بن گئی۔ مقدس اس لئے کہ یہ بالخصوص عیسائی سلطنت تھی۔ جس کا ہیرو پوپ تھا۔

پھر دیکھو۔ یہ عقائد کی عجیب قوت کا کرشمہ تھا کہ ایک فرینک یا جرمن جو وسطی یورپ کا رہنے والا تھا رومی شہنشاہ بن گیا۔ اس مقدس سلطنت کی آئندہ تاریخ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ یہ سلطنت تو گیا اس کی پرچھائیں تھی۔ قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت تو برابر قائم رہی لیکن یہ مغربی سلطنت کبھی بدلی کبھی بگڑی۔ کبھی پھر بن گئی۔ سچ پوچھو تو یہ سلطنت کا بھوت تھا جو رومی نام کی دھاک اور عیسائی مذہب کی بدولت محض برائے نام زندہ تھا، گویا یہ ایک خیالی سلطنت تھی جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جہاں تک میرا خیال ہے والیٹر نے اس مقدس رومی سلطنت کی یہ تعریف کی ہے کہ نہ وہ مقدس تھی، نہ رومی تھی اور نہ سلطنت ہی تھی۔ اسی طرح کسی شخص نے ہندوستانی سول سروس کی بھی جو اب تک ہمارے سر پر سوار ہے۔ تعریف کی ہے۔ یعنی نہ یہ ہندوستانی ہے، نہ سول (مہذب) ہے اور نہ سروس (خدمتگذار) ہی ہے۔

خیر کچھ بھی سہی۔ لیکن یہ خیالی "مقدس رومی سلطنت" برائے

نام کم از کم ایک ہزار برس تک جاری رہی اور ابھی سو سال سے کچھ اوپر ہوئے کہ نپولین کے زمانے میں ختم ہوئی ہے۔ اس کا خاتمہ بھی کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہوا۔ بہت کم آدمیوں کو اس کا علم ہوا ہوگا کیونکہ حقیقت میں عرصہ سے اس کا وجود محض برائے نام تھا۔ بہرحال اس لاش کو دفن کر دیا گیا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں کیونکہ ایک بار پھر قیصر اور زار بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب کوئی چودہ برس ہوئے ہیں کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں یہ قیصر اور زار سب ختم کر دیئے گئے۔

(۳۴)

عالمگیر سلطنت کا تخیّل

۲۵ر اپریل ۳۲ء

یہ خط لکھ لکھ کر میں اکثر تمہیں پریشان کیا کرتا ہوں اور شاید تم کبھی اُکتا بھی جاتی ہو۔ خاص کر سلطنتِ روم کے متعلق میرے پچھلے دو خط تو بہت صبر آزما ثابت ہوئے ہوں گے۔ میں نے ہزاروں میل کا چکر کاٹا اور ہزاروں برس آگے پیچھے کا حال لکھ ڈالا۔ اس لئے اگر تمہارے دماغ میں کچھ الجھن پیدا ہو گئی ہو تو قصور سراسر میرا ہے۔ لیکن ہمت نہ ہارو۔ آگے بڑھی چلو۔ اگر کسی جگہ کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کی پروانہ کیا کرو۔ بلکہ آگے بڑھ جایا کرو۔ ان خطوں کا مطلب تمہیں تاریخ کا سبق دینا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جھلک دکھانا اور تمہارے اندر شوق اور جستجو کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔

سلطنت روم کے تذکرے سے تم تھک گئی ہو گی۔ کم از کم میں تو اُکتا گیا ہوں۔ لیکن آج اس کا تھوڑا سا ذکر اور کر لیں۔ پھر کچھ عرصے کے لئے اسے ملتوی کر دیں گے۔

تمہیں معلوم ہے کہ آج کل قوم پرستی اور وطن پرستی کا بہت چرچا ہے۔ ہندوستان میں آج ہم میں سے بہت سے لوگ سخت قوم پرست ہیں یہ قوم پرستی تاریخ میں بالکل نئی چیز ہے۔ اور شاید آگے چل کر انہی خطوں میں ہم اس کی نشو و نما اور ترقی کا مطالعہ کریں۔ رومی سلطنت کے زمانے میں اس قسم کے جذبہ کا وجود نہ تھا۔ اس سلطنت کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ

ایک عالم گیر سلطنت ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسی کوئی سلطنت یا حکومت نہیں گذری ہے۔ جس کی حکومت ساری دُنیا پر رہی ہو۔ مگر جغرافیہ کی ناواقفیت آمد و رفت کی مشکلات اور دور و دراز کی مسافت کی وجہ سے پرانے زمانے کے لوگ اسی خیال میں تھے کہ واقعی اس عالمگیر سلطنت کا وجود ہے۔ چنانچہ یورپ اور بحر روم کے قرب و جوار میں روم کی ریاست کو سلطنت بننے سے پہلے بھی عام حکومتوں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ باقی سب ریاستیں ماتحت ہیں۔ روم کی اتنی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ ایشیائے کوچک کی یونانی ریاست پیرگمم (Pergamum) اور مصر وغیرہ کو ان کے بادشاہوں نے بیچ پچ اپنی خوشی رومیوں کی اطاعت منظور کر لی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ روم حد سے زیادہ طاقتور ہے اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس کے باوجود بحر روم کے آس پاس کے ملکوں کے علاوہ نہ جمہوریت کے زمانے میں روم کی کسی اور ملک پر حکومت تھی اور نہ سلطنت کے زمانہ میں شمالی یورپ کے "وحشیوں" نے کبھی روم کی اطاعت قبول نہیں کی اور اس نے بھی ان کی کچھ زیادہ پروا نہ کی۔ بہر حال روم کا حلقۂ اختیار کتنا ہی سہی لیکن اسے اپنی عالمگیر سلطنت کا یقین تھا اور اُس زمانہ کی مغربی دنیا بھی اسے تسلیم کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رومی سلطنت ایک عرصہ تک قائم رہی حتیٰ کہ اس کی شہرت اور اُس کا وقار اس وقت بھی باقی رہا جب وہ محض برائے نام تھی۔

اسی عالمگیر سلطنت کا تخیل جس کی ساری دنیا پر حکمرانی ہو محض روم کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پرانے زمانے میں چین اور ہندوستان میں بھی یہ خیال ملتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اکثر چینی سلطنت رومی سلطنت

سے زیادہ وسیع رہی ہے۔ وہ بحر اخضر تک پھیلی ہوئی تھی۔ چین کا بادشاہ "آسمانی فرزند" کہلاتا تھا اور چینی لوگ اسے عالمگیر شہنشاہ تصور کرتے تھے یہ صحیح ہے کہ بعض قبیلے اور قومیں اکثر سرکشی کرتی رہتی تھیں اور بادشاہ کا حکم نہیں مانتی تھیں لیکن وہ بھی اسی طرح "وحشی" سمجھی جاتی تھیں جیسے روم والے شمالی یورپ کے لوگوں کو "وحشی" سمجھتے تھے۔

اسی طرح ہندوستان میں بھی شروع زمانے ہی سے عالمگیر بادشاہوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جنھیں چکرورتی راجہ کہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان والوں کی نظر میں دنیا بہت محدود تھی۔ ہندوستان خود اتنا بڑا ملک ہے کہ وہ اسی کو دنیا سمجھتے تھے اس لئے اگر سارے ہندوستان پر کسی کی حکومت ہو جاتی تھی تو وہ دنیا کی حکومت کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ باہر والے "وحشی" یا ہندوستان کی اصطلاح میں "ملچھ" کہلاتے تھے۔ راجہ بھرت جس کے نام پر ہمارے ملک کا نام بھارت ورش پڑا چکرورتی راجہ مانا گیا ہے اور مہابھارت کے قصے کے مطابق یدھشٹر اور اس کے بھائیوں نے بھی اسی عالمگیر حکومت کے لئے جنگ کی تھی۔ یہاں گھوڑے کی قربانی کی ایک شاہی رسم رائج تھی جسے اشوامیدھ کہتے تھے یہ بھی عالمگیر سلطنت کا دعوی اور اس کی علامت سمجھی جاتی تھی اشوک نے بھی عالمگیر سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن جنگ و جدال سے نفرت ہو جانے کی وجہ سے اس نے لشکر کشی بالکل ترک کر دی۔ بعد کے زمانے میں ہندوستان کے دوسرے ملوکیت پرست راجاؤں نے بھی اسی کی کوشش کی مثلاً گپتا خاندان کے راجہ وغیرہ۔

تم نے دیکھا کہ پرانے زمانے میں لوگوں کے ذہن میں اکثر عالمگیر بادشاہ اور عالمگیر سلطنت کا خیال رہتا تھا۔ اس کے بہت عرصے کے بعد پھر قوم پرستی

یا ایک نئی قسم کے سامراج کا ظہور ہوا۔ ان دونوں نے دنیا کو بہت تہ و بالا کیا۔ آج پھر ایک عالمگیر سلطنت کے تذکرے ہو رہے ہیں۔ لیکن اس سے کوئی عالمگیر بادشاہت یا عالمگیر بادشاہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک قسم کی ساری دنیا کی عالمگیر جمہوریت ہوگی جو ایک قوم کو دوسری قوم ایک طبقہ کو دوسرے طبقے کے لوٹنے سے باز رکھے گی۔ آیا اس قسم کی کوئی چیز مستقبل قریب میں ممکن بھی ہوگی یا نہیں۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ آج دنیا کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہے۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا۔

میں نے شمالی یورپ کے "وحشیوں" کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ میں وحشی کا لفظ اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ روم والے انھیں اسی نام سے مخاطب کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ وسطی ایشیا کی خانہ بدوش قوموں اور دوسرے قبیلوں کی طرح ہندوستان یا روم کے اپنے ہندوستانی یا رومی پڑوسیوں کے مقابلہ میں کم مہذب تھے لیکن ان میں جوش عمل زیادہ تھا۔ کیونکہ وہ کھلے میدانوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ عیسائی ہو گئے اور جب انھوں نے روم فتح کیا تو عموماً وہ ظالم دشمن کی حیثیت سے وہاں داخل نہیں ہوئے۔ شمالی یورپ کی موجودہ قومیں انھیں "وحشی" قبیلوں کی یعنی گوتھ فرینکس وغیرہ کی نسل سے ہیں۔

میں نے رومی بادشاہوں کے نام تمہیں نہیں بتائے۔ ان کا ایک بے شمار سلسلہ گزرا ہے اور معدودے چند کے سوا سب کے سب برے تھے بعض تو بدی کا مجسمہ تھے۔ تم نے نیرو کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ لیکن بہت سے اس سے بھی بُرے گذرے ہیں۔ ان میں سے ایک عورت آئرین بھی تھی جو اپنے بیٹے کو قتل کرکے خود تخت و تاج کی مالک بن بیٹھی۔ یہ

قسطنطنیہ کا واقعہ ہے۔

البتہ روم کا ایک بادشاہ سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔ اس کا نام مارکس آرلییس انٹونی نس تھا۔ وہ بڑا فلسفی گزرا ہے اور اس کی ایک تصنیف جس میں اس کے فکر و اجتہاد کے نتائج درج ہیں۔ پڑھنے کے قابل ہے لیکن مارکس آرلییس کا لڑکا اس کے بالکل برعکس تھا۔ روم نے شاید اس سے بڑا شیطان پیدا نہیں کیا۔

رومی سلطنت کے قیام کے بعد تین سو برس تک روم مغربی دنیا کا مرکز رہا۔ یہ بہت بڑا شہر ہو گا جس میں عالی شان عمارتیں ہوں گی اور سلطنت کے کونے کونے سے بلکہ غیر ملکوں سے لوگ یہاں آتے ہوں گے۔ کہا جاتا ہے کہ دور دور سے بے شمار جہاز ان کے لئے اچھے اچھے تحفے لاتے ہونگے مثلاً نایاب کھانے کی چیزیں اور طرح طرح کا قیمتی سامان، ہر سال ایک سو بیس جہازوں کا ایک بیڑا بحر قلزم کی مصری بندرگاہ سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوتا تھا یہ جہاز ٹھیک اس وقت روانہ ہوتے تھے جب مشرقی ہوائیں چلتی تھیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں اور جہاز چلانے میں مدد ملے۔ عموماً وہ جنوبی ہند کو جاتے تھے اور قیمتی سامان لاد کر پھر انہی موسمی ہواؤں کی مدد سے مصر واپس آتے تھے۔ مصر سے یہ سامان کچھ بری اور کچھ بحری راستہ سے روم بھیجا جاتا تھا۔

یہ تمام تجارت امیروں کے آرام اور فائدے کے لیے تھی چند آدمی تو عیش و آرام سے گذارتے تھے لیکن عوام مصیبت میں مبتلا تھے۔ تین سو برس تک روم کا مغرب میں سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب قسطنطنیہ آباد ہوا تو اس نے بھی اس اقتدار میں حصہ بٹا لیا لیکن یہ بڑے

تعجب کی بات ہے کہ یونان نے تو مختصر سی مدت میں علم کے میدان میں بڑی بڑی چیزیں پیش کر دیں لیکن روم کوئی خاص چیزیں پیش نہ کر سکا۔ سچ پوچھو تو رومی تہذیب بھی یونانی تہذیب کا ایک دھندلا سا عکس معلوم ہوتی ہے۔ البتہ ایک چیز میں رومیوں نے خاص پیش قدمی اور رہنمائی کی یعنی قانون کے معاملے میں۔ اب بھی ہم لوگوں کو رومی قانون پڑھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے قانون کا بڑا حصہ اسی پر مبنی سمجھا جاتا تھا۔

اکثر سلطنت برطانیہ کا سلطنت روم سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ عموماً انگریز اپنا دل خوش کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں، یوں تو ساری سلطنتیں کم و بیش یکساں ہوتی ہیں، وہ دوسروں کو لوٹ کر پھلتی ہیں لیکن رومیوں اور انگریزوں میں ایک خاص مناسبت ہے یعنی یہ عجیب بات ہے کہ دونوں تخیل کے معاملے میں کورے رہے ہیں۔ رومیوں کی طرح انگریز بھی عشرت پسند اور خود پسند ہیں۔ اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ دنیا ان کے آرام اور فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے وہ بے کھٹکے زندگی کے مزے لوٹتے ہیں۔ ہم ان سے لڑ رہے ہیں۔

(۳۵)

پارتھیا اور ساسانی

۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء

اچھا اب سلطنت روم اور یورپ کا قصّہ تو چھوڑ دو اور چلو ذرا دنیا کے دوسرے حصوں کی سیر کریں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ ایشیا میں کیا ہو رہا تھا اور ہندوستان اور چین کا قصہ آگے بیان کرنا ہے۔ اب تاریخ کے مطلع پر نئے نئے ملک نمودار ہوئے۔ اس لئے ہمیں ان کا بھی کچھ تذکرہ کرنا ہے سچ تو یہ ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے۔ اتنے ملکوں کا حال بیان کرنا ہوگا کہ ممکن ہے میں گھبرا کر اس خیال ہی کو ترک کر بیٹھوں۔

میں نے اپنے ایک پچھلے خط میں لکھا تھا کہ پارتھیا میں جنگ کارہای (Carrhae) کے موقع پر رومی جمہوریت کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی تھی لیکن اس وقت میں نے یہ نہیں تبلایا تھا کہ پارتھی کون تھے اور ایران اور عراق میں انھوں نے کس طرح ایک ریاست قائم کرلی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ سکندر کے بعد اس کا سپہ سالار سلوکس اور اس کی اولاد عرصہ تک اس سلطنت پر حکومت کرتی رہی جو ہندوستان سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی تین سو برس تک ان کا دور دورہ رہا۔ لیکن اس کے بعد وسطی ایشیا کی ایک قوم پارتھی نے انھیں نکال باہر کر دیا۔ یہ لوگ ایران میں جو اس زمانہ میں پارتھیا کہلاتے تھے رہتے تھے۔ انہی لوگوں نے رومیوں کو جمہوریت کے آخری دور میں

شکست دی تھی، پھر بادشاہت قائم ہونے کے بعد بھی رومی کبھی اُن کا پوری طرح قلع قمع نہ کر سکے، غرض یہ لوگ ڈھائی سو برس تک پارتھیا پر حکمرانی کرتے رہے حتیٰ کہ ایک اندرونی انقلاب نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ایرانیوں نے ان پردیسی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی اور ان کی جگہ خود اپنی قوم اور مذہب کے ایک شخص کو بادشاہ بنایا۔ اس کا نام اردشیر اول تھا۔ ایک نسل ساسانی خاندان کے نام سے مشہور رہے۔ اردشیر بڑا پکا زرتشتی تھا اور دوسرے مذہبوں کے ساتھ ذرا بھی رواداری کا برتاؤ نہیں کرتا تھا۔ یہ تو تمہیں علم ہوگا کہ پارسی بھی اسی زرتشتی مذہب کے پیرو ہیں۔ ساسانی رومیوں سے ہمیشہ برسرپیکار رہے یہاں تک ایک مرتبہ انھوں نے ایک رومی بادشاہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ بارہا ایرانی فوجیں قسطنطنیہ کے قریب تک پہنچ گئیں۔ اور ایک دفعہ انھوں نے مصر فتح کر لیا۔ ساسانی حکومت زرتشتی مذہب کی پرجوش حمایت کے لئے خاص طور پر مشہور رہے۔ جب ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے ساسانی حکومت اور اس کے سرکاری مذہب دونوں کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ زرتشتی مذہب کے بہت سے پیروؤں نے اس انقلاب اور دار و گیر کے خوف سے اپنے وطن ہی کو خیرباد کہہ دیا اور ہندوستان چلے آئے۔ ہندوستان جس طرح اپنی پناہ میں آنے والوں کا خیر مقدم کرتا رہا ہے۔ اسی طرح ان کا بھی اُس نے کھلے دل سے خیر مقدم کیا، ہندوستان کے موجودہ پارسی انہی زرتشتیوں کی نسل سے ہیں۔

مختلف مذاہب سے رواداری برتنے کے معاملے میں اگر ہندوستان کا دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اکثر ملکوں میں، خاص کر یورپ میں، جو لوگ سرکاری مذہب کو تسلیم نہیں کرتے

تھے۔ ان پر طرح طرح کا جبر و تشدد کیا جاتا تھا۔ اس کی مثالیں قریب قریب ہر جگہ ملتی ہیں لیکن ہندوستان میں پرانے زمانے میں تمام مذاہب کے ساتھ پوری رواداری برتی جاتی تھی۔ ہندو دھرم اور بدھ مت میں جو تھوڑی سی کشمکش ہوئی وہ مغرب کے مختلف مذاہب کے خوفناک تصادم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس چیز کو اس لئے ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ بدقسمتی سے آج کل ہندوستان میں آئے دن مذہبی اور فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور جو لوگ تاریخ سے ناواقف ہیں ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ تمام موجودہ جھگڑے حال کی پیداوار ہیں۔ ظہور اسلام کے بعد سیکڑوں برس تک مسلمان ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ نہایت امن و عافیت کے ساتھ رہا کئے۔ جب وہ تاجروں کی حیثیت سے آئے تو اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور یہاں بسنے کے لئے انھیں سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ لیکن یہ تو میں نے بہت آگے کی بات چھیڑ دی۔

ہاں۔ تو ہندوستانیوں نے پارسیوں کا خیر مقدم کیا۔ اس سے چند صدی پہلے انھوں نے یہودیوں کا بھی اسی طرح خیر مقدم کیا تھا جب کہ وہ جبر و تشدد سے عاجز آ کر پہلی صدی عیسوی میں روم بھاگے تھے۔

جس زمانہ میں ایران میں ساسانیوں کی حکومت تھی اسی زمانہ میں شام کے ریگستانی علاقہ میں پال میرا کی چھوٹی سی ریاست بڑے عروج پر تھی لیکن اس کا یہ عروج تھوڑے ہی دن رہا۔ شام کے ریگستان کے عین وسط میں پال میرا کا یہ علاقہ بہت بڑی تجارتی منڈی تھا۔ آج بھی اس کے کچھ آثار باقی ہیں جن سے اس کی عظیم الشان عمارتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک وقت میں زنوبیہ

نامی ایک خاتون یہاں برسرِ حکومت تھی لیکن رومیوں نے اسے شکست دی اور زنوبیاان کی مردانگی دیکھو کہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر اسے روم لے گئے

عیسوی سنہ کے شروع میں شام بڑی سرسبز جگہ تھی۔ انجیل کے نئے عہد نامے میں اس کا حال درج ہے۔ اگرچہ یہاں حکومت کی بدنظمی اور مظالم کی کمی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود بڑے بڑے شہر موجود تھے۔ آبادی بہت گنجان تھی۔ بڑی بڑی نہریں بہتی تھیں اور تجارت وسیع پیمانے پر تھی۔ لیکن مسلسل جنگ اور بدنظمیوں نے چھ سو برس کے اندر اندر اُسے ویران کر دیا۔ وہ عظیم الشان شہر برباد ہو گئے اور تمام پرانی عمارتیں مسمار ہو گئیں

اگر تم ہوائی جہاز پر ہندوستان سے یورپ کو جاؤ تو پالی میرا بعلبک کے ان آثار قدیمہ پر سے گزرو گی۔ اس کے علاوہ بابل بھی تمہیں نظر آئے گا اور بہت سے دوسرے مقامات بھی دکھائی دیں گے جو کسی زمانہ میں تاریخ میں مشہور رہتے لیکن اب ان کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

(۳۶)

جنوبی ہند کی نوآبادیاں

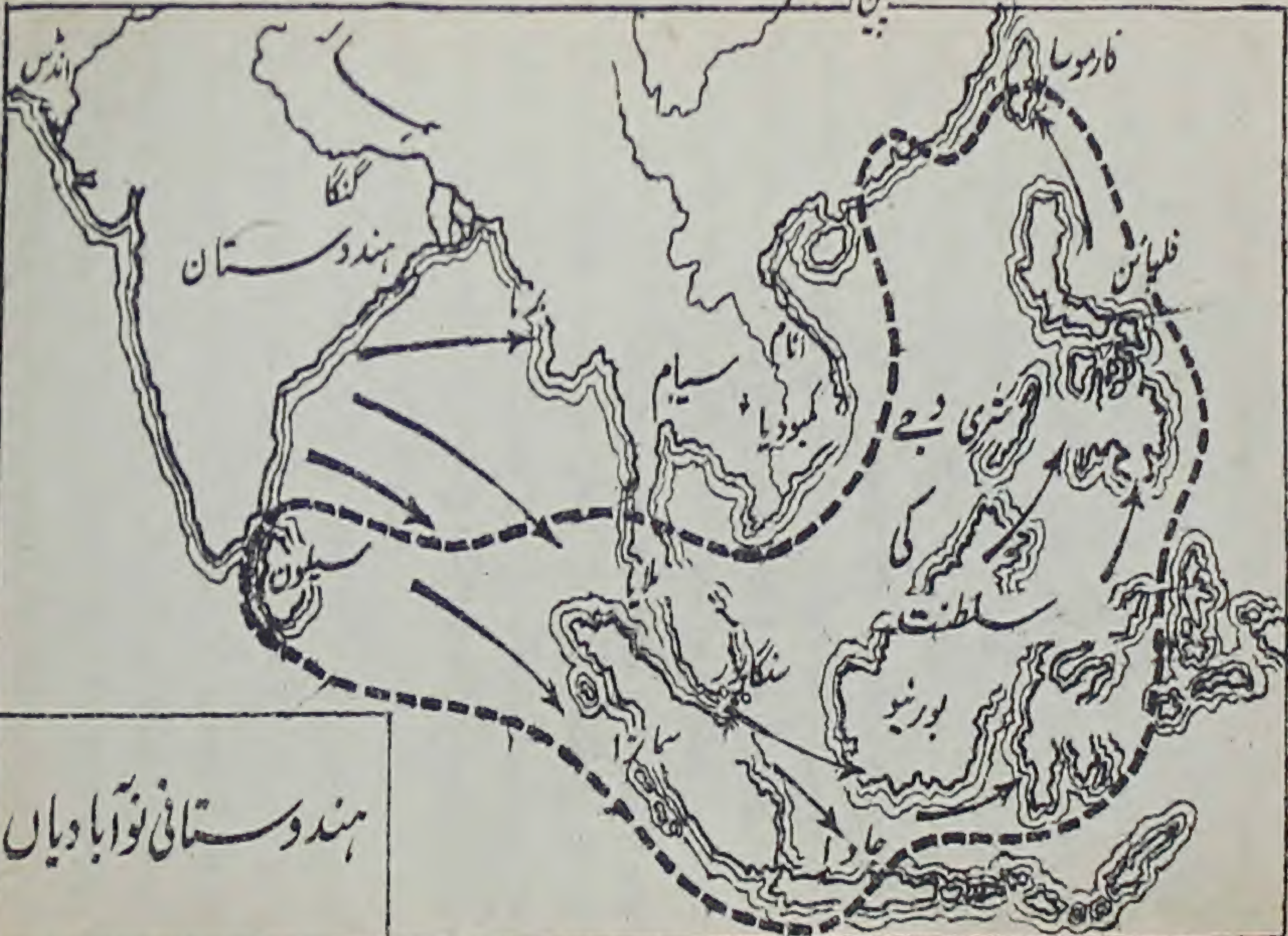
۲۸ اپریل ۱۹۳۲ء

ہم بہت دُور دُور ہو آئے۔ اب ہندوستان واپس چلیں اور دیکھیں کہ ہمارے بزرگ یہاں کس رنگ میں تھے۔ تمہیں کوشنوں کی سرحدی سلطنت کا یعنی اس عظیم الشان بودھ سلطنت کا تو خیال ہوگا جس میں تمام شمالی ہند اور وسطی ایشیا کا کچھ حصہ شامل تھا اور جس کی راجدھانی پرش پورہ یا پشاور رہی تھی۔ تمہیں شاید یہ بھی یاد ہوگا کہ اسی زمانہ میں جنوبی ہند میں سلطنت آندھرا کے نام سے ایک بڑی ریاست قائم تھی جو بحر عرب سے خلیج بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی تین سو برس تک کوشنوں اور آندھراؤں کا دور دورہ رہا۔ تیسری صدی عیسوی کے وسط میں یہ دونوں سلطنتیں ختم ہوگئیں اور پھر کچھ عرصہ تک ہندوستان میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہیں لیکن اس کے سو برس کے اندر اندر پاٹلی پتر میں ایک دوسرا چندر گپت پیدا ہوا۔ اور اس نے جارحانہ ہندو سامراج کا دور شروع کیا۔ بہرحال گپتا خاندان کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنوبی ہند کی عظیم الشان مہموں پر ایک نظر ڈال لیں کیونکہ انہی کے ذریعہ ہندوستانی آرٹ اور ہندوستانی تہذیب مشرق کے دور دور کے جزیروں میں پہنچی

ہندوستان کی شکل تو تمہارے ذہن میں ہوگی۔ یہ ہمالیہ پہاڑ اور دو سمندروں کے بیچ میں واقع ہے۔ اور اس کا شمالی حصہ سمندر سے بہت

دُور ہے۔ پچھلے زمانہ میں اسے بری سرحد کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ کیونکہ اسی طرف سے دشمن اور حملہ آور یورش کیا کرتے تھے۔ لیکن مشرق و مغرب اور جنوب کی طرف بہت لمبا ساحل ہے اور دونوں طرف سے زمین کی چوڑائی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ کنیا کماری (یا کیپ کامورن) میں دونوں کنارے آکر مل جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو سمندر کے قریب رہتے تھے۔ فطرتاً اس سے بہت وابستہ تھے اس لئے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ انھیں جہازرانی کا خوب ملکہ ہوگا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ قدیم زمانے سے مغرب کے ساتھ جنوبی ہند کا تجارت کا سلسلہ قائم تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر ہندوستان میں اُسی ابتدائی زمانہ سے جہاز سازی کی صنعت موجود ہو اور لوگ تجارت کی تلاش میں یا مہم جوئی کے سلسلہ میں سمندر پار جاتے ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک شخص وجے نے گوتم بدھ کے زمانہ کے لگ بھگ ہندوستان سے جاکر لنکا اُس نے فتح کیا۔ میرا خیال ہے کہ اجنتا کے غاروں میں کسی جگہ وجے کے سمندر عبور کرنے کا منظر پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ہاتھی گھوڑے جہازوں پر لدے ہوئے جا رہے ہیں۔ وجے نے اس جزیرہ کا نام "سنگل دیپ" رکھا تھا سنگھل لفظ سنگھ سے مشتق ہے جس کے معنی شیر کے ہیں۔ لنکا میں ایک شیر کا کوئی قصہ بھی مشہور ہے جو مجھے اس وقت یاد نہیں رہا۔ غالباً انگریزی لفظ سیلون اسی پرانے نام سنگھل سے نکلا ہے۔

جنوبی ہند سے لنکا تک جانا کوئی ایسا بڑا کارنامہ نہیں تھا لیکن اس کے علاوہ بھی ہمارے پاس بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ ہندوستانی جہاز سازی میں ماہر تھے اور ان بے شمار بندرگاہوں سے جو بنگال سے گجرات تک پھیلی ہوئی تھیں دور دور جایا کرتے تھے۔ چندرگپت موریہ



ہندوستانی نوآبادیاں

کے مشہور وزیر چانکیہ نے اپنی کتاب ارتھ شاستر میں اُس زمانہ کے بحری بیڑوں کا بھی کچھ تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کا ذکر میں ایک خط میں کر چکا ہوں جو میں نے نینی جیل سے تمہیں لکھا تھا اس کے علاوہ چندر گپت کے دربار کے یونانی سفیر میگس تھنیس نے بھی کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موریہ کے دور کے ابتدا ہی میں جہاز سازی کی صنعت ہندوستان میں فروغ پر تھی۔ ظاہر ہے کہ جہاز استعمال ہی کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں محض نمائش کے لئے تو بنائے نہیں جاتے۔ اس لئے یہ بھی یقینی ہے کہ بہت سے ہندوستانی ان میں بیٹھ کر سمندر پار بھی جاتے ہوں گے۔ ذرا اس مہم جوئی کا تصور کرو۔ پھر اس کے مقابلہ میں آج ہمارے اکثر بھائی سمندر میں قدم رکھنے سے کتنا ڈرتے ہیں اور اُسے مذہب کے خلاف بتاتے ہیں۔ واقعی یہ تفاوت دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور لطف بھی آتا ہے بھلا ہم ان لوگوں کو پچھلے زمانے والوں کا جانشین کیسے کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ لوگ ان سے کہیں زیادہ سمجھدار تھے۔ خیر یہ غنیمت ہے کہ اب یہ بیہودہ خیالات بہت کچھ مٹتے جارہے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو ان سے متاثر ہوں۔

شمالی ہند کے مقابلہ میں جنوبی ہند کی توقعات سمندر سے زیادہ وابستہ تھیں۔ کیونکہ بیرونی تجارت زیادہ تر جنوبی ہند سے تھی۔ تامل زبان کی نظمیں "یاون" کی شرابوں، برتنوں اور چراغوں کے ذکر سے بھری پڑی ہیں "یاون" کا لفظ خاص طور پر یونانیوں کے لئے اور شاید عام طور پر تمام پردیسیوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ دوسری اور تیسری صدی کے آندھرا کے سکّوں پر ایک بہت بڑے دو مستولوں والے جہاز کا نقشہ

بنا ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آندھرا کے پرانے لوگوں کو جہاز سازی اور بحری تجارت سے کتنا شغف تھا۔

بہر حال یہ جنوب ہی تھا جس نے اس زبردست کام میں سبقت کی اور مشرق کے تمام جزیروں میں ہندوستانی نوآبادیاں قائم کر دیں۔ یہ دھاوے پہلی صدی عیسوی ہی میں شروع ہو گئے تھے اور پھر سیکڑوں برس تک جاری رہے۔ ملایا۔ جاوا۔ سماترا۔ کمبوڈیہ اور بورنیو تک یہ لوگ پہنچے اور وہاں آباد ہو گئے اور اپنے ساتھ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی آرٹ بھی لے گئے۔ برما۔ سیام اور ہندی چین میں تو ہندوستانیوں کی بڑی بڑی نوآبادیاں قائم تھیں۔ اُنھوں نے اپنے اکثر شہروں اور بستیوں کے نام بھی ہندوستانی ناموں پر رکھے تھے۔ مثلاً اجودھیا۔ ہستناپور۔ ٹکسیلا۔ گندھار وغیرہ۔ دیکھو تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دُہراتی ہے۔ انیگلوسیکسنوں نے جب امریکہ میں نوآبادیاں قائم کیں تو انھوں نے بھی یہی صورت اختیار کی۔ آج بھی امریکہ میں قدیم انگریزی شہروں کے نام پر بہت سے شہر موجود ہیں یہاں تک امریکہ کے سب سے بڑے شہر نیویارک کا نام بھی شمالی انگلستان کے قدیم شہر یارک کے نام پر رکھا گیا ہے۔

تمام نوآبادیاں قائم کرنے والے اصلی باشندوں کے ساتھ زیادتیاں کرتے ہیں۔ اسی طرح ان ہندوستانیوں نے بھی یقیناً یہی غلط رویہ اختیار کیا ہوگا۔ انھوں نے ان جزیروں کے باشندوں کو لوٹا ہوگا اور ان پر حکومت جتائی ہوگی لیکن کچھ عرصہ بعد یہ نوآباد ہندوستانی اور وہاں کے پرانے باشندے خلط ملط ہو گئے ہوں گے کیونکہ ہندوستان

سے باقاعدہ تعلقات قائم رکھنا مشکل تھا۔ غرض ان مشرقی جزائر میں ہندو ریاستیں قائم ہوگئیں۔ اس کے بعد بودھ آئے اور ان دونوں میں اقتدار کے لئے خوب کشمکش رہی۔ یہ مقامات جو "ہند مزید" کہلاتے ہیں۔ ان کی تاریخ نہایت طویل اور دلچسپ ہے اور ان کے آثار قدیمہ کی عظمت سے پتہ چلتا ہے کہ کیسی کیسی عمارتیں اور مندر ان ہندوستانی نوآبادیوں کی رونق کو دوبالا کرتے ہوں گے۔ ہندوستانی معماروں اور کاریگروں نے بڑے بڑے شہر تعمیر کئے تھے۔ مثلاً کمبوجیہ۔ شری وجے، ماجاپاہت اور عظیم الشان رنگ کور وغیرہ۔

کوئی چودہ سو برس تک ان جزیروں میں ہندو اور بودھ ریاستیں قائم رہیں۔ ان میں حکومت کے لئے خوب لڑائیاں رہیں۔ کبھی ہندو برسر اقتدار ہوتے تھے اور کبھی بودھوں کی حکومت ہو جاتی تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر ڈالتے تھے۔ بالآخر پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہی پرتگالی اسپینی۔ ڈچ۔ انگریز اور سب سے آخر میں امریکہ والے پہنچے چینی تو قریب ہی تھے کبھی کبھی وہ بھی حملہ کر کے بعض مقامات فتح کر لیتے تھے لیکن اکثر ان کا برتاؤ دوستانہ ہوتا تھا اور دونوں ملک ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھیجا کرتے تھے لیکن چاہے وہ فاتح کی حیثیت سے ہوں یا دوست کی حیثیت سے ان علاقوں کے باشندوں پر ان کی تہذیب و تمدن کا ہمیشہ اثر پڑتا رہتا تھا۔

مشرق کی ان نوآبادیوں میں ہماری دلچسپی کا بہت کچھ سامان ملتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جنوبی ہند کی اُس

زمانہ کی ایک خاص حکومت نے ان نوآبادیوں کے قیام کا باضابطہ انتظام کیا تھا۔ شروع شروع میں تو نئے ملکوں کی جستجو کرنے والے انفرادی طور پر گئے ہوں گے۔ اس کے بعد تجارت شروع ہوئی ہوگی اور پھر بہت سے خاندان اور لوگوں کی جماعتیں اپنے طور پر گئی ہوں گی۔ کہتے ہیں کہ باہر جاکر آباد ہونے میں کالنگا (بہار) اور ہندوستان کے مشرقی ساحل کے لوگوں نے پیش قدمی کی۔ ممکن ہے بنگال کے کچھ لوگ بھی گئے ہوں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ جب شمالی ہند سے حملہ کرنے والوں نے گجرات والوں کو ان کے وطن سے نکالا تو یہ لوگ بھی ان جزیروں میں چلے گئے تھے۔ لیکن یہ بعض قیاسات ہیں۔ ہجرت کرنے والوں کی زیادہ تعداد پلّو دیس سے گئی۔ یہ جگہ تامل علاقہ کے جنوب میں تھی۔ جہاں پلو خاندان کی حکومت تھی۔ اور یہی وہ حکومت تھی جس نے ملا ایشیا میں نوآبادیاں قائم کرنے کا باضابطہ اہتمام کیا۔ ممکن ہے شمال کی طرف سے یہاں لوگ چلے آرہے ہوں اور وہاں گنجائش نہ رہنے کی وجہ سے انھیں دوسری طرف کا رُخ کرنا پڑا ہو۔ بہرحال وجہ کچھ بھی سہی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان سے دور، منتشر مقامات میں بالقصد اور بیک وقت نوآبادیاں قائم کی گئیں۔ یہ نوآبادیا ہندی چین۔ جزیرہ نمائے ملایا۔ بورنیو۔ سماترا۔ جاوا اور دوسرے مقامات پر قائم ہوئیں۔ یہ سب پلّو لوگوں کی نوآبادیاں تھیں جن کے نام بھی ہندوستانی تھے ہندی چین کی نوآبادی کا نام کمبوجیہ تھا جو اب تک کمبوڈیہ کے نام سے مشہور ہے۔ خیال تو کیجئے کہ یہ نام کہاں سے کہاں پہنچا! گندھار دیس کی وادی کابل میں ایک مقام کمبوجہ تھا۔ اسی کے نام پر یہ نام رکھا گیا تھا۔

کوئی چار پانچ سو برس تک یہ نو آبادیاں ہندو دھرم کی پیرو رہیں اس کے بعد ہر جگہ بدھ مت پھیل گئی۔ اس کے بعد اسلام پہنچا۔ چنانچہ ملا ایشیار کا کچھ حصہ تو مسلمان ہو گیا اور کچھ بدھ مت کا پیرو رہا۔

ملا ایشیار میں سلطنتوں پر سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ لیکن جنوبی ہند کی نو آبادیاں قائم کرنے کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے اس حصہ میں ہندی آریہ تہذیب پھیل گئی۔ چنانچہ آج ملا ایشیار کے باشندے بھی کسی حد تک اسی تہذیب کے وارث ہیں۔ ان کے یہاں دوسرے اثرات بھی کارفرما تھے۔ مثلاً چینی تہذیب کے اثرات۔ لیکن ملا ایشیار کے مختلف ملکوں میں ہندوستانی اور چینی تہذیبوں کا اختلاط کافی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ بعض ملکوں پر ہندوستانی اثر حاوی ہے اور بعض پر چینی۔ مثلاً برما۔ سیام اور ہندی چین کے خاص علاقہ میں چینی اثر زیادہ ہے اور ملایا میں ہندوستانی اثر۔ جاوا۔ سماترا۔ اور دوسرے جزیروں میں اگرچہ ہندوستانی اثر نمایاں ہے۔ لیکن اس پر اسلام کا ہلکا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

ہندوستانی اور چینی تہذیبوں میں کوئی ٹکر نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں پھر بھی وہ بغیر کسی دقت کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ ہندوستان ہندو دھرم اور بودھ مت دونوں کا سرچشمہ تھا۔ چین تک نے مذہب ہندوستان ہی سے لیا۔ آرٹ میں بھی ہندوستانی اثر حاوی تھا۔ یہاں تک کہ ہندی چین میں جو چین کے زیر اثر تھا عمارتیں بالکل ہندوستانی طرز کی ہوتی تھیں چین کا اثر ان ملکوں پر طرز حکومت اور زندگی کے عام فلسفے پر زیادہ پڑا یہی وجہ ہے کہ آج ہندی چین۔ برما اور سیام کے باشندے ہندوستانیوں

کے مقابلہ میں چینیوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی رگوں میں منگولی خون بھی زیادہ ہے جس کی وجہ سے وہ چینیوں سے زیادہ ملتے جلتے ہیں۔

جاوا کے شہر بورو بودر میں اب بھی ان عظیم الشان بودھ مندروں کے آثار موجود ہیں جو ہندوستانی معماروں نے تعمیر کئے تھے۔ ان عمارتوں کی دیواروں پر بودھ کی زندگی کی پوری کہانی تصویروں میں پیش کی گئی ہے۔ یہ چیزیں نہ صرف بودھ کی بلکہ اس زمانہ کے ہندوستانی آرٹ کی بے مثل یادگار ہیں۔

ہندوستانی تہذیب کا اثر ان مقامات سے آگے بھی گیا۔ یعنی فلپائن اور فارموسا تک پہنچا جو کچھ عرصہ تک سماترا کی شری وجے ہندو سلطنت میں شامل رہے تھے۔ اس کے بہت دن بعد فلپائن پر اسپینیوں کی حکومت ہو گئی اور اب امریکہ کا قبضہ ہے منیلا فلپائن کا دارالحکومت ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، وہاں مجلس آئین ساز کا ایک نیا ایوان تعمیر ہوا تھا۔ اس کے رُو کار پر چار تصویریں کندہ کی گئی ہیں جو گویا فلپائن کی تہذیب و تمدن کے چار سرچشموں کی مظہر ہیں۔ ایک تو قدیم ہندوستان کے مشہور مقنن منو کی ہے۔ دوسری چینی فلسفی لاؤ سی کی تیسری انیگلو سیکسن قانون و انصاف کی اور چوتھی اسپین سے متعلق ہے۔

۳۷

گپتا دور میں ہندو سامراج

جس زمانے میں جنوبی ہند کے باشندے سمندر پار کے دھاوے کر رہے تھے اور دور دراز مقامات پر اپنی نوآبادیاں اور شہر قایم کر رہے تھے۔ شمالی ہند میں عجب انتشار تھا۔ کوشن سلطنت کی قوت و عظمت ختم ہو چکی تھی اور اس کا حلقہ اثر روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ شمالی ہند میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں جن پر اُن ساکا، سیھتی یا ترکی قبیلوں کی نسل حکمراں تھی جو شمال و مغربی سرحد کی طرف سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ بودھ تھے اور ہندوستان پر دشمن کی طرح حملہ آور نہیں ہوئے تھے بلکہ یہاں آباد ہونے کے لئے آئے تھے۔ وسطی ایشیا کے دوسرے قبیلوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا تھا اور یہ دوسرے قبیلے بھی چین سے نہیں بیٹھنے پاتے تھے بلکہ اکثر چینی حکومت ان کو نکال باہر کرتی تھی ہندوستان آکر ان لوگوں نے عموماً ہندی آریہ رسم و رواج اور روایات اختیار کر لیں اور اسی رنگ میں رنگ گئے۔ وہ مہذب اور تہذیب و تمدن کے معاملہ میں ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ کوشن بھی بڑی حد تک ہندی آریہ روایات کے پیرو تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے عرصہ تک یہاں ٹھہر سکے اور ہندوستان کے بیشتر حصہ پر ان کی حکومت ہو گئی۔ وہ یہاں

بالکل ہندی آریہ بن کر رہے۔ کیونکہ یہ خواہش تھی کہ ہندوستان والے انھیں غیر نہ سمجھیں۔ اس معاملہ میں کسی حد تک انھیں کامیابی بھی ہوئی لیکن ہندوستانیوں کے ذہن سے یہ خیال پورے طور پر نہ مٹ سکا کہ وہ پردیسی اور غیر ہیں۔ خصوصاً چھتریوں کے دل میں یہ بات کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی کہ غیر ان پر حکمراں ہیں وہ اس غلامی پر پیچ وتاب کھاتے تھے۔ چنانچہ یہ آگ برابر دہکتی رہی۔ اور لوگوں کے دماغ میں ایک خلش موجود رہی۔ آخر کاران دل برداشتہ لوگوں کو ایک لائق رہنما مل گیا اور اس کے جھنڈے کے نیچے انھوں نے آریہ ورت کو آزاد کرانے کے لئے "مقدس جنگ" شروع کر دی۔

اس رہنما کا نام چندر گپت تھا۔ اسے وہ چندر گپت نہ سمجھ لینا جو اشوک کا دادا تھا۔ جس شخص کا ہم اب ذکر رہے ہیں اسے موریہ خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اتفاق دیکھو کہ وہ بھی پاٹلی پتر کا ایک چھوٹا سا راجہ تھا۔ لیکن اشوک کی نسل کا اس وقت نام ونشان بھی نہ رہا تھا۔ یاد رہے کہ اب ہم چوتھی صدی عیسوی کے شروع کا یعنی ۳۲۰ء کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ اس وقت اشوک کو مرے ہوئے ۵۳۴ برس گذر چکے ہیں۔

چندر گپت بڑا قابل اور حوصلہ مند شخص تھا۔ اس نے پہلے شمالی ہند کے دوسرے آریہ راجاؤں کو ملانا شروع کیا۔ اور ان کا ایک قسم کا وفاق سا بنالیا۔ اسی سلسلہ میں اس نے لچھوی قوم کی ایک لڑکی کمار دیوی سے شادی کی۔ اور اس طرح اس مشہور اور طاقتور قوم کی حمایت بھی حاصل کرلی۔ نہایت ہوشیاری سے پوری تیاری کرنے کے بعد

چندر گپت نے ہندوستان کے پردیسی حاکموں کے خلاف "مقدس جنگ" کا اعلان کر دیا۔ چھتری لوگ اور آریہ رئیس اس جنگ کے پشت پناہ تھے کیونکہ پردیسی حاکموں نے تمام قوت و اقتدار سے انھیں محروم کر دیا تھا۔ بارہ برس کی جنگ کے بعد چندر گپت نے شمالی ہند کے کچھ حصہ پر جس میں موجودہ صوبجات متحدہ بھی شامل تھا قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ گدی پر بیٹھا اور اس نے مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔

اس طرح گپتا خاندان کی ابتدا ہوئی۔ یہ کوئی دو سو برس تک حکمراں رہا۔ اس کے بعد ہن قوم نے آکر اسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ گپتا خاندان کے زمانہ میں جارحانہ ہندو پرستی یا قوم پرستی کا ظہور ہوا۔ اُنھوں نے ترکی۔ پارسی اور دوسرے غیر آریہ پردیسی حاکموں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکا اور زبردستی نکال باہر کیا۔ یہاں ہمیں نسلی منافرت کارفرما نظر آتی ہے۔ ہندی آریہ روسار اپنی نجابت پر نازاں تھے۔ اور ان جنگلیوں یا ملیچھوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گپتا خاندان نے جن ہندی آریہ ریاستوں کو فتح کیا، ان کے ساتھ بہت نرمی کا سلوک کیا۔ لیکن غیر آریہ ریاستوں اور راجاؤں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں کی گئی۔

چندر گپت کا بیٹا سمُدر گپت اپنے باپ سے زیادہ جنگجو تھا۔ وہ نہایت اچھا سپہ سالار تھا۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے تمام ملک میں حتیٰ کہ جنوبی ہند میں بھی فتوحات شروع کر دیں۔ اس نے گپتا سلطنت کو اتنی وسعت دی کہ قریب قریب سارا ہندوستان اس کے زیر اثر ہو گیا۔ لیکن جنوب میں اس کی حکومت محض برائے نام تھی۔ شمال میں اس نے کوشنوں کو سندھ ندی کے پار تک ہٹا دیا تھا۔

تمہیں یہ معلوم کر کے خاص دلچسپی ہو گی کہ اس زمانہ کے ایک شاعر نے سمدر گپت کی فتوحات کو سنسکرت زبان میں نظم کیا تھا۔ یہ دوہے اشوک کی لاٹ پر جو اب الہ آباد میں ہے کندہ کر دئے گئے تھے۔

سمدر گپت کا بیٹا چندر گپت ثانی بھی جنگجو راجہ تھا۔ اس نے گجرات اور کاٹھیاوار کو فتح کیا جو بہت زمانہ سے ساکا یا ترکی قوم کے زیر حکومت تھے اس نے بکرما جیت کا لقب اختیار کیا اور وہ اسی نام سے عام طور پر مشہور ہے۔ سیزر کی طرح یہ لقب بھی بہت سے راجاؤں کا ہوا ہے۔ اس لئے اکثر گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔

تم نے دہلی میں قطب مینار کے پاس لوہے کی ایک بہت بڑی لاٹ تو دیکھی ہو گی۔ کہتے ہیں کہ یہ لاٹ اپنی فتح کی یادگار میں بکرما جیت نے بنوائی تھی۔ یہ کاریگری کا نہایت عمدہ نمونہ ہے اور اس کے سرے پر کنول کا ایک پھول بنا ہے جو اس زمانہ کا شاہی نشان تھا۔

گپتا دور ہندوستان میں ہندو سامراج کا دور گذرا ہے۔ اس زمانہ میں قدیم آریہ تہذیب و تمدن اور علم و ادب کو از سر نو زندہ کیا گیا۔ ہندوستانی معاشرت اور تہذیب و تمدن میں یونانی اور منگولی اثرات کی جو یونانیوں اور کوشنوں وغیرہ کے ذریعہ یہاں پہنچے تھے۔ کوئی ہمت افزائی نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہندی آریہ روایات پر غیر معمولی زور دے کر انھیں بالقصد دبایا جاتا تھا۔ سرکاری زبان سنسکرت تھی لیکن اس زمانہ میں بھی یہ عام لوگوں کی بولی نہیں تھی۔ لوگ عموماً ایک قسم کی پراکرت بولتے تھے جو سنسکرت سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی اگرچہ سنسکرت اس وقت عام زبان نہ تھی۔ پھر بھی ایک زندہ

زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ سنسکرت میں نظم اور تمثیل نگاری نیز تمام آریہ فنون لطیفہ خوب پھل پھول رہے تھے۔ سنسکرت ادب کی تاریخ میں اس زمانہ کے بعد جب کہ وید اور مہابھارت وغیرہ تصنیف ہوئیں یہ زمانہ شاید سب سے بہتر تھا۔ کالی داس جیسا عجیب و غریب مصنف اسی زمانہ میں گذرا ہے۔ افسوس کہ ہم میں سے بہت سے لوگ جن میں میں بھی شامل ہوں اچھی طرح سنسکرت نہیں جانتے اس لئے اپنی اس میراث سے جو علم وادب سے مالا مال ہے۔ قطعاً محروم ہیں۔ کاش تم اس قابل ہو کہ اس سے فائدہ اٹھا سکو۔

بکرماجیت کا دربار نہایت مرصع تھا۔ اس میں اس نے بڑے بڑے مصنف اور ماہرین علم و فن جمع کئے تھے۔ تم نے اس کے دربار کے نورتن کا تذکرہ تو سنا ہوگا۔ کالیداس کا شمار بھی انہی نورتن میں ہوتا ہے۔

سمدرگپتا نے اپنی راجدھانی پاٹلی پتر سے اجودھیا کو بدل دی شاید اس نے یہ خیال کیا کہ اس کے جارحانہ ہندی آریہ نظریہ کی تکمیل کے لئے اجودھیا زیادہ موزوں مقام ہے کیونکہ اس سے رام چندر کی وہ داستان وابستہ ہے جو والمیک کے رزم نامے کی وجہ سے غیر فانی ہو گئی ہے۔

گپتا خاندان کے ہاتھوں آریہ ہندو تہذیب کے نئے سرے سے زندہ ہونے کا قدرتاً بودھ مت پر اچھا اثر نہیں پڑا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس تحریک میں اشرافیت کا رفرما تھی اور چھتری راجہ اس کے پشت پناہ تھے۔ بخلاف اس کے بدھ مت میں جمہوریت کا عنصر غالب تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ شمالی ہند کے گوشن اور دوسرے

پردیسی حکمراں بودھ مت کے مہایانہ فرقہ کے پیرو تھے۔ اس لئے ان پردیسی حکمرانوں کے ساتھ لوگوں کو ان کے مذہب سے بھی مخالفت تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ بودھ مت کے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی نہیں کی گئی بودھ خانقاہیں برابر جاری رہیں اور عظیم الشان تعلیمی اداروں کی حیثیت سے وہ اب بھی قائم رہیں۔ لنکا کے راجاؤں کے ساتھ جو بودھ مت کے پیرو تھے گپتا خاندان کے بادشاہوں کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے وہاں کے ایک راجہ میگھ ورن نے سمدر گپت کو نہایت بیش بہا تحائف بھیجے تھے۔ اور گیا میں لنکا کے طالب علموں کے لئے ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔

بہر حال ہندوستان میں بودھ مت کا خاتمہ ہو گیا۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کی وجہ حکومت وقت یا برہمنوں کا ناجائز دباؤ نہیں تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ہندو دھرم نے رفتہ رفتہ اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔

اسی زمانہ میں چین کا ایک مشہور سیاح ہندوستان آیا (ہیون سانگ نہیں جس کا تذکرہ میں کر چکا ہوں بلکہ فاہیان) وہ بودھ کی حیثیت سے بودھ مت کی مقدس کتابوں کی تلاش میں آیا تھا وہ لکھتا ہے کہ مگدھ کے باشندے خوشحال تھے۔ عدل و انصاف میں نرمی سے کام لیا جاتا تھا اور موت کی سزا تو تھی ہی نہیں۔ گیا ویران پڑا تھا۔ کپلاوستو میں جنگل کھڑا تھا۔ لیکن پاٹلی پتر کے باشندے امیر خوشحال اور نیک طینت تھے۔ بہت سی شاندار اور دولت مند بودھ خانقاہیں بھی موجود تھیں۔ سڑکوں کے کنارے کنارے دھرم شالے بنے

ہوئے تھے جن میں مسافر مفت ٹھہرتے تھے اور انھیں سرکاری خزانہ سے خوراک دی جاتی تھی۔ بڑے بڑے شہروں میں اسپتال بھی تھے جن میں مفت علاج ہوتا تھا۔

تمام ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد فاہیان لنکا چلا گیا اور دو سال وہاں رہا۔ لیکن اس کے ایک ساتھی ٹاؤچنگ کو ہندستان ایسا بھایا۔ اور وہ یہاں کے بودھ بھکشوؤں کے تقدس سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ یہیں رہ پڑا۔ فاہیان لنکا سے سمندر کے راستہ سے چین واپس ہوا۔ اور برسوں لاپتہ رہنے اور سینکڑوں حادثوں کا مقابلہ کرنے کے بعد کہیں گھر پہنچا۔

چندرگپت ثانی یعنی بکرماجیت نے ۲۳ برس تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کمار گپت ۴۰ برس تک راج کرتا رہا۔ پھر ۴۵۳ء میں سیکند گپت گدی پر بیٹھا۔ اسے ایک نئی آفت کا سامنا ہوا جس نے عظیم الشان گپتا سلطنت کی کمر توڑ دی۔ لیکن اس کی تفصیل میں اگلے خط میں بیان کروں گا۔

اجنٹا کی دیواروں کی تصویریں اور اس کے بڑے بڑے ہال اور چھوٹے چھوٹے کمرے گپتا دور کی صناعی کے نمونے ہیں۔ تم انھیں دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گی۔ افسوس کہ یہ نقش و نگار اب مٹتے جا رہے ہیں کیونکہ وہ موسمی اثرات کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔

جس زمانہ میں ہندوستان میں گپتا خاندان کا دور دورہ تھا اس وقت دنیا کے دوسرے حصوں میں کیا ہو رہا تھا؟ سنو۔ چندرگپت اول۔ رومی شہنشاہ، قسطنطین اعظم بانی قسطنطنیہ کا ہمعصر تھا۔ بعد کے گپتا

راجاؤں کے زمانے میں رومی سلطنت مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ۔ اور مغربی سلطنت کو آخرکار شمال کی جنگلی اقوام نے تباہ کر دیا تھا ۔ گویا جس زمانہ میں رومی سلطنت روبہ تنزل تھی ہندوستان میں ایک زبردست حکومت قائم تھی ۔ جس میں بڑے بڑے سپہ سالار اور بے شمار فوجیں موجود تھیں ۔ بعض لوگ سمدر گپت کو "ہندوستانی نپولین" کہتے ہیں ۔ مانا کہ وہ بہت اولوالعزم تھا لیکن فتوحات کے معاملہ میں اس نے ہندوستان کی سرحد سے باہر قدم نہیں رکھا ۔

گپتا دور جارحانہ ملوکیت اور فتوحات کا دور تھا ۔ ہر ملک کی تاریخ میں اس قسم کے سامراجی دور گزرا کرتے ہیں لیکن کچھ دن بعد ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی ۔ مگر گپتا دور اس وجہ سے ممتاز ہے اور ہندوستانی فخر کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں فنون لطیفہ اور ادب میں نئے سرے سے جان پڑ گئی تھی ۔

(۳۸)

ہن قوم کی آمد

۴ رمئی ۳۲ء

وہ نئی مصیبت جو ہندوستان پر شمالی و مغربی پہاڑوں سے نازل ہوئی ہن قوم کی یورش تھی۔ اپنے پچھلے کسی خط میں رومی سلطنت کا حال لکھتے ہوئے میں نے ہن قوم کا بھی تذکرہ کیا تھا یورپ میں ان کا سب سے بڑا قائد اٹیلا تھا جس نے برسوں تک روم اور قسطنطنیہ دونوں کو پریشان کیا۔ اسی قوم کی ایک شاخ سفید ہن کہلاتی تھی۔ یہ قوم قریب قریب اُسی زمانہ میں ہندوستان آئی۔ وہ بھی وسطی ایشیا کے خانہ بدوش تھے۔ عرصہ تک وہ ہندوستان کی سرحد پر منڈلاتے رہے اور آس پاس کے باشندوں کو سخت پریشان کرتے تھے۔ شاید دوسرے قبیلوں نے پیچھے انھیں بھگایا۔ اس لئے جب ان کی جمعیت زیادہ بڑھ گئی تو انھوں نے باضابطہ حملہ کر دیا۔

گپت خاندان کے پانچویں بادشاہ سکند گپت کو ہن قوم کے اس حملہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اس نے انھیں شکست دے کر پسپا کر دیا۔ لیکن کوئی بارہ برس بعد وہ پھر نمودار ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ گندھار کے علاقہ اور شمالی ہند کے بیشتر حصہ میں پھیل گئے انھوں نے بودھوں پر بہت ظلم توڑے اور ہر طرح کی دست درازیاں کیں۔ غالباً ان سے مسلسل جنگ رہی ہوگی پھر بھی گپتا راجہ ان کا

قلع قمع نہ کر سکے۔ ہنوں کے نئے قبیلے آئے اور رد وہ وسطی ہند تک پھیل گئے ان کے سردار تورمان نے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ وہ خود بھی بہت بُرا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا مہر اگل جو اس کے بعد گدی پر بیٹھا۔ سخت وحشی ظالم بلکہ پورا شیطان تھا۔ کلہانہ نے اپنی تاریخ کشمیر موسومہ راج ترنگنی میں لکھا ہے کہ مہر گل کی ایک۔ تفریح یہ تھی کہ وہ پہاڑ کی اونچی اونچی چوٹیوں سے ہاتھیوں کو کھڈ میں پھنکوا کر تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ آخر کار اس کے مظالم سے تنگ آ کر تمام آریہ ورت اس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور آریوں نے گپتا خاندان کے آخری راجہ بالادت اور وسطی ہند کے ایک راجہ یشودھرمن کی سرکردگی میں ہنوں کو شکست دی اور مہر گل کو قید کر لیا لیکن ہنوں کی طرح بالادت بزدل اور کمینہ نہ تھا اس نے مہر اگل کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ تم فوراً ہندوستان سے باہر نکل جاؤ۔ مہر گل نے کشمیر میں پناہ لی اور کچھ مدت بعد اس بالادت پر جس نے اس کے ساتھ اتنی فراخدلی کا برتاؤ کیا تھا۔ دغابازی سے حملہ کر دیا۔

بہر حال ہندوستان میں ہن قوم کی قوت بہت جلد ختم ہو گئی لیکن ان کی نسل یہاں باقی رہی اور رفتہ رفتہ آریوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئی۔ بہت ممکن ہے کہ وسطی ہند اور راجپوتانہ کے بعض راجپوت خاندانوں میں انہی سفید ہنوں کا کچھ خون موجود ہو۔

ہنوں نے شمالی ہند پر بہت تھوڑی مدت حکومت کی۔ یعنی پچاس سال سے بھی کم۔ اس کے بعد وہ یہاں بس گئے اور پر امن زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کی لڑائیوں اور دراز دستیوں نے ہندوستانی آریوں کو بہت متاثر کیا ان کی معاشرت اور طرز حکومت بھی آریوں سے بہت مختلف تھا۔ آریہ اب بھی بہت بڑی حد تک آزادی پسند تھے

ان کے راجاؤں کو بھی رائے عامہ کے سامنے جھکنا پڑتا تھا۔ اور گاؤں کی پنچاتیوں کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ لیکن منوں کے یہاں آنے بسنے اور ہندوستانیوں کے ساتھ مل جل جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ آریوں کے قدیم معیار پہلے سے پست ہو گئے

بالادت جلیل القدر گپتا خاندان کا آخری راجہ تھا ۲۵۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ یہ معلوم کر کے تمہیں تعجب ہو گا کہ اس خالص ہندو خاندان کے راجہ کا رجحان خود بودھ مت کی طرف تھا اور اس کا گرد ایک بودھ بھکشو تھا۔ گپتا دور میں کرشن پوجا از سر نو شروع ہوئی۔ اس کے لئے وہ خاص طور پر مشہور ہے۔ پھر بھی بودھ مت کے ساتھ اس کی کوئی خاص ٹکر نہیں ہوئی۔

دو سو برس کے گپتا دور کے بعد پھر ہمیں شمالی ہند میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں نظر آتی ہیں جو کسی مرکزی قوت کے ماتحت نہ تھیں لیکن جنوبی ہند میں ایک نئی سلطنت پیدا ہوئی۔ پولاکیسن نامی ایک راجہ نے جو اپنے آپ کو رامچندر کی نسل سے کہتا تھا۔ چلوکیہ سلطنت کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کی۔ جنوبی ہند کے ان لوگوں کا مشرقی جزائر کی نو آبادیوں سے گہرا تعلق ہو گا اور ہندوستان اور ان جزیروں کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری ہو گا۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی جہاز سامان تجارت لے کر اکثر ایران جایا کرتے تھے چلوکیہ راجہ اور ایران کے ساسانی بادشاہ خصوصاً خسرو ثانی اپنے سفیر ایک دوسرے کے دربار میں بھیجتے تھے۔

(۳۹)

ہندوستان کا قبضہ بدیسی منڈیوں پر

۵ رمئی سنہ ۳۲ء

تاریخ کے اس قدیم دور میں جو ایک ہزار برس سے زیادہ پر مشتمل ہے اور جو اسوقت ہمارے پیش نظر ہے۔ ہندوستان کی تجارت کو مغرب میں تو مغربی ایشیا اور یورپ تک اور مشرق میں چین تک خوب فروغ حاصل تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ محض یہ نہیں کہ اس زمانہ میں ہندوستانی اچھے جہاز راں اور اچھے تاجر تھے اور نہ یہ کہ دستکاری میں وہ بہت ہوشیار تھے۔ ان میں یہ باتیں ضرور تھیں اور ان سے کافی مدد بھی ملی لیکن دُور دُور کی منڈیوں پر قبضہ کر لینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں ہندوستان علم کیمیا میں خاص کر رنگ سازی میں سب سے آگے تھا۔ ہندوستانیوں نے کپڑے رنگنے کے لئے پکے رنگ تیار کرنے کی خاص ترکیبیں دریافت کر لی تھیں۔ نیز نیل کے پودے سے نیلا رنگ بنانے کی ترکیب بھی انھیں معلوم ہو گئی تھی۔ انگریزی میں نیل کو **Indigo** کہتے ہیں۔ یہ نام ہی لفظ **India** سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ غالباً پرانے ہندوستانی لوہے کو تاؤ دے کر فولاد بنانا بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لئے وہ اچھے سے اچھے فولادی ہتھیار تیار کر سکتے تھے۔ شاید تمہیں یاد ہو، میں کسی جگہ یہ بتا چکا ہوں کہ سکندر کے حملہ کے پرانے ایرانی قصّوں میں جہاں کہیں کسی اچھی تلوار یا خنجر کا ذکر

آیا ہے۔ وہاں ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ہندوستان کی بنی ہوئی تھی۔

چونکہ ہندوستان میں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہ رنگ اور دوسری چیزیں زیادہ بہتر تیار ہوتی تھی۔ اس لیے باہر کی منڈیوں پر اُس کا قبضہ ہو جانا لازمی تھا۔ وہ فرد یا وہ ملک جس کے پاس بہتر اوزار ہوں یا جو مختلف چیزیں تیار کرنے کا بہتر یا سستا طریقہ جانتا ہو اس فرد یا اس ملک کو لازمی طور پر منڈی سے نکال باہر کر دے گا۔ جو ان چیزوں سے محروم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ دو سو برس میں یورپ ایشیا سے بازی لے گیا۔ نئی ایجادوں سے یورپ کو نئے اور زیادہ طاقتور اوزار مل گئے اور سامان تیار کرنے کے نئے طریقے معلوم ہو گئے۔ ان کی بدولت اس نے دنیا کی تمام منڈیوں پر قبضہ کر لیا اور دولت مند اور طاقتور بن گیا۔ اس کے علاوہ دوسرے اسباب بھی تھے جن سے اسے امداد ملی لیکن فی الحال میں اوزار کی اہمیت تمہارے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ ایک بڑے آدمی کا قول ہے کہ انسان ایک اوزار بنانے والا جانور ہے۔ چنانچہ ابتدا سے لے کر اب تک انسانی تاریخ اصل میں اوزاروں کی ترقی اور نشو و نما کی تاریخ ہے۔ عہد حجری پتھر کے تیر کمان اور ہتھوڑوں سے لے کر آج کل کے اسٹیم انجن اور زبردست مشینوں تک تقریباً ہر کام میں ہمیں اوزار کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذرا سوچو کہ اگر اوزار ل تو ہمارا کیا حال ہو؟

حقیقت میں اوزار بڑی اچھی چیز ہے۔ اس سے انسان کا کام ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن اوزار کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً آرہ بڑا کارآمد اوزار ہے۔ لیکن اگر ایک بچے کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس

سے اپنے آپ کو زخمی کرے گا۔ اسی طرح چاقو بھی نہایت ضروری اور کارآمد چیز ہے۔ لیکن ایک بیوقوف شخص اسی چاقو سے دوسرے کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ اس میں بیچارے چاقو کا کیا قصور؟ قصور تو دراصل اس شخص کا ہے جو اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔

اسی طرح موجودہ مشینیں بھی اپنی جگہ بہت اچھی ہیں لیکن سینکڑوں طریقے سے ان کا غلط استعمال کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ عوام کی محنت کا بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے ان کی وجہ سے ان کی حالت پہلے کے مقابلہ میں اور بدتر ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان مشینوں نے حکومتوں کے ہاتھ میں اتنی طاقت دے دی ہے کہ لڑائیوں میں وہ زیادہ آسانی سے کروروں کا خون کر سکتی ہیں۔

لیکن قصور مشینوں کا نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کا ہے جو ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ اگر مشینوں پر اُن غیر ذمہ دار لوگوں کا قبضہ نہ ہو جو ان کے ذریعے سے اپنا گھر دولت سے بھرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ جمہور کی جانب سے جمہور کے فائدے کے لئے ان سے کام لیا جائے تو زمین آسمان کا فرق ہو سکتا ہے۔

غرض اس زمانہ میں ہندوستان کی آج کی سی حالت نہیں تھی بلکہ صنعت و حرفت میں وہ ساری دنیا سے آگے تھا۔ چنانچہ ہندوستانی کپڑا۔ رنگ اور دوسری چیزیں دور دور کے ملکوں میں جاتی تھیں اور لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ اس تجارت نے ہندوستان کو مالا مال کر دیا۔ ان چیزوں کے علاوہ جنوبی ہند سے مرچیں اور مسالے بھی باہر جاتے تھے۔ یہ مسالے دراصل مشرقی جزیروں سے

ہندوستان آتے تھے اور پھر یہاں سے مغربی ملکوں کو روانہ کئے جاتے تھے۔ عام طور پر تمام مغربی ممالک میں اور رخاص طور پر روم میں مرچوں کی بڑی قدر تھی۔ سُنا گیا ہے کہ گوتھ قوم کے ایک سردار الارک نے جب سنہ ۴۱۰ء میں روم پر قبضہ کیا ہے تو وہاں ۳ ہزار پونڈ مرچیں اس کے ہاتھ لگی تھیں یہ ساری مرچیں ہندوستان سے ہو کر گئی ہوں گی۔

(۴۰)

ملکوں اور تہذیبوں کا عروج و زوال

۶ مئی ۳۲ء

بہت دن سے ہم نے چین کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اب چلو پھر وہاں چلیں یعنی چین کا قصہ پھر شروع کریں اور دیکھیں کہ جس زمانہ میں مغرب میں روم کو زوال ہو رہا تھا اور ہندوستان میں گپتا خاندان کے زیر اثر قومیت میں نئے سرے سے جان پڑ رہی تھی۔ اس وقت چین میں کیا ہو رہا تھا۔ روم کے عروج و زوال کا چین پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ یہ دونوں ملک ایک دوسرے سے اتنے دور تھے کہ کوئی اثر پڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چینی حکومت جب کبھی وسطی ایشیا کے قبیلوں کو اپنے یہاں سے بھگاتی تھی تو ہندوستان اور یورپ پر اس کا بڑا تباہ کن اثر پڑتا تھا۔ یہ قبیلے یا دوسرے لوگ جنہیں یہ اور آگے بھگاتے تھے مغرب اور جنوب کا رُخ کرتے تھے وہ سلطنتوں اور حکومتوں کو اُلٹ پلٹ دیتے تھے اور بڑی افراتفری مچ جاتی تھی۔ پھر ان میں سے بہت سے مشرقی یورپ اور ہندوستان میں آباد ہو جاتے تھے۔

چین اور روم میں براہ راست تعلقات تھے۔ سفیروں کے آنے جانے کا سلسلہ تھا۔ چینی کتابوں میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ ابتدائی سفیر روم کے شہنشاہ آن تن نے ۱۶۶ء میں بھیجے تھے۔ یہ آن تن کون تھا۔ وہی مارکس آرلیس انتونینس جس کا میں اپنے پچھلے کسی خط میں ذکر

کر چکا ہوں۔

یورپ میں روم کا زوال بڑی اہم بات تھی۔ یہ محض کسی شہر یا سلطنت کا زوال نہیں تھا۔ یوں تو رومی سلطنت عرصہ تک قسطنطنیہ میں باقی رہی اور اس کا بھوت تقریباً چودہ سو برس تک یورپ پر منڈلاتا رہا۔ لیکن روم کا زوال ایک زبردست دور کے خاتمہ کا مترادف تھا۔ روم کے کھنڈروں پر ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی تھی اور ایک نئی تہذیب اور تمدن نشو و نما پا رہا تھا۔ لفظوں اور فقروں سے انسان بہت دھوکا کھاتا ہے جب دو جگہ ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی دونوں جگہ ایک ہے۔ روم کے زوال کے بعد یورپ رومی اصطلاحات استعمال کرتا رہا لیکن ان اصطلاحوں کے پیچھے جو تصورات تھے وہ کچھ اور ہی تھے لوگ کہتے ہیں کہ یورپ کے موجودہ ملک یونان اور روم کے وارث ہیں۔ کسی حد تک یہ صحیح ہے۔ لیکن اس سے بہت کچھ غلط فہمی بھی پیدا ہوتی ہے کیونکہ آج یورپ کے ملک جو اصول رکھتے ہیں وہ یونان اور روم کے اصول سے بالکل مختلف ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یونان اور روم کی پرانی دُنیا صفحۂ ہستی سے بالکل مٹ گئی۔ وہ تہذیب جو کوئی ایک ہزار برس میں مکمل ہوئی تھی وہ برباد ہو گئی۔ اس کے بعد مغربی یورپ کے وہ نیم مہذب اور نیم وحشی ملک تاریخ کے صفحات پر نمودار ہوئے اور انھوں نے ایک نئے تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی انھوں نے روم سے بہت کچھ سیکھا۔ پرانی دنیا سے بہت کچھ حاصل کیا۔ لیکن تحصیل تعلیم کا یہ عمل نہایت وقت طلب اور محنت طلب تھا سینکڑوں برس تک تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں تہذیب اور تمدن

پر اوس پڑگئی ہے۔ ہر طرف جہالت اور تعصب کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اس زمانہ کو تاریک زمانے کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ دنیا پیچھے کیوں ہٹتی ہے اور سینکڑوں برسوں کا جمع کیا ہوا سرمایہ علم و ادب کیسے فنا ہو جاتا ہے اور دنیا اسے کیوں بھلا دیتی ہے؟ یہ وہ پیچیدہ سوالات ہیں جو بڑے بڑوں کو پریشان کیا کرتے ہیں میں ان کے جواب دینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہندوستان جو علم و عمل میں اتنا پیش پیش تھا اس بری طرح تباہ ہو گیا اور اتنے عرصے سے غلام ہے۔ یا چین جس کا ماضی اتنا شاندار تھا اب عرصہ کا رزار بنا ہوا ہے۔ شاید صدیوں کا وہ علم جو انسان تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرتا ہے سراسر مفقود نہیں ہو جاتی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور ہم وقتی طور پر دیکھ نہیں سکتے۔ کمرے کی کھڑکیاں اگر بند ہو جاتی ہیں تو تاریکی چھا جاتی ہے لیکن باہر ہر طرف روشنی رہتی ہے۔ اس لئے ہم اگر اپنی آنکھیں اور کھڑکیاں بند کر لیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ روشنی دنیا کے پردے سے غائب ہو گئی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یورپ کے اس تاریک دور کی ذمہ داری عیسائیت پر ہے۔ وہ عیسائیت نہیں جو حضرت عیسیٰ نے پیش کی تھی بلکہ وہ سرکاری مذہب جو رومی شہنشاہ قسطنطنیں کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد مغرب میں رائج ہوا۔ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں جب قسطنطنیں نے عیسائی مذہب قبول کیا" اس وقت سے ہزار برس کا وہ دور شروع ہوا جس میں عقل کو پابہ زنجیر کر دیا گیا۔ فکر کو غلام بنا دیا گیا اور علم کی ترقی رک گئی۔ نہ صرف اس دور میں تشدد تعصب اور عدم رواداری کا دور دورہ رہا۔ بلکہ انسان کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ سائنس میں یا اور دوسرے معاملات

میں کوئی ترقی کر سکے۔ مقدس کتابیں اکثر ترقی کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ کیونکہ جس زمانہ میں وہ لکھی جاتی ہیں۔ اسی زمانہ کے خیالات اور رسم و رواج کا ذکر ان میں ہوتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ ان خیالات اور اس رسم و رواج پر حرف رکھے۔ اس لئے کہ وہ "مقدس کتاب" میں آئے ہیں۔ گویا دنیا چاہے کتنی ہی بدل جائے لیکن ہمیں اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ ہم تبدیل شدہ حالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے اپنے خیالات اور رسم و رواج کو ذرا بھی بدل سکیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زمانے سے بے تعلق ہو جاتے ہیں اور ہمیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اسی لئے بعض لوگ یورپ میں تاریکی کے دور کا ذمہ دار عیسائیت کو ٹھہراتے ہیں لیکن دوسروں کا یہ خیال ہے کہ عیسائیت اور عیسائی فقیہوں اور درویشوں ہی کی بدولت اس تاریک دور میں علم کا چراغ روشن رہا انھوں نے فنون لطیفہ اور مصوری کو باقی رکھا اور قابلِ قدر کتابوں کی نقلیں کر کے انھیں جان سے زیادہ عزیز رکھا۔

غرض اسی طرح لوگ بحث کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں اپنی جگہ ٹھیک کہتے ہوں۔ کیونکہ یہ کہنا سخت حماقت ہے کہ روم کے زوال کے بعد جتنی برائیاں پیدا ہوئیں ان سب کی ذمہ دار عیسائیت ہے۔ سچ پوچھئے تو روم کا زوال اس لئے ہوا کہ اس میں یہ خرابیاں پہلے سے موجود تھیں۔

میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ دراصل بتانا تو یہ تھا کہ اگرچہ یورپ میں تمام سماجی نظام یکایک درہم برہم ہو گیا اور وہاں ایک فوری انقلاب رونما ہو گیا لیکن چین یا ہندوستان میں ایسا کوئی انقلاب نہیں ہوا۔ یورپ میں ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک تہذیب کا خاتمہ ہوا۔ اور دوسری کی داغ بیل

پڑی جس نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے موجودہ صورت اختیار کرلی۔ لیکن چین کی تہذیب اور تمدن برابر اُسی اعلیٰ معیار پر قائم رہا اور اس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ نشیب و فراز تو بہت ہوئے۔ اچھے زمانے بھی آئے اور ختم ہوگئے۔ بُرے بادشاہ بھی ہوئے اور چل بسے۔ اور شاہی خاندان بھی برابر بدلتے رہے لیکن تہذیب کی میراث کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ جب چین کے ٹکڑے ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہوا، اس وقت بھی فنونِ لطیفہ اور علم و ادب کا چرچا رہا اور دلکش تصویریں، خوشنما برتن اور خوبصورت عمارتیں برابر تیار ہوتی رہیں۔ فن طباعت کا استعمال شروع ہوا اور چائے نوشی نے رواج پایا جس کا تذکرہ وہاں کی شاعری میں داخل ہوگیا۔ چین میں اب تک ایک لطافت اور نفاست موجود ہے۔ جو اعلیٰ تہذیب ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

یہی صورت ہندوستان کی ہے۔ روم کی طرح یہاں کی تہذیب کا سلسلہ کبھی یک دم سے منقطع نہیں ہوا۔ مانا کہ یہاں اچھے اور بُرے دونوں دور گذرے ہیں۔ ایسا زمانہ بھی ہوا ہے جب علم و ادب کے شاہکار اور صناعی کے نازک اور لطیف ترین نمونے پیش کئے گئے ہیں اور ایسا وقت بھی آیا ہے جب ہر طرف تباہی اور بربادی کی آگ لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں کی تہذیب ایک خاص انداز پر ہمیشہ برقرار رہی۔ وہ ہندوستان سے دوسرے مشرقی ملکوں تک پہنچی اور اس نے ان وحشیوں کو جو یہاں لوٹ مار کرنے آئے تھے۔ شائستہ بنا کر اپنے میں جذب کرلیا۔

یہ خیال نہ کرنا کہ میں مغرب کی برائی کر کے اس کے مقابلہ میں ہندوستان

اور چین کی تعریف کرنا چاہتا ہوں۔ سچ پوچھو تو آج ان دونوں ملکوں کے پاس کیا رہ گیا ہے جو کوئی اس پر ناز کرے؟ ایک اندھا بھی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اپنی پرانی عظمت کے باوجود تمام اقوام عالم میں ان دونوں کا پلہ بہت نیچا ہے۔ اگر یہاں قدیم تہذیب کا سلسلہ کبھی نہیں ٹوٹا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تنزل نہیں ہوا۔ اگر ہم ایک دن بلندی پر تھے اور آج پستی میں ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری حالت میں تنزل ہوا۔ ہم اپنی تہذیب کے تسلسل پر مسرور ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ تہذیب خود بوسیدہ ہو گئی ہو تو اس مسرت کی کیا حقیقت ہے۔ شاید ہمارے لئے یہ اچھا ہوتا کہ ہم کبھی کبھی اپنے ماضی سے رشتہ توڑ لیتے۔ یہ انقلاب شاید ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا اور ہم میں نئی قوت اور زندگی پیدا ہو جاتی۔ آج ساری دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً جو واقعات رونما ہو رہے ہیں ممکن ہے کہ وہ ہمارے ملک کو قدامت کی نیند سے چونکا دیں! دراسے پھر شباب نو اور حیات تازہ سے معمور کر دیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں ہندوستان کی قوت اور استقلال کا سبب دیہی جمہوریتوں یا خود مختار پنچایتوں کا وسیع نظام تھا۔ اُس زمانہ میں آج کل کی طرح نہ بڑے جاگیر دار ہوتے تھے اور نہ زمیندار۔ زمین سارے گاؤں کی پنچایت کی یا ان کسانوں کی ملکیت ہوتی تھی۔ جو اس پر کام کرتے تھے۔ اور ان پنچایتوں کو بہت وسیع اختیارات حاصل تھے۔ انھیں گاؤں کے تمام باشندے منتخب کرتے تھے۔ گویا اس نظام میں جمہوریت کا عنصر موجود تھا۔ بادشاہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ یا آپس میں نہ جھگڑا کرتے تھے۔ لیکن اس دیہی نظام کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ نہ اس کی ہمت کرتے تھے کہ پنچایتوں کی آزادی میں دخل دیں یا

اسے سلب کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنتیں بدلتی رہیں۔ لیکن سماج کی ساخت میں جو دیہی نظام پر مبنی تھی۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حملوں، لڑائیوں اور بادشاہوں کے تغیر و تبدیل سے ہمیں یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ ان کا اثر ساری آبادی پر پڑتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی شمالی ہند کے عام باشندے بھی اس زد میں آجاتے تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ ان کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ اور اوپری تبدیلیوں کے باوجود ان کا نظام بدستور جاری رہتا تھا۔

دوسری چیز جس نے ہندوستان کے سماجی نظام کو مدت تک قائم رکھا وہ ذات پات کی ابتدائی صورت تھی۔ شروع زمانہ میں ذات پات کے معاملہ میں نہ اتنی سختی تھی جتنی بعد کو ہوگئی اور نہ اس کا انحصار اس پر تھا کہ انسان کس خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ اس ذات پات کی وجہ سے ہزاروں برس تک ہندوستانی معاشرت کا شیرازہ بندھا رہا اور یہ صرف اس لئے ممکن ہوسکا کہ اس زمانہ میں ذات پات ترقی یا تبدیلی میں حارج نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کا خیر مقدم کرتی تھی۔ مذہب اور معاشرت کے معاملہ میں قدیم ہندوستان ہمیشہ رواداری۔ تجربہ اور تبدیلی کا حامی رہا اسی سے اُسے قوت حاصل ہوئی۔ لیکن پیہم حملوں اور دوسری مشکلات نے ذات پات کی بندشیں زیادہ سخت کردیں۔ جس کی وجہ سے تمام ہندوستانی نظام سخت اور بے لوچ ہوکر رہ گیا۔ یہ عمل برابر جاری رہا حتیٰ کہ ذات پات ہر قسم کی ترقی کی دشمن بن گئی اور ہندوستانی اس درگت کو پہنچ گئے۔ اب سماجی نظام کا شیرازہ باندھنے کے بجائے اس نے اُسے سینکڑوں ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کردیا ہے۔ جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن ہوگیا اور ہم کمزور اور ذلیل وخوار ہوگئے ہیں
غرض ماضی میں ہندوستان کے سماجی نظام کو مضبوط کرنے میں ذات پات سے بہت مدد ملی تھی۔ تاہم اس میں زوال کے جراثیم موجود تھے۔ یہ بے انصافی اور عدم مساوات کو ایک دوامی شکل دینا چاہتی تھی اس لئے آخر کار اُسے لازماً ناکام ہونا تھا اگر کسی سماج کی بنیاد بے انصافی اور عدم مساوات پر قائم ہو یا اس کی تہ میں یہ اصول کارفرما ہو کر ایک طبقہ یا جماعت دوسرے کو خوب لوٹے تو وہ سماج کبھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتی۔ چونکہ آج بھی دنیا میں یہی ناجائز لوٹ جاری ہے اسی لئے چاروں طرف مصیبت اور پریشانی نظر آتی ہے۔ لیکن غنیمت ہے کہ اب ہر جگہ لوگ اس چیز کو محسوس کرنے لگے ہیں اور اس سے چھٹکارا پانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔

جس طرح ہندوستان میں سماجی نظام کی تمامتر قوت دیہات پر اور ان لاکھوں کسانوں پر منحصر تھی جو زمین کو جوتتے بوتے تھے اور اس کے مالک تھے۔ اسی طرح چین میں بھی یہی صورت تھی۔ وہاں بھی بڑے بڑے زمیندار نہیں تھے اور مذہب کٹرپن اور تعصب کو کبھی جائز نہیں رکھتا تھا بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ شاید دنیا کے پردے پر چینی لوگ مذہب کے معاملہ میں سب سے کم متعصب تھے اور اب بھی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی تمہیں خیال ہوگا کہ چین اور ہندوستان میں روم اور یونان بلکہ اس سے بھی پہلے مصر کی طرح غلام مزدوروں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ خانگی ملازموں کی حیثیت سے چند غلام ضرور ہوتے تھے لیکن ان سے سماجی نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا چین اور ہندوستان

کا سماجی نظام ان کے بغیر بھی اسی طرح جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن یونان اور روم میں یہ صورت نہیں تھی۔ وہاں تو بے شمار غلام ان کے سماج کا لازمی جزو تھے اور محنت کا سارا بوجھ انہی کے کاندھوں پر تھا۔ پھر ذرا مصر پر غور کرو۔ اگر وہاں یہ غلام مزدور نہ ہوتے تو یہ عظیم الشان اہرام کہاں سے آتے؟

میں نے چین کے حالات سے یہ خط شروع کیا تھا اور ارادہ تھا کہ اس قصہ کو جاری رکھوں۔ لیکن میں اِدھر اُدھر بہک گیا۔ کیا کروں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ خیر اگلے خط میں یہ کوشش کروں گا کہ چین سے بھٹکنے نہ پاؤں۔

(۱۴۱)

تانگ خاندان کے دور میں چین کا عروج

۷ رمئی ۳۲ء

چین کے ہان خاندان کا حال میں تمہیں بتا چکا ہوں اس کے علاوہ بودھ مت کی آمد۔ فن طباعت کی ایجاد اور امتحان لے کر سرکاری افسروں کا تقرر ان سب چیزوں کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ تیسری صدی عیسوی میں ہان خاندان ختم ہو گیا اور سلطنت تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ یہ دور جو "تین سلطنتوں کے دور" کے نام سے مشہور ہے کئی سو برس تک جاری رہا حتیٰ کہ تینوں سلطنتیں پھر ایک ہو گئیں اور تانگ نامی ایک نئے خاندان نے تمام چین میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر دی یہ ساتویں صدی کے شروع زمانہ کا ذکر ہے۔

لیکن اس افتراق کے دور میں بھی تہذیب اور فنون لطیفہ شمال کی جانب سے تاتاریوں کے حملہ کے باوجود برابر پھلتے پھولتے رہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ اس زمانہ میں بھی بڑے بڑے کتب خانے موجود تھے اور بہتر سے بہتر تصویریں بنائی جاتی تھیں۔ ہندوستان سے بھی نہ صرف نفیس کپڑا اور دوسرا سامان وہاں جاتا رہا بلکہ علم مذہب اور فنون لطیفہ بھی برابر منتقل ہوتے رہے بہت سے بودھ مبلغ یہاں سے چین گئے اور اپنے ساتھ ہندوستانی آرٹ کی روایات بھی لیتے گئے ممکن ہے ہندوستانی صناع اور ماہرین فن بھی وہاں گئے ہوں۔ ہندوستان سے بودھ مت اور نئے نئے خیالات کی آمد کا چین پر بہت گہرا اثر

پڑا چین کی تہذیب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ہندوستانی مذہب یا فلسفہ یا آرٹ کسی پس ماندہ ملک میں گیا ہو اور جاتے ہی وہاں مقبول ہو گیا ہو۔ بلکہ وہاں تو چین کے قدیم علوم و فنون سے مقابلہ تھا ان دونوں کی باہمی آویزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بالکل نئی چیز پیدا ہو گئی۔ ایسی چیز جس میں ہندوستان کا بہت کچھ رنگ تو تھا لیکن اس کی اصلیت چینی تھی اور چینی انداز پر ڈھال لی گئی تھی غرض ان نئے خیالات کی رو نے جو ہندوستان سے آئی تھی چین کی ذہنی اور جمالیاتی زندگی کے ساتھ تازیانہ کا کام کیا اور اُسے خاص تقویت بخشی۔

اسی طرح بودھ مت اور ہندوستانی آرٹ کا پیام اس سے آگے کوریا اور جاپان تک بھی گیا اور اس کا مطالبہ بھی بہت دلچسپ ہے کہ یہ ملک ان سے کس طرح متاثر ہوئے۔ ہر ملک نے انھیں اپنی فطرت کے سانچے میں ڈھال کر اختیار کر لیا۔ چنانچہ بودھ مت اگرچہ چین اور جاپان دونوں میں موجود ہے لیکن ہر ملک میں اس کی ایک دوسری شکل ہے اور شاید یہ دونوں شکلیں بودھ مت کی اس شکل سے بہت کچھ مختلف ہیں جو ہندوستان سے گئی تھی۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ کی شکل بھی مقام اور لوگوں کی تبدیلی سے بدل جاتی ہے۔ ہندوستان میں تو من حیثیت القوم ہم میں سے یہ جمالیاتی ذوق فنا ہو گیا ہے۔ ہم نے عرصہ سے نہ صرف کوئی حسین و جمیل چیز پیش نہیں کی ہے بلکہ ہم لوگ حسین چیز سے لطف لینا اور اس کی قدر کرنا بھی بھول گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے جو ملک آزاد نہ ہو۔ اس میں جمالیات یا آرٹ کیسے پنپ سکتا ہے وہ غلامی اور پابندیوں کی تاریکی میں مرجھا جاتے ہیں۔ مگر شکر ہے کہ جیسے جیسے ہمیں آزادی کی جھلک نظر آرہی ہے ہمارا جمالیاتی ذوق بھی رفتہ رفتہ بیدار ہوتا جاتا ہے جب ہمارا ملک آزاد ہو جائے گا تو تم دیکھو گی کہ یہاں بھی جمالیات اور آرٹ کا نئے سرے سے

چرچا ہوگا اور ہمارے گھروں۔ ہمارے شہروں اور ہماری معاشرت کی تمام بدنمائی دور ہوجائے گی۔

چین اور جاپان ہندوستان کے مقابلہ میں زیادہ خوش نصیب ہیں کیونکہ ان کا جمالیات کا ذوق اب تک بہت کچھ باقی ہے۔

جیسے جیسے چین میں بودھ مت پھیلتی گئی ہندوستان سے بودھ لوگ اور بودھ بھکشو وہاں جاتے رہے اور چینی بھکشو یہاں آئے اور دوسرے ملکوں میں گئے۔ فاہیان کا تذکرہ تو میں کرچکا ہوں ہیون سانگ کو بھی تم جانتی ہو۔ یہ دونوں ہندوستان آئے تھے۔ ہوئی شنگ نامی ایک چینی بھکشو کے مشرقی سمندروں کے سفر کا بھی بہت دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ ۴۹۹ء میں چین کی راجدھانی میں پہنچا اور یہ بیان کیا کہ میں ایک ایسے ملک میں گیا تھا جو مشرق کی طرف سے چین سے ہزاروں میل دور ہے اسے وہ اپنی زبان میں فوسنگ کہتا تھا چین اور جاپان کے مشرق میں بحرالکاہل ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ہوئی شنگ نے بحرالکاہل کو عبور کیا ہو اور میکسیکو پہنچا ہو کیونکہ میکسیکو اس زمانہ میں بھی اعلیٰ تہذیب کا مالک تھا۔

چین بودھ مت کی مقبولیت سے متاثر ہوکر ہندوستان کے سب سے بڑے بودھ پیشوا جنوبی ہند سے کینٹن چلے گئے۔ ان کا نام یا لقب بودھی دھرم تھا۔ شاید ہندوستان میں بودھ مت کے رفتہ رفتہ کمزور پڑجانے کی وجہ سے وہ یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوئے ہوں۔ ۵۲۶ء میں انھوں نے یہاں سے ہجرت کی۔ اس وقت وہ بہت ضعیف اور سن رسیدہ تھے۔ ان کے ساتھ اور ان کے بعد بھی بہت سے بودھ بھکشو چین چلے گئے۔ سُنا ہے کہ چین کے صرف ایک صوبے لوینگ میں اس زمانہ میں تین ہزار ہندوستانی بھکشو اور



تانگ سلطنت

اور دس ہزار ہندوستانی خاندان موجود تھے۔

ہندوستان میں کچھ عرصے کے بعد ہی بودھ مت کو ایک مرتبہ پھر عروج ہوا اور چونکہ یہ مہاتما بودھ کی جنم بھومی تھی اور مقدس کتابیں یہاں موجود تھیں اس لئے ہر ملک کے متقی بودھ یہاں آتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان سے بودھ مت کی عظمت رخصت ہو چکی تھی اور اب چین اس کا خاص مرکز تھا۔

شہنشاہ کاؤ سو نے ۶۱۸ء میں تانگ خاندان کی بنا ڈالی اس نے نہ صرف تمام چین کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ بلکہ بہت دور دور تک اپنا اثر و اقتدار بڑھا لیا۔ یعنی جنوب میں انام اور کمبوڈیا تک اور مغرب میں ایران اور بحر کیسپین تک۔ اس عظیم الشان سلطنت میں کوریا کا ایک حصّہ بھی شامل تھا۔ اس کا دارالسلطنت سی آن نو جو مشرقی ایشیا میں اپنی شان و شوکت اور تہذیب و تمدن کے لئے بہت مشہور تھا جاپان اور جنوبی کوریا سے جو اب تک آزاد تھا سفارتیں اور وفد آیا کرتے تھے تاکہ یہاں کے علوم و فنون فلسفے اور تہذیب و تمدن کا مطالعہ کریں۔

تانگ خاندان کے بادشاہ بیرونی تجارت اور غیر ملکی سیاحوں کی بہت ہمت افزائی کرتے تھے جو پردیسی چین میں آتے تھے یا وہاں بس جاتے تھے ان کے لئے خاص قانون بنائے گئے تھے تاکہ خود ان کے رواج اور قانون کے مطابق ان کے معاملات کا فیصلہ کیا جا سکے۔ تیسری صدی عیسوی کے لگ بھگ جنوبی چین میں کینٹن کے قریب بہت سے عرب بھی آباد تھے یہ ظہور اسلام یعنی رسول اکرم محمدؐ سے پہلے کا ذکر ہے۔

ان عربوں کی مدد سے یہاں بحری تجارت بھی شروع ہوئی جو عموماً

عربی اور چینی جہازوں کے ذریعہ ہوئی تھی۔

تمہیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ مردم شماری چین کی بہت پرانی ایجاد ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۵۶ء میں وہاں سب سے پہلی مردم شماری ہوئی تھی۔ یہ ہان خاندان کا دورِ حکومت ہوگا۔ اس زمانہ میں افراد کی نہیں بلکہ خاندانوں کی گنتی ہوتی تھی اور ہر خاندان میں اوسطاً پانچ شخص فرض کئے جاتے تھے اس حساب سے ۱۵۶ء میں چین کی آبادی کا تخمینہ ۵ کرور کیا گیا تھا اناکہ یہ بالکل صحیح طریقہ نہیں ہے لیکن خیال تو کرو کہ وہ مردم شماری جو چین میں ۱۸۰۰ سو برس پہلے ایجاد ہوئی تھی مغرب میں ابھی رائج ہوئی ہے یعنی کوئی ڈیڑھ سو برس ہوے کہ ممالک متحدہ امریکہ میں سب سے پہلی مردم شماری ہوئی تھی۔

تانگ خاندان کے شروع زمانہ میں چین میں دو نئے مذہب آئے یعنی عیسائیت اور اسلام۔ عیسائیت تو اس فرقہ کے ذریعہ سے پہنچی جسے ملحد قرار دے کر مغرب سے نکال دیا گیا تھا۔ یہ فرقہ نسطوری کہلاتا تھا عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان لڑائی جھگڑوں کا حال میں تمہیں پہلے کبھی لکھ چکا ہوں۔ انھی جھگڑوں کا نتیجہ تھا کہ روم نے نسطوری فرقوں کو اپنے یہاں سے نکال دیا۔ وہاں سے بھاگ کر وہ چین، ایران اور ایشیا کے دوسرے حصوں میں پھیل گئے۔ وہ ہندوستان بھی آئے اور یہاں تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی لیکن اس کے بعد دوسرے عیسائی فرقوں نے اور اسلام نے نسطوریوں کو اپنے میں جذب کر لیا۔ اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا لیکن پچھلے سال اپنے دورے کے سلسلے میں جنوبی ہند کے ایک مقام پر ان کی ایک مختصر سی آبادی دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ ان کے بشپ نے ہمیں چائے پر مدعو کیا تھا۔ بوڑھا بے شک بہت

پرلطف آدمی تھا۔

عیسائی مذہب بہت دیر سے چین پہنچا لیکن اسلام بڑی تیزی سے آیا۔ یہ نسطوریوں سے چند سال پہلے اپنے رسول کی حیات ہی میں یہاں آ گیا تھا۔ چینی بادشاہ نے دونوں مذاہب کے سفیروں کو بڑے اخلاق سے لیا اور جو وہ کہنا چاہتے تھے اسے بڑے غور سے سُنا۔ اس نے ان کی تعلیم کو بہت پسند کیا اور غیر جانب داری کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آیا۔ عربوں کو کینٹن میں ایک مسجد بنانے کی بھی اجازت ملی یہ مسجد آج بھی موجود ہے حالانکہ اسے بنے ہوئے تیرہ سو برس گذر چکے ہیں۔ اس کا شمار دنیا کی سب سے پرانی مسجدوں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح تانگ بادشاہ نے عیسائیوں کو بھی ایک گرجا اور خانقاہ بنانے کی اجازت دی کہاں اس زمانہ میں یہ رواداری تھی اور کہاں آج کل یورپ میں عدم رواداری کا بازار گرم ہے۔ دیکھو دونوں میں کتنا تفاوت ہے۔

کہتے ہیں کہ عربوں نے کاغذ بنانے کا فن چینیوں سے سیکھا تھا۔ پھر انھوں نے یورپ کو سکھایا۔ ۷۵۱ء میں وسطی ایشیا میں ترکستان کے مقام پر چینیوں اور مسلمان عربوں کے درمیان ایک جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں عربوں نے بہت سے چینیوں کو قید کر لیا تھا۔ انھی قیدیوں نے انھیں کاغذ بنانا سکھایا۔

تانگ خاندان کی حکومت تین سو برس تک یعنی ۹۰۰ء تک رہی۔ بعض لوگ ان تین سو برس کو چین کا بہترین دور تصور کرتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں نہ صرف اعلیٰ تہذیب کا دور دورہ تھا بلکہ رعایا بھی عام طور پر نہایت خوش و خرم تھی۔ بہت سی چیزیں جن کا مغرب کو بعد میں علم ہوا

چینیوں کو اسی وقت معلوم تھیں ۔مثلاً کاغذ کا تو میں ذکر چکا ہوں ۔ دوسری چیز بارود ہے ۔اس کے علاوہ چینی اعلیٰ درجہ کے انجینئر بھی تھے ۔غرض کہ قریب قریب ہر معاملہ میں وہ یورپ سے بہت آگے تھے اگر اس وقت وہ یورپ سے پیش پیش تھے تو اب بھی وہ سائنس اور ایجادات کے معاملہ میں اس کی رہنمائی کیوں نہیں کر سکتے ؟ اس لئے کہ یورپ رفتہ رفتہ اس طرح بڑھا جیسے ایک جوان کسی بوڑھے شخص کو جا لیتا ہے اور کم از کم بعض معاملات میں بہت جلد چین سے آگے نکل گیا ۔ قوموں کی تاریخ میں یہ صورت کیوں واقع ہوتی ہے ؟ یہ فلسفیوں کے غور و خوض کے لئے بڑا مشکل سوال ہے ۔تم کوئی فلسفی تو ہو نہیں کہ اس سوال کے پیچھے پریشان ہو اس لئے مجھے بھی اس چکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

اس زمانہ میں چین کے عروج اور کمال کا لازماً باقی ایشیار پر بھی کافی اثر پڑا کیونکہ ایشیار کے تمام دوسرے ملکوں کی نظریں تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کے معاملہ میں چین ہی کی طرف اٹھتی تھیں ۔ ہندوستان کا ستارہ گپتا سلطنت کے خاتمہ کے بعد ماند پڑ چکا تھا ۔ بہرحال چین میں بھی تہذیب و ترقی کی بدولت آرام طلبی اور تعیش پیدا ہو گیا ۔ اس کے علاوہ نظم حکومت میں خرابیاں پیدا ہو گئیں اور محصول بہت بڑھ گیا ۔ بالآخر لوگوں نے تانگ خاندان سے تنگ آ کر اس کا خاتمہ کر دیا ۔

(۴۲)

چوشن اور دائی نپن

۸ رمئی ۱۹۳۲ء

جیسے جیسے ہم دنیا کی یہ داستان بیان کرتے جائیں گے نئے نئے ملک منظر عام پر آتے جائیں گے جن کے متعلق ہمیں کچھ نہ کچھ لکھنا ہوگا اس لئے آؤ اب ذرا کوریا اور جاپان پر ایک نظر ڈالیں جو چین کا بالکل پڑوسی اور اکثر معاملوں میں چینی تہذیب کے پروردہ ہیں، وہ ایشیا کے آخری کنارے یعنی مشرق بعید میں واقع ہیں اور ان کے بعد بس بحرالکاہل ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک براعظم امریکہ سے کوئی ربط ضبط پیدا نہیں ہوا اور ان کا جو کچھ تعلق تھا وہ محض چین سے تھا۔ چنانچہ براہ راست چین سے یا چین کے ذریعہ سے انھیں مذہب، تہذیب و تمدن۔ اور فنون لطیفہ سب کچھ ملا کوریا اور جاپان دونوں پر چین کا زبردست احسان ہے اور کسی حد تک وہ ہندوستان کے بھی ممنون ہیں۔ لیکن ہندوستان سے جو کچھ ملا وہ بھی چین کے ذریعہ سے اور چینی رنگ میں رنگ کر ملا۔

اپنے محل وقوع کی وجہ سے کوریا اور جاپان دونوں کو ایشیا یا دوسری جگہ کے اہم واقعات سے کوئی تعلق نہیں رہا وہ ان حوادث کے مرکز سے بہت دور تھے اور کسی حد تک اس معاملہ میں خوش قسمت تھے۔ خاص کر جاپان۔ اس لئے ہم ان کی کچھ عرصہ تک کی تاریخ آسانی

سے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اس سے باقی ایشیا کے حالات کے سمجھنے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا تاہم جیسے ہم نے ملا ایشیا اور مشرقی جزائر کی پرانی داستان کو نظر انداز نہیں کیا انھیں بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ آج بیچاری کوریا کو سب نے فراموش کر دیا ہے۔ جاپان اسے ہضم کر بیٹھا ہے اور اپنی سلطنت کا ایک جزو بنا چکا ہے۔ لیکن کوریا اب بھی آزادی کے خواب دیکھ رہی ہے اور خود مختاری کے لئے جدوجہد کئے جا رہی ہے۔ آج جاپان کا ہر طرف چرچا ہے اور اخبار چین پر اس کے حملوں کے تذکرے سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی منچوریا میں ایک طرح کی جنگ جاری ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم کوریا اور جاپان کے ماضی کا کچھ حال معلوم کرلیں۔ اس سے حال کے سمجھنے میں اکثر مدد ملتی ہے۔

پہلی چیز تو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ دونوں ملک عرصۂ دراز تک سب سے الگ تھلگ رہے۔ خاص کر جاپان کا دوسرے ملکوں سے الگ رہنا اور بیرونی حملوں سے محفوظ رہنا اس کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز پہلو ہے۔ اس کی ساری تاریخ میں صرف چند مثالیں ایسی ملتی ہیں جب کسی نے اس پر حملہ کیا ہو لیکن وہ بھی کامیاب نہیں ہوئے ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اُسے صرف اپنی اندرونی مشکلات کا سامنا رہا۔ کچھ زمانے تک تو جاپان نے ساری دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا۔ نہ کوئی جاپانی ملک کے باہر جا سکتا تھا اور نہ کوئی غیر ملکی حتیٰ کہ چینی بھی جاپان کے اندر قدم رکھ سکتا تھا۔ ایسا انھوں نے اس لئے کیا تھا کہ یورپ والوں سے اور عیسائی مبلغوں سے محفوظ رہ سکیں۔ یہ نہایت خطرناک

اور احمقانہ بات تھی۔ اس کے معنی تو یہ تھے کہ گویا ساری قوم قید تھی اور ہر قسم کے اچھے یا بُرے بیرونی اثرات سے محروم تھی۔ لیکن یکایک جاپان نے اپنے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں اور ہر اس چیز کو سیکھنے کے لئے دوڑ پڑا جو یورپ سکھا سکتا تھا۔ اس نے ہر چیز کو اس ذوق اور شوق سے سیکھا کہ ایک دو نسلوں کے اندر ہی اندر وہ بظاہر بالکل ایک یورپی ملک بن گیا۔ حتیٰ کہ اس نے یورپ کی تمام بُری باتوں کی بھی نقل اتار لی۔ یہ سب کچھ پچھلے ستر برس کے اندر اندر ہو گیا۔

کوریا کی تاریخ چین کے بہت بعد شروع ہوتی ہے اور جاپان کی تاریخ کوریا کے بھی بعد۔ میں اپنے پچھلے کسی خط میں تمہیں یہ بتا چکا ہوں کہ کی سی نامی ایک چینی سردار ایک خاندان کی حکومت پلٹ جانے کی وجہ سے اپنے پانچ ہزار ساتھیوں کو لے کر چین سے نکل گیا تھا اور کوریا میں جا بسا تھا۔ جس کا نام اس نے چوسن رکھا تھا یعنی سکون سحر کی سر زمین۔ یہ ۱۱۲۲ء قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ کوسی اپنے ساتھ چینی علم و ہنر۔ فن زراعت اور ریشم سازی کی صنعت بھی لایا۔ کوئی نو برس تک کی سی کی اولاد چوسن پر حکومت کرتی رہی۔ وقتاً فوقتاً چینی مہاجرین آتے تھے اور چوسن میں بس جاتے تھے۔ گویا چین سے بہت قریب کا تعلق تھا۔

مہاجرین کا ایک بہت بڑا گروہ اس وقت یہاں آیا جب چین میں شہ ہوانگ ٹی بادشاہ ہوا۔ شاید اس چینی بادشاہ کا تمہیں خیال ہو۔ یہ وہی شخص تھا جو اپنے آپ کو سب سے پہلا "شہنشاہ" کہتا تھا۔ اور جس نے تمام پرانی کتابیں جلوا دی تھیں وہ اشوک کا ہم عصر تھا۔ شہ ہوانگ ٹی کے مظالم سے تنگ آ کر بہت سے چینیوں نے کوریا میں پناہ

لی۔ انھوں نے کی سی کی اولاد کو جواب بہت کمزور ہو چکی تھی تخت سے آتار دیا اس کے بعد چوسن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی اور یہ صورت کوئی آٹھ سو برس تک جاری رہی یہ ریاستیں اکثر آپس میں لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان میں کی ایک ریاست نے چین سے مدد کی درخواست کی۔ یہ درخواست بھی کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ بہر حال مدد آئی تو سہی لیکن پھر اس نے واپس جانے کا نام نہ لیا۔ طاقتور سلطنتیں یہی کیا کرتی ہیں چین نے بھی وہاں ڈیرے جما دیئے اور چوسن کا ایک حصہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ باقی چوسن بھی کئی سو برس تک چین کے تانگ بادشاہوں کی بالادستی کو تسلیم کرتی رہی

۹۳۵ء میں چوسن پھر متحد اور خود مختار سلطنت بن گئی۔ ونگ کین نامی ایک شخص نے یہ مہم سر کی۔ پھر کوئی ساڑھے چار سو برس تک اس کی اولاد اس سلطنت پر حکمرانی کرتی رہی۔

چند سطروں میں میں نے دو ہزار برس کی کوریا کی تاریخ ختم کر دی۔ سچ پوچھو تو اس میں کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے۔ البتہ کوریا پر چین کا جو زبردست احسان ہے وہ دراصل یاد رکھنے کی چیز ہے۔ مثلاً فن تحریر چین ہی سے یہاں آیا۔ کوئی ایک ہزار برس تک کوریا والے چینی رسم الخط استعمال کرتے رہے۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ چینی رسم الخط میں حروف نہیں ہوتے بلکہ خیالات۔ الفاظ اور فقروں کی بعض علامتیں مقرر ہیں۔ بہر حال اس کے بعد کوریا والوں نے ان علامات سے خاص قسم کے حروف بھی ایجاد کیئے جو ان کی زبان کے لئے زیادہ موزوں تھے۔

کوریا میں بودھ مت بھی چین کے راستہ سے آئی۔ اسی طرح کا کانفیوشش کا فلسفہ بھی اُسے چین سے ملا۔ ہندوستانی کا آرٹ کے

اثرات بھی چین ہو کر کوریا اور جاپان پہنچے اس کے بعد کوریا نے صناعی کے خاص کر سنگ تراشی کے حسین ترین نمونے پیش کیے۔ اس کا فن عمارت چین سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ جہاز سازی میں بھی اس نے بہت ترقی کی۔ ایک وقت میں تو کوریا کے پاس زبردست بحری بیڑا تھا جس سے اس نے جاپان پر حملہ کیا تھا۔

غالباً موجودہ جاپانیوں کے اجداد کوریا یا چوسن سے آئے۔ ممکن ہے بعض جنوب کی طرف سے ملایا ایشیا رسے بھی آئے ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ جاپانی منگولی نسل سے ہیں۔ اب بھی جاپان میں ایون نامی ایک قوم آباد ہے۔ یہ لوگ اس ملک کے اصلی باشندے سمجھے جاتے ہیں یہ گورے ہوتے ہیں ان کے جسم پر بال زیادہ ہوتے ہیں اور یہ تمام جاپانیوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اب اس قوم کو بعد کے آنے والوں نے جزیرۂ جاپان کے شمال کی طرف ہٹا دیا ہے اور یہ وہیں آباد ہیں۔

سنہ ۲۰۰ء میں سلطنت یماتو کے تخت پر ایک شہزادی جنگو جلوہ افروز تھی۔ یماٹو جاپان کا یا اس حصہ جاپان کا جہاں یہ مہاجرین آباد ہوئے پرانا نام تھا۔ اس شہزادی کے نام — جنگو پر — ذرا غور کرنا عجیب اتفاق ہے کہ جاپان کے بالکل ابتدائی حکمرانوں میں سے ایک کا یہ نام ہوا ہے۔ اب انگریزی زبان میں یہ لفظ جنگو ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی نہایت خود بیں اور رعونتی باز سامراجی اس کی جگہ محض سامراجی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر سامراجی کسی نہ کسی حد تک خود بیں اور رعونتی باز ہوتا ہے۔ جیسے آج کل کے اکثر انگریز۔ جاپان میں بھی یہ سامراج یا جنگو کی بیماری موجود ہے۔ اور اس نے ادھر کچھ دنوں سے کوریا اور چین کے ساتھ

بہت بُرا سلوک کرنا شروع کیا ہے۔ اس لئے یہ بھی خوب بات ہے کہ جنگو اسی کی سب سے پہلی فرمان روا کا نام تھا جس کا تاریخ میں ذکر آیا ہے

یماٹو کے کوریا کے ساتھ بہت قریبی تعلقات رہے اور اسی کوریا کے ذریعہ سے اس نے چینی تہذیب حاصل کی ۔ ۴۰۵ء میں چین کا فن تحریر بھی کوریا ہو کر یہاں پہنچا۔ اسی طرح بودھ مت بھی یہاں آئی۔ کوریا کی تین ریاستوں میں سے ایک کا نام پکیچے تھا۔ اسی ریاست کے بادشاہ نے ۵۵۲ء میں یماتو کے بادشاہ کی خدمت میں بودھ کی ایک سونے کی مورتی اور بہت سے بودھ مبلغ مقدس کتابیں لے کر بھیجے تھے ۔

جاپان کا قدیم مذہب "شنٹو" تھا یہ چینی لفظ ہے جس کے معنی ہیں " دیوتاؤں کا راستہ"۔ یہ مذہب فطرت پرستی اور اجداد پرستی کا مجموعہ ہے۔ وہ آئندہ زندگی یا سربستہ رازوں اور پیچیدہ مسئلوں کے حل کرنے کے چکر میں نہیں پڑا وہ تو ایک سپاہی قوم کا مذہب تھا۔ اگرچہ جاپانی چینیوں سے اتنے قریب رہتے تھے اور تہذیب و تمدن کے معاملہ میں انھوں نے چینیوں سے بہت کچھ سیکھا بھی تھا۔ پھر بھی وہ ان سے بالکل مختلف ہیں ۔ چینی ہمیشہ امن پسند رہے ہیں اور اب بھی ان کی یہی حالت ہے ۔ ان کی تمام تہذیب اور فلسفۂ حیات امن کے اصول پر مبنی ہے۔ بخلاف اس کے جاپانی ہمیشہ جنگجو رہے ہیں اور اب بھی ان کی یہی فطرت ہے۔ ایک سپاہی کی خاص صفت یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے سردار اور اپنے ساتھیوں کا وفادار ہو۔ جاپانیوں میں یہی صفت ہے اور ان کی ساری قوت زیادہ تر اسی کی بدولت ہے۔ شنٹو مذہب اسی صفت کی تعلیم دیتا ہے" یعنی دیوتاؤں کی عزت کرو اور ان کی

اولاد کے وفادار رہو"۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ شنٹو مذہب اب تک جاپان میں باقی رہا اور آج بھی بودھ مذہب کے ساتھ ساتھ موجود ہے۔

لیکن کیا یہ واقعی کوئی خوبی ہے؟ اپنے ساتھی کا یا کسی مقصد کے وفادار ہونا تو واقعی ایک خوبی ہے لیکن شنٹو اور دوسرے مذاہب ہماری وفاداری سے جائز فائدہ اٹھاتے رہے ہیں، تاکہ ہم پر حکومت کرنے والی جماعت کو نفع پہنچے۔ جاپان روم اور دوسری جگہ یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ حاکم وقت کی پرستش کرو۔ چنانچہ آگے چل کر تم دیکھو گی کہ اس تعلیم نے دنیا کو کتنا شدید نقصان پہنچایا ہے۔

شروع شروع میں تو نئے بودھ مت اور پرانے شنٹو مذہب میں تھوڑی سی ٹکر ہوئی۔ لیکن اس کے بعد دونوں پہلو بہ پہلو رہنے لگے اور آج تک اسی طرح رہتے ہیں۔ ان دونوں میں سے شنٹو مذہب زیادہ مقبول ہے اور حکمراں طبقہ اس کی پشت پناہی کرتا ہے کیونکہ یہ ان کی تابعداری اور وفاداری سکھاتا ہے۔ بودھ مت اس کے مقابلہ میں ذرا خطرناک مذہب ہے کیونکہ اس کا بانی خود ایک باغی تھا۔

جاپان میں فنون لطیفہ کی تاریخ بودھ مت کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ اسی زمانہ میں جاپان یا یاماٹو کا چین سے براہ راست ربط ضبط بھی شروع ہوا۔ خاص کر تانگ بادشاہوں کے زمانہ میں جب کہ ان کی نئی راجدھانی سی آن فو تمام مشرقی ایشیا میں مشہور تھی جاپان سے برابر سفیر جاتے رہے۔ جاپانیوں نے بھی اپنی ایک نئی راجدھانی نارا نام سے قائم کی اور وہاں سی آن فو کی پوری پوری نقل اتارنے کی کوشش کی۔ جاپانیوں کو دوسروں کی نقل اتارنے میں ہمیشہ سے حیرت انگیز

کمال حاصل رہا ہے۔

جاپان کی تمام تاریخ اس قسم کے واقعات سے پُر ہے کہ بڑے بڑے خاندان اقتدار حاصل کرنے کی خاطر برابر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ دوسری جگہ بھی پرانے زمانے میں اسی قسم کی مثالیں ملیں گی۔ ان خاندانوں میں اب بھی قبائلی تصور موجود ہے۔ بہر حال جاپان کی تاریخ ان خاندانوں کی باہمی رقابتوں کی داستان ہے۔ ان کا شہنشاہ میکاڈو مختار کل مطلق العنان اور یک حد تک ربانی صفات کا مالک سمجھا جاتا ہے کیونکہ جاپانی اسے سورج کی اولاد میں مانتے ہیں شنٹو مذہب اور اجداد پرستی کی روایات نے اس خیال کو اور تقویت پہنچائی کہ عوام شہنشاہ کی مطلق العنانی کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور ملک کے با اقتدار لوگوں کی فرماں برادری کریں۔ لیکن جاپان میں یہ شہنشاہ اکثر دوسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح رہا ہے۔ جسے خود کوئی طاقت حاصل نہیں تھی۔ اصلی طاقت اور اختیارات کسی بڑے خاندان کے ہاتھ میں رہے ہیں جو بادشاہ گر تھے اور جس کو چاہتے تھے بادشاہ اور شہنشاہ بنایا کرتے تھے۔

سب سے پہلا جاپانی خاندان جو سلطنت پر حاوی ہوا سوگا خاندان تھا۔ انہی کے بودھ مذہب قبول کر لینے کی وجہ سے یہ جاپان کا درباری اور سرکاری مذہب قرار پایا تھا۔ ان کے ایک رہنما شوتوکو تائشی کا شمار جاپانی تاریخ کی زبردست شخصیتوں میں ہوتا ہے وہ پکا بودھ اور بڑا کامل آرٹسٹ تھا۔ وہ چین کی عہد کنفوشش کی تصانیف سے متاثر ہوا اور اس نے قوت پر نہیں بلکہ اخلاقی بنیادوں پر حکومت کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ جاپان اس زمانہ

یں مختلف قبیلوں سے بھرا پڑا تھا جن کے سردار قریب خود مختار تھے وہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے اور کسی کی حکومت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ شہنشاہ کا نام بہت بڑا تھا لیکن وہ بھی محض ایک قبیلے کا بڑے سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ شوتوکوتائشی نے اس صورت کو بدلا اور مرکزی حکومت کو مضبوط کرنا شروع کیا اس نے مختلف قبیلوں کے سرداروں اور امیروں کو شہنشاہ کا ماتحت اور باج گزار بنایا۔ یہ چھٹی صدی عیسوی کا ذکر ہے۔

لیکن شوتوکوتائشی کی موت کے بعد سوگا خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد جاپانی تاریخ کی ایک اور مشہور شخصیت منظر عام پر آئی۔ اس کا نام کا کا تو می تو کا ما توری تھا اس نے نظام حکومت میں طرح طرح کی تبدیلیاں کیں اور چینی طرز حکومت کی بہت کچھ نقل اتاری لیکن اس نے امتحان لے کر سرکاری افسروں کو مقرر کرنے کے طریقے کی جو اس زمانہ میں چین کی امتیازی چیز تھی پیروی نہیں کی۔ اب شہنشاہ کی حیثیت ایک قبیلے کے سردار سے کہیں زیادہ ہو گئی اور مرکزی حکومت بہت مضبوط اور مستحکم ہو گئی۔

اسی زمانہ میں نارا کو راجدھانی بنایا گیا لیکن بہت تھوڑے عرصہ کے لئے۔ اس کے بعد ۷۹۴ء میں کیوٹو کا شہر راجدھانی بنا اور تقریباً گیارہ سو برس تک رہا ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ ٹوکیو نے اس کی جگہ لی ہے ٹوکیو بہت بڑا جدید قسم کا شہر ہے لیکن اصل چیز کیوٹو ہے۔ جہاں جاپان کی اصلی روح نظر آتی ہے اور جس کے ساتھ ایک ہزار برس کی یادگاریں وابستہ ہیں۔

کا کا تو می تو کا ما توری سے فوجی وارہ خاندان شروع ہوا جسے جاپانی

تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہوئی۔ دو برس تک ان کی بالواسطہ حکومت رہی۔ شہنشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھے اور وہ انھیں اپنے خاندان کی لڑکیوں سے شادی کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ چونکہ دوسرے خاندانوں کے قابل لوگوں سے انھیں اندیشہ رہتا تھا اس لئے وہ انھیں خانقاہوں میں داخل ہونے اور راہب بننے پر مجبور کرتے تھے۔

جب جاپان کی راجدھانی نارا میں تھی اس وقت چینی شہنشاہ نے جاپان کے بادشاہ کے پاس ایک پیغام بھیجا اور اسے نائی نیہہ پنگ کوک یعنی طلوع آفتاب کی عظیم الشان سلطنت" کے بادشاہ کے لقب سے مخاطب کیا۔ جاپانیوں کو یہ نام بہت پسند آیا اور یماٹو سے کہیں زیادہ دلکش معلوم ہوا۔ اس لئے وہ اپنے ملک کو دئی نپّن کہنے لگے یعنی طلوع آفتاب کی سرزمین" اب بھی وہ لوگ اپنے ملک کو جاپان نہیں بلکہ نپّن ہی کہتے ہیں۔ خود جاپان کا لفظ کچھ عجیب طریقہ سے اسی نپّن سے نکلا ہے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ کوئی چھ سو برس بعد ایک اطالوی سیاح چین آیا اس کا نام مارکو پولو تھا وہ جاپان تو نہیں گیا لیکن اس نے اپنے سفرنامے میں وہاں کا حال لکھا ہے اس نے نیہہ پنگ کوک کا نام سنا تھا اسے کچھ بدل کر اس نے اپنی کتاب میں "جی پان گو" لکھا۔ اس سے لفظ جاپان بن گیا۔

شاید تم جانتی ہو یا ممکن ہے میں نے تمھیں بتایا ہو کہ ہمارے ملک کا نام انڈیا یا ہندوستان کیسے پڑا۔ دونوں نام انڈس یا سندھ ندی سے نکلے ہیں کیونکہ یہی ہندوستان کی خاص ندی سمجھی جاتی تھی۔ سندھو کی وجہ سے یونانی ہمارے ملک کو انڈوس کہنے لگے اور اس سے انڈیا بن گیا۔ اسی طرح سندھو سے ایرانیوں نے ہند د بنایا اور پھر ہندوؤں کا ملک ہندوستان کہلانے لگا۔

(۴۳)

ہرش وردھن اور ہیون سانگ

۱۱ مئی ۳۲ء

اب ہم پھر ہندوستان چلتے ہیں، ہن قوم کو اگرچہ شکست دے کر بھگا دیا گیا تھا۔ پھر بھی اس کے بہت سے لوگ ملک میں ادھر ادھر باقی رہ گئے تھے۔ گپتا خاندان بالا دت کے بعد ختم ہو گیا اور شمالی ہند میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں، جنوب میں پولاکیسن نے چلوکیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

کانپور سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ قنوج ہے۔ کانپور تو اب بہت بڑا شہر ہے۔ لیکن کارخانوں اور ان کے دود دانوں کی وجہ سے ہے بہت بدنما۔ اور قنوج اب ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ یعنی ایک گاؤں سے کچھ ہی بڑی۔ لیکن جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، قنوج بہت بڑی راجدھانی تھی۔ جو شاعروں، صناعوں اور فلسفیوں کے لئے بہت مشہور تھی۔ اور کانپور نے ابھی جنم بھی نہیں لیا تھا بلکہ اس کے کئی سو برس بعد بھی اس کا وجود نہیں تھا۔

قنوج تو موجودہ نام ہے۔ اس کا اصلی نام کنیا کبج ہے یعنی کبڑی لڑکی قصبہ یوں مشہور ہے کہ کسی پرانے رشی نے راجہ کی کسی حرکت کو اپنی توہین سمجھا اور اس کی سو لڑکیوں کو بد دعا دی جس سے وہ سب کبڑی ہو گئیں جب سے یہ شہر جہاں وہ رہتی تھیں "کبڑی لڑکیوں کا شہر" یعنی کنیا کبج کہلانے لگا۔

لیکن ہم اختصار کے خیال سے قنوج ہی کہیں گے۔ ایک موقع پر ہن قوم نے قنوج کے راجہ کو مار ڈالا اور اس کی بیوی راجیشری کو قید کر لیا۔ اس پر راجیشری کا بھائی راج وردھن ہنوں سے لڑنے اور اپنی بہن کو چھڑانے کے لئے آیا۔ اس نے اس کو شکست تو دے دی لیکن اس کے بعد وہ دھوکہ سے قتل کر دیا گیا۔ اب اس کا چھوٹا بھائی ہرش وردھن اپنی بہن راجیشری کی تلاش میں روانہ ہوا۔ یہ بیچاری کسی ترکیب سے وہاں سے بچ نکلی تھی اور پہاڑوں میں جا چھپی تھی۔ وہاں اپنی مصیبت سے تنگ آکر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ سنتے ہیں کہ وہ ستی ہونے ہی کو تھی کہ ہرش وہاں پہنچ گیا اور اس نے اس کی جان بچالی۔

بہن کے مل جانے کے بعد ہرش نے سب سے پہلا کام یہ کیا اس چھوٹے سے راجہ کو جس نے اس کے بھائی کو دھوکہ سے قتل کیا تھا سزا دی۔ چنانچہ اس نے نہ صرف اس راجہ کو سزا دی بلکہ تمام شمالی ہند فتح کر لیا۔ اور اب اس کی سلطنت بحر عرب سے خلیج بنگال تک اور ہمالیہ سے وندھیاچل تک ہوگئی۔ وندھیاچل کے دوسری طرف چلوکیہ سلطنت تھی۔ اس نے ہرش کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

ہرش وردھن نے قنوج کو اپنی راجدھانی بنایا۔ وہ خود بہت اچھا شاعر اور ڈرامہ نگار تھا۔ اس لئے اس نے اپنے دربار میں شاعروں اور صناعوں کا ایک مجمع اکٹھا کر لیا۔ اور قنوج دور دور مشہور ہوگیا۔ ہرش بہت پکا بودھ تھا۔ بودھ مت ایک جداگانہ مذہب کی حیثیت سے ہندوستان میں بہت کمزور ہو چکی تھی۔ کیونکہ برہمنوں نے اسے مذہب میں جذب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہرش غالباً ہندوستان کا آخری جلیل القدر بودھ راجہ

گذرا ہے۔

ہرش ہی کے زمانہ میں ہمارا پرانا دوست ہیوئن سانگ[1] ہندستان آیا۔ اور اس نے واپس جا کر جو سفر نامہ لکھا اس سے ہمیں ہندوستان کے اور وسطی ایشیا کے ان ملکوں کے جو اس کے راستے میں پڑے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں وہ بڑا متقی اور پرہیزگار بودھ تھا۔ اور یہاں بودھ مت کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے اور اپنے مذہب کی مقدس کتابیں حاصل کرنے آیا تھا وہ پورا صحرائے گوبی طے کرتا ہوا یہاں پہنچا اور راستے میں اس نے بہت سے مشہور مقامات دیکھے۔ مثلاً تاشقند سمرقند۔ بلخ۔ ختن اور یارقند وغیرہ۔ اس نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور شاید لنکا بھی گیا۔ اس کی کتاب عجیب وغریب اور دلکش مجموعہ ہے۔ مختلف ملکوں کے صحیح مشاہدات کا ہندوستان کے مختلف حصوں کے باشندوں کی حیرت انگیز سیرت نگاری کا جو آج بھی ہو بہو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ طرح طرح کے خیالی افسانوں کا جو اس کے سُننے میں آئے، اور بودھ اور بودھی ستو اس کے معجزوں کا۔ اس کا ایک بہت ہی عقلمند آدمی کا لطیفہ جو پیٹ پر تانبے کی چادریں باندھے پھرتا تھا میں تم سے بیان بھی کر چکا ہوں۔

وہ ہندوستان میں کئی برس رہا۔ خاص کر نالندہ کی یونیورسٹی میں جو پاٹلی پتر کے قریب ہی تھی۔ نالندہ خانقاہ بھی تھی اور یونیورسٹی بھی۔ کہتے ہیں کہ وہاں کوئی دس ہزار طالب علم اور بھکشور رہتے تھے یہ بودھ علم وادب کا بہت بڑا مرکز تھا اور بنارس کا جو اس زمانہ

---

[1] ہیون سانگ کو یون چنگ۔ یوان چوانگ یا سوان سنگ بھی کہتے ہیں۔

میں برہمنوں کا خاص علمی مرکز سمجھا جاتا تھا۔ مدمقابل تھا۔

میں ایک مرتبہ تمہیں بتا چکا ہوں کہ پُرانے زمانے میں ہندوستان کو اندو بھومی یعنی چاند کی سرزمین کہتے تھے۔ ہیون سانگ بھی یہی کہتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ نام نہایت موزوں تھا۔ چینی زبان میں بھی "اِن تو" چاند کو کہتے ہیں۔ اس لئے تم تھوڑی سی ادل بدل کر کے اپنا ایک چینی[1] نام رکھ سکتی ہو۔

ہیون سانگ ۶۲۹ء میں ہندوستان آیا۔ اس کا سن صرف ۲۶ برس کا تھا جب وہ چین سے اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ ایک قدیم چینی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ حسین اور دراز قامت تھا۔ "اس کا رنگ بڑا دلکش اور اس کی آنکھیں بڑی چمکدار تھیں۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور شاہانہ وقار ٹپکتا تھا اور اس کے خط و خال سے دلکشی اور آب و تاب پھوٹ کر نکلتی تھی۔۔۔۔ اس میں اس سمندر کا سا جاہ و جلال تھا جو کرۂ ارض کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور اس کنول کی سی متانت اور شگفتگی تھی جو اس سمندر کے بیچوں بیچ کھلا ہوتا ہے۔

بودھ بھکشو کی جوگیہ کفنی پہنے ہوئے وہ تن تنہا اپنے زبردست سفر پر روانہ ہو گیا۔ حالانکہ چین کے بادشاہ نے اسے اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ مرتا کھپتا صحرائے گوبی کو عبور کر کے **Turfan** کی سلطنت میں پہنچا۔ یہ ریگستانی سلطنت صحرا کے بالکل کنارے پر واقع تھی اور تہذیب و تمدن کا گویا ایک نخلستان تھی۔ اب اِس سلطنت کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے اور آثار قدیمہ کے متلاشی یہاں

---

[1] اندرا کا چھوٹا نام اندو ہے

پرانی یادگاریں کھود کھود کر نکالا کرتے ہیں۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں جب ہیون سانگ یہاں سے گذرا ہے تو یہ مقام شباب و حیات سے معمور اور اعلیٰ تہذیب و تمدن سے مالا مال تھا۔ یہ تمدن ہندوستانی، چینی اور ایرانی عناصر کا عجیب معجون مرکب تھا بلکہ کہیں کہیں اس میں یورپ کی جھلک بھی پائی جاتی تھی، بودھ مت کا دور دورہ تھا اور سنسکرت کے ذریعے ہندوستانی اثرات بہت نمایاں تھے۔ لیکن ان کا طرز معاشرت زیادہ تر چین اور ایران سے مستعار تھا۔ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ان کی زبان منگولی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ وہ ہندی یورپی تھی۔ جو بہت سی صورتوں میں یورپ کی کیلٹی زبانوں سے ملتی جلتی تھی۔ اس سے زیادہ اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں پتھر کی دیواروں پر ایسی تصویریں بنی ہیں جو یورپی شکلوں سے مشابہ ہیں۔ یہ نقش و نگار نہایت خوبصورت ہیں جن میں بودھ اور بودھی ستو اس کی اور دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ان کی دیویاں اکثر ہندوستانی لباس یا یونانی پوشاک اور ٹوپیاں پہنے ہوئے ہیں جن کے متعلق ایک فرانسیسی نقاد موسیو گردسے لکھتا ہے کہ وہ ہندوستان کے لوچ۔ یونان کی شیرینی اور چین کی دلکشی کا بڑا خوشنما مجموعہ پیش کرتی ہیں۔

ترفان؟ آج بھی موجود ہے اور نقشہ میں تم اسے دیکھ سکتی ہو لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے قدیم زمانہ میں بھی تہذیب و تمدن کی موجیں دور دور کے ملکوں سے آئیں اور یہاں ان کا ایک ہما ہنگ مرکب تیار ہو گیا۔

ترفان سے ہیون سانگ کوچہ پہنچا۔ یہ بھی وسطی ایشیار کا بہت مشہور مرکز تھا۔جس کی تہذیب بہت شاندار اور ترقی یافتہ تھی۔ یہ مقام خاص طور پر مغنیوں کے لئے اور عورتوں کے حُسن وجمال کے لئے مشہور تھا۔ اس کا مذہب اور آرٹ تو ہندوستان سے آیا تھا اور تہذیب وتجارت اسے ایران سے ملی تھی، ان کے علاوہ اس کی زبان سنسکرت۔ قدیم فارسی، لاطینی اور کلیلٹی سے مرکب تھی۔ یہ بھی ایک مجموعہ تھا۔

غرض یہاں سے ہیون سانگ آگے ترکوں کے ملک میں گیا جہاں خان اعظم (جو بودھ تھا) وسطی ایشیا کے بڑے حصے پر حکمراں تھا وہاں سے وہ سمرقند گیا جس کا شمار اس وقت بھی قدیم شہروں میں ہوتا تھا اور جہاں سکندر کی (جو ایک ہزار برس پہلے وہاں سے گزرا تھا) بیشمار یادگاریں باقی تھیں۔ پھر وہ بلخ گیا۔ اور وہاں سے دریائے کابل کی وادی اور کشمیر ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔

چین میں اس وقت تانگ خاندان کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جب کہ ان کی راجدھانی سی آن تو علوم وفنون کا مرکز بنی ہوئی تھی اور تہذیب کے معاملہ میں چین ساری دنیا سے آگے تھا۔ چونکہ ہیون سانگ ایک ایسے اعلیٰ تہذیب یافتہ ملک سے آیا تھا اس لئے تم سمجھ سکتی ہو کہ اس کا پرکھنے کا معیار کتنا بلند ہوگا۔ ایسی صورت میں ہندوستان کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت اہم اور قابل قدر ہے وہ ہندوستانیوں کی اور ان کے نظام حکومت کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جہاں تک عام آدمیوں کا تعلق ہے

اگرچہ فطرتاً ان کے مزاج میں تلون ہے۔ پھر بھی وہ نہایت راست باز اور آبرو والے ہیں۔ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں وہ چال فریب سے بالاتر ہیں اور عدل کرنے کے معاملہ میں نہایت محتاط ہیں۔...... عادتاً وہ دھوکے باز یا دغاباز نہیں ہیں اور اپنی قسموں اور وعدوں کے پابند ہیں۔ ان کے قوانین حکومت میں غیر معمولی دیانت پائی جاتی ہے اور ان کے عام رویہ میں بڑی نرمی اور مٹھاس ہے۔ مجرموں اور باغیوں کی تعداد وہاں بہت کم ہے اور جو ہیں بھی وہ آئے دن پریشان نہیں کرتے۔

آگے وہ لکھتا ہے "چونکہ ان کے نظام حکومت کی بنیاد شفقت پر ہے۔ اس لئے انتظامی عملہ بہت مختصر اور سادہ سا ہے..... لوگوں سے بیگار نہیں لی جاتی"۔ "چنانچہ محاصل کی تعداد اور مقدار بہت معمولی ہے اور لوگوں سے ذاتی خدمت بہت کم لی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے مال کی حفاظت سے بے کھٹکے چین سے رہتا ہے اور اپنی روزی کے لئے خود زمین جوتتا ہے۔ جو لوگ سرکاری زمین کاشت کرتے ہیں وہ پیداوار کا چھٹا حصہ بطور خراج کے دیتے ہیں اور تاجر اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ہر جگہ آزادی سے آتے جاتے ہیں"۔

لوگوں کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا اور وہ بہت کم عمر میں شروع ہو جاتی تھی۔ قاعدہ ختم کرنے کے بعد ہر لڑکا یا لڑکی سات برس کی عمر میں پانچ شاستروں کا مطالعہ شروع کر دیتا تھا۔ اب تو شاستروں کا مفہوم صرف مذہبی کتابیں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں ان سے ہر قسم کا علم مراد تھا۔ گویا پانچ شاستریں یہ تھیں۔ (۱) صرف و نحو (۲) صنعت و حرفت (۳) طب (۴) منطق (۵) فلسفہ۔ ان مضامین کی تعلیم

یونیورسٹیوں میں ہوتی تھی۔ اور اس کی تکمیل عموماً ۲۰ سال میں ہوتی تھی میرا خیال ہے کہ شاید بہت سے لوگ اس عمر تک نہ پڑھتے ہوں گے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ ابتدائی تعلیم نسبتاً بہت عام تھی، کیونکہ تمام بھکشو اور پروہت بچوں کو پڑھاتے بھی تھے اور ان کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہیون سانگ ہندوستانیوں کے تعلیم حاصل کرنے کے ذوق و شوق سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے۔

ہیون سانگ نے پریاگ کے کمبھ میلہ کا بھی حال لکھا ہے جب تم پھر یہ میلہ دیکھو تو تیرہ سو برس پہلے کی ہیون سانگ کی آمد کو یاد کرنا اور ذرا خیال کرنا کہ اس وقت بھی یہ قدیم میلہ تھا جو ویدک زمانہ سے چلا آتا تھا۔ اس قدیم میلے کے مقابلہ میں ہمارا الہ آباد گویا ابھی کل کی چیز ہے۔ کوئی چار سو برس سے کم ہوئے ہیں کہ اکبر نے اسے آباد کیا تھا پریاگ اس سے بہت پرانا تھا۔ لیکن اس سے بھی پرانی وہ کشش ہے جو ہزاروں برس سے سال بہ سال کروروں انسانوں کو گنگا اور جمن کے سنگم پر کھینچ لاتی ہے۔

ہیون سانگ لکھتا ہے کہ ہرش اگرچہ بودھ تھا لیکن اس مخصوص ہندو میلے میں برابر جاتا تھا۔ اس کی جانب سے ایک شاہی اعلان شائع ہوتا تھا جس میں "پنج ہند" کے تمام غریبوں اور محتاجوں کو عام دعوت دی جاتی تھی کہ اس میلہ میں آئیں اور اس کے مہمان ہوں چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس قسم کی دعوت دینا بڑی جرأت کا کام تھا۔ خیر اس کے بتانے کی ضرورت نہیں، کہ بے شمار آدمی یہاں آتے تھے، اور لاکھوں کو ہرش کے مہمان کی حیثیت سے خوراک مہیا

کی جاتی تھی۔ اس میلہ میں ہر پانچویں سال ہرش اپنے خزانہ کا تمام زائد مال مثلاً سونا۔ جواہرت، ریشم وغیرہ غرضکہ ہر چیز جو اس کے پاس ہوتی تھی لٹا دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ اس نے اپنا تاج اور قیمتی پوشاک بھی خیرات کر ڈالی اور اپنی بہن راجیشری سے ایک معمولی سا استعمال شدہ لباس لے کر پہن لیا تھا۔

متقی و پرہیزگار بودھ کی حیثیت سے ہرش نے خوراک کے لئے جانوروں کے ہلاک کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ غالباً برہمنوں نے بھی اس پر زیادہ اعتراض نہیں کیا ہوگا، کیونکہ بودھ کے ظہور کے بعد سے وہ گوشت خوری برابر ترک کرتے جا رہے تھے۔

ہیون سانگ کی کتاب میں بہت سی ایسی متفرق باتیں بھی لکھی ہیں، جنھیں سن کر تمہیں لطف آئے گا۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی شخص بیمار پڑتا تھا تو وہ فوراً سات دن کا برت رکھتا تھا۔ اکثر مریض اس برت ہی سے اچھے ہو جاتے تھے۔ لیکن اگر پھر بھی مرض باقی رہتا تھا تو پھر دوا کا استعمال کیا جاتا تھا۔ بیماری اس زمانہ میں غالباً عام نہ ہوگی اور نہ ڈاکٹروں کی اتنی ضرورت پڑتی ہوگی۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ راجہ اور فوج والے سب، قابل اور تعلیم یافتہ لوگوں کا احترام کرتے تھے ہندوستان اور چین میں اس امر کی خاص کوشش کی گئی تھی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی تھی کہ تعلیم اور تہذیب کو عزت کا درجہ حاصل ہو۔ دولت یا قوت کو نہیں۔

ہندوستان میں کئی برس رہنے کے بعد ہیون سانگ شمالی پہاڑوں کو طے کرتا ہوا وطن واپس پہنچا۔ راستہ میں وہ سندھ ندی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا اور اس کی بہت سی بیش قیمت کتابیں ضائع ہوگئیں۔ پھر بھی بہت سے مسودے بچ گئے۔ جن کے چینی ترجمہ میں وہ برسوں مصروف رہا۔ تانگ شہنشاہ نے سی آن فو میں اس کا بہت پرجوش استقبال کیا اور اسی نے ہیون سانگ کو مجبور کیا کہ اپنا سفرنامہ لکھے۔

ہیون سانگ نے ان ترکوں کا حال بھی لکھا ہے جن سے وہ وسطی ایشیا میں ملا تھا۔ یہ ایک نئی قوم تھی جو کچھ عرصہ بعد مغرب پہنچی اور وہاں اس نے بہت سی سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیا۔ ہیون سانگ لکھتا ہے کہ تمام وسطی ایشیا میں بودھ خانقاہیں موجود تھیں یہ خانقاہیں تو ایران۔ عراق۔ خراسان۔ موصل حتیٰ کہ شام کی سرحد تک ملتی تھیں۔ ایرانیوں کے متعلق ہیون سانگ کی رائے ہے کہ "وہ علم کی پروا نہیں کرتے بلکہ صنعت و حرفت پر اپنا تمام وقت صرف کرتے ہیں اور جو کچھ وہ تیار کرتے ہیں آس پاس کے ملک اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔"

پرانے زمانے کے سیاح کتنے عجیب لوگ تھے؟ ان کے مہیب سفروں کے مقابلہ میں آج کل کا وسط افریقہ یا قطبین کا سفر بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وہ برسوں چلتے چلے جاتے تھے۔ اور اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں سے کوسوں دور تن تنہا پہاڑوں اور ریگستانوں کو طے کیا کرتے تھے۔ شاید کبھی انھیں گھر کی یاد بھی ستاتی ہوگی۔ لیکن وہ اتنے

دل والے تھے کہ کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ البتہ ان میں سے ایک سیاح کی ذہنی کشمکش کی ایک ہلکی سی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ جب کہ وہ ایک دور دراز ملک میں کھڑا ہوا اپنے وطن کا تصور کرتا ہے اور اس کے لئے تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کا نام سنگ یون تھا اور ہیون سانگ سے کوئی سو برس پہلے ہندوستان آیا تھا۔ وہ ہندوستان کے شمال و مغرب میں گندھار دیس کے پہاڑوں میں تھا کہ اسے وطن کی یاد نے بےچین کر دیا۔ وہ لکھتا ہے "وہ نرم نرم نسیم کا پنکھے جھلنا۔ وہ چڑیوں کا چہچہانا۔ وہ پر بہار درختوں کا جھومنا۔ وہ خوشنما تیتریوں کا پھولوں پر نثار ہونا۔ یہ دلکش مناظر تھے کہ جب ان پر میری نظر پڑی تو میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور بے اختیار مجھے اپنا وطن یاد آنے لگا۔ اس سے مجھے قلق ہوا کہ میں سخت بیمار پڑ گیا۔"

(۴۴)

جنوبی ہند میں بہت سے بادشاہوں اور سپاہیوں اور ایک زبردست شخصیت کا ظہور

۱۳ رمئی ۳۲ء

راجہ ہرش نے ۶۴۸ء میں انتقال کیا۔ لیکن اس کے انتقال سے پہلے ہی ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر یعنی بلوچستان کے مطلع پر بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ یہ ٹکڑا اس زبردست طوفان کا پیش خیمہ تھا جو مغربی ایشیا۔ شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ میں زور شور سے آرہا تھا۔ عرب میں ایک نئے پیغمبر کا ظہور ہوا تھا۔ ان کا نام محمدؐ تھا اور انھوں نے ایک نئے مذہب اسلام کی تعلیم دی تھی۔ اس نئے مذہب کے جوش سے سرشار اور اعتماد نفس کے بل بوتے پر عرب تمام براعظموں پر دوڑ پڑے اور جہاں گئے فتح و نصرت نے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا اس لئے ہمیں اس نئی قوت کا جس نے دنیا میں آکر اس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے ذرا جنوبی ہند پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھتے چلیں کہ اس زمانہ میں اس کی کیا حالت تھی۔ مسلم عرب ہرش ہی کے زمانہ میں بلوچستان پہنچ گئے تھے اور انھوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ رُک گئے

اور پھر تین سو برس تک ہندوستان پر مسلمانوں کا کوئی حملہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد جو حملہ ہوا وہ بھی عربوں نے نہیں بلکہ وسطی ایشیا کے قبیلوں نے کیا تھا جو مسلمان ہو گئے تھے

اچھا۔ اب ہم جنوب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جنوب کے مغرب اور وسط میں یعنی اس علاقہ میں جسے مہاراشٹر کہتے ہیں۔ چلوکیہ سلطنت قائم تھی اور باداَمی اس کی راجدھانی تھی۔ ہیلون سانگ نے مہاراشٹر والوں کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی دلیری کو بہت سراہا ہے وہ لکھتا ہے کہ "وہ بڑے جنگجو اور باغیرت ہیں۔ بھلائی کا احسان مانتے ہیں اور برائی کا بدلہ لیتے ہیں"۔ چلوکیہ سلطنت کو شمال کی طرف تو ہرش کی روک تھام کرنی پڑی۔ جنوب کی طرف پالووَں کی اور مشرق کی طرف کا لنکا اڑیسہ والوں کی۔ ان کی طاقت بہت بڑھ گئی اور سلطنت بحر عرب سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔ لیکن اس کے بعد راسٹر کوٹوں نے ان کا خاتمہ کر دیا۔

غرض جنوب میں بڑی بڑی سلطنتیں اور بادشاہتیں قائم تھیں کبھی ایک دوسرے سے برابر کی ٹکر لیتی تھیں اور کبھی انہی میں سے کوئی سلطنت اوروں پر غالب آجاتی تھی۔ پنڈیہ بادشاہوں کے زمانے میں مدورا تہذیب و تمدن کا بہت بڑا مرکز تھا اور تامل زبان کے شاعروں اور مصنفوں کا وہاں اجتماع ہو گیا تھا۔ تامل زبان کی ادبیات کا دور عیسوی سنہ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ پالووں کو بھی کافی عروج حاصل ہوا۔ انھیں نے ملا ایشیا میں نوآبادیاں قائم کی تھیں۔ ان کی راجدھانی کانجی پورہ تھی جسے اب کانجی ورم کہتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد چولا سلطنت کو اقتدار حاصل ہوا اور نویں صدی

عیسوی کے وسط میں وہ سارے جنوبی ہند پر چھا گئی۔ یہ بحری قوت تھی اور اس کے پاس بہت بڑا بیڑا تھا جس سے اس نے تمام بحر عرب اور خلیج بنگال کو چھان مارا۔ ان کی خاص بندرگاہ کاویری پد نیم تھی جو دریائے کاویری کے دہانے پر واقع تھی۔ وجیالیہ ان کا پہلا بڑا راجہ تھا وہ شمال تک برابر بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ راشٹر کوتوں نے یکایک انھیں شکست دی۔ لیکن راج راجا کی سرکردگی میں وہ فوراً سنبھل گئے جس نے ان کی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ بحال کر دی یہ دسویں صدی کے آخری زمانہ کا ذکر ہے۔ جب کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کے حملے ہو رہے تھے۔ راج راجہ پر شمال کے واقعات کا کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ اپنی سامراجی مہمیں سر کرتا رہا اس نے لنکا کو بھی فتح کر لیا اور چولا راجہ وہاں ستر برس تک حکمرانی کرتے رہے۔ اس کا بیٹا راجیندر بھی اسی کی طرح جری اور جنگ جو تھا۔ اس نے جنوبی برما کو فتح کیا۔ حملہ کے وقت وہ جہازوں میں اپنے جنگی ہاتھی بھی لے گیا تھا وہ شمالی ہند بھی آیا اور اس نے بنگال کے راجہ کو شکست دی گویا چولا سلطنت بہت وسیع ہو گئی۔ اتنی وسیع کہ گپتا خاندان کے بعد یہی سب سے بڑی سلطنت گذری ہے۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی راجیندر بڑا بہادر سپاہی تھا لیکن ظالم بھی تھا اور جن علاقوں کو اس نے فتح کیا وہاں دلوں کو تسخیر کرنے کی کوشش نہیں۔ وہ ۱۰۱۳ء سے ۱۰۴۴ء تک برسر حکومت رہا لیکن اس کے مرنے کے بعد چولا سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور بہت سی باج گذار ریاستوں نے علم بغاوت بلند کیا۔

فتوحات سے قطع نظر چولا خاندان کا دورِ حکومت بحری تجارت کے لئے مشہور گزرا ہے۔ ان کے بنائے ہوئے نفیس سوتی کپڑے کی ہر جگہ مانگ رہتی تھی اور ان کی بندرگاہ کاویری پد نیم بڑی کاروباری جگہ تھی۔ جہاں تجارتی سامان سے لدے ہوئے جہاز دور دور سے آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کے یہاں یونانیوں کی بھی ایک بستی تھی۔ چولا خاندان کا ذکر مہابھارت میں بھی آیا ہے۔

میں نے انتہائی اختصار کے ساتھ جنوبی ہند کی کئی سو برس کی تاریخ بیان کر دی۔ ممکن ہے اس اختصار سے تمہیں الجھن ہو۔ لیکن کیا کیا جائے۔ ہم مختلف سلطنتوں اور شاہی خاندانوں کی بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو کیسے کھو دیں۔ ہمیں تو ساری دنیا کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس لئے اگر ہم کسی چھوٹے سے علاقہ میں چاہے وہ ہمارا وطن ہی کیوں نہ ہو، اُلجھ کر رہ جائیں تو پھر باقی کا کیا حشر ہوگا؟

سچ پوچھو تو ان بادشاہوں اور ان کی فتوحات سے زیادہ اہم اس زمانہ کے تمدنی اور جمالیاتی آثار ہیں۔ فنون لطیفہ کی یادگاریں جنوب میں شمال سے کہیں زیادہ ہیں۔ شمال کی اکثر یادگاریں، عمارتیں اور سنگتراشی کے نمونے تو مختلف لڑائیوں اور مسلمانوں کے حملوں سے تباہ ہوگئے۔ لیکن جنوب میں وہ مسلمانوں کے پہنچنے کے باوجود بچ گئے واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ شمال کی بے شمار خوبصورت یادگاریں تباہ و برباد ہوگئیں۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جو مسلمان یہاں آئے وہ وسطی ایشیا سے تعلق رکھتے تھے۔ عرب نہیں تھے۔ بہر حال وہ مذہبی جوش سے سرشار تھے۔ اس لئے بت شکنی پر تلے ہوئے تھے

لیکن ان مندروں کو تباہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ یہ کہ پرانے مندر عموماً قلعے اور گڑھ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے تھے جنوب کے بہت سے مندر آج بھی قلعوں سے مشابہ ہیں جہاں حملہ کی کی صورت میں لوگ پناہ لے سکتے ہیں۔ گویا یہ مندر پوجا کے علاوہ اور بہت سے کاموں میں بھی آتے تھے۔ وہ گاؤں کے مدرسے تھے۔ وہ پنچایت گھر تھے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو دشمن کی مدافعت کے لئے قلعہ کا کام بھی دیتے تھے۔ گویا گاؤں کی ساری زندگی کا محور یہ مندر تھے۔ اس لئے لازمی طور پر مندروں کے پروہتوں اور پنڈتوں کی ہر معاملہ میں چلتی ہوگی اور وہی کرتا دھرتا ہوں گے۔ بہرحال مسلمان حملہ آوروں نے غالباً اسی وجہ سے مندروں کو تباہ کیا کہ وہ اکثر گڑھی کی حیثیت سے استعمال کئے جاتے تھے۔

تنجور میں اس زمانہ کا ایک بہت خوبصورت مندر موجود ہے جو چولا راجا (راج راجا) نے بنوایا تھا۔ بادامی اور کانچی درم میں بھی بڑے اچھے مندر ہیں۔ لیکن اس زمانہ کا سب سے حیرت انگیز مندر ایلورا کا کیلاش مندر ہے۔ یہ پتھر کی ایک چٹان کو تراش تراش کر بنایا گیا ہے۔ سنگ تراشی کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا آٹھویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی تھی۔

کانسے پر کندہ کاری کے بھی بڑے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً نتراجہ یعنی شیو کے رقص حیات کا منظر نہایت مشہور و معروف ہے۔

چولا راجہ راجیندر اول نے چولا پورم میں آبپاسی کے لئے ایک سولہ میل لمبا حیرت انگیز بند تعمیر کیا تھا جس سے معماری کا کمال ظاہر

ہوتا تھا۔ اس کی تعمیر کے سو برس بعد ایک عربی سیاح البیرونی وہاں گیا تھا۔ اور اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا وہ لکھتا ہے "ہمارے ملک والے جب اسے دیکھتے ہیں تو حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ ایسی چیزوں کا تعمیر کرنا تو کجا وہ تفصیل سے انھیں بیان بھی نہیں کر سکتے۔"

اس خط میں، میں نے چند بادشاہوں اور شاہی خاندانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جنھوں نے جاہ وجلال کی چند روزہ زندگی بسر کی۔ پھر فنا ہو گئے اور آج ان کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ لیکن جنوب سے ایک ایسا حیرت انگیز شخص بھی اٹھا جس کا تمام بادشاہوں اور شہنشاہوں سے زیادہ ہندوستانی زندگی پر اثر پڑنے والا تھا اس نوجوان کا نام شنکر آچاریہ تھا۔ غالباً وہ آٹھویں صدی کے آواخر میں پیدا ہوا تھا وہ حیرت انگیز ذکاوت کا مالک تھا۔ اس نے ہندو دھرم یا اس کے ایک خاص عقلی مذہب شیومت کو نئے سرے سے زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اُس نے بودھ مت سے جنگ کی، دلیل اور عقل کی جنگ اور بودھ سنگ کی طرح سنیاسیوں کے مٹھ قائم کئے جس میں ہر ذات کے لوگ شامل ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کے چاروں کونوں پر اس نے اس طرح کے چار مٹھ قائم کئے تھے۔ ایک شمال میں تھا۔ ایک مغرب میں۔ ایک جنوب میں اور ایک مشرق میں، اس نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور جہاں گیا کامرانی نے اس کے قدم چومے وہ بنارس میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا جس نے دلیل کی رو سے ذہنوں پر فتح حاصل کی تھی بالآخر وہ ہمالیہ میں کدارناتھ گیا جسے ابدی برف ڈھکے رہتی ہے۔ اور وہیں اس نے انتقال کیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۳۲ برس یا اس

سے کچھ زیادہ تھی۔

شنکر آچاریہ کا کارنامہ بہت شاندار تھا۔ بدھ مت جو شمال سے جنوب کی طرف ہٹ گیا تھا اب ہندوستان سے بالکل فنا ہوگیا اور ہندو دھرم اور اس کے خاص فرقے شیومت کا سارے ملک میں طوطی بولنے لگا۔ شنکر آچاریہ کی کتابوں۔ شرحوں اور طرز استدلال سے تمام ملک میں ایک ذہنی انقلاب برپا ہوگیا۔ وہ نہ صرف برہمن طبقہ کا رہنما بن گیا بلکہ جمہور میں بھی بے انتہا مقبول ہوا۔ محض اپنی عقل و دانش کی قوت پر کسی کا اپنی شخصیت قائم کرلینا نہایت غیر معمولی بات ہے اور اس سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ وہ لاکھوں انسانوں کے دلوں پر اور تاریخ کے صفحات پر اپنا نقش قائم کردے۔ بڑے بڑے سپاہیوں اور فاتحوں کی شخصیتیں تاریخ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس سے لوگوں کو نفرت یا محبت ہوتی تھی اور کبھی کبھی انھوں نے تاریخ کی رفتار پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی گذرے ہیں۔ جنھوں نے لاکھوں متاثر اور ان کے دلوں کو جوش عمل سے معمور کردیا ہے لیکن یہ سب ہمیشہ عقیدہ کی بنا پر ہوا۔ انھوں نے لوگوں کے جذبات کو ابھارا اور انھی سے کام لیا۔

لیکن دلیل اور عقل سے منوا کر لوگوں سے کام لینا بہت مشکل ہے۔ بدقسمتی سے اکثر لوگ سوچتے نہیں ہیں۔ وہ صرف محسوس کرتے ہیں اور انھی احساسات کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ مگر شنکر آچاریہ کا خطاب ذہن اور عقل سے تھا۔ انھوں نے یہ نہیں کیا کہ کسی پرانی کتاب کے ادعائی عقیدہ کو لے کر دہرایا کرتے

انھوں نے عقائد کی محض تکرار نہیں کی، یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان کا استدلال صحیح تھا یا غلط دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی مسائل کو عقلی حیثیت سے پیش کیا اور اس سے زیادہ دلچسپ یہ کہ اس رویہ کے باوجود انھیں کتنی کامیابی ہوئی اس سے ہمیں اس زمانہ کے فرمان روا طبقہ کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔

تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہندو فلسفیوں میں چروک نامی ایک ایسا شخص بھی گذرا ہے جو دہریت کی تلقین کرتا تھا۔ یعنی یہ کہتا تھا کہ خدا کا کوئی وجود ہی نہیں۔ آج کل تو بہت سے لوگ خاص کر روس میں خدا کے منکر ہیں لیکن یہاں اس سے بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس موقعہ سے محض یہ ثابت کرنا ہے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان میں خیال اور تحریر و تقریر کی پوری آزادی تھی، گویا ہر شخص کا ضمیر آزاد تھا۔ یورپ کو ابھی کچھ عرصہ تک بھی یہ چیز نصیب نہیں تھی اور اب بھی اس سلسلہ میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔

شنکر آچاریہ کی مختصر اور ان تھک زندگی سے ایک اور بات بھی ثابت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ تمدنی حیثیت سے سارا ہندوستان بالکل ایک تھا۔ تمام قدیم تاریخ اس کی شاہد ہے۔ جغرافیہ کے لحاظ سے تو، تم جانتی ہو، کہ ہندوستان بالکل ایک چیز ہے۔ سیاسی حیثیت سے گو وہ کبھی کبھی مختلف ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔ تاہم زیادہ تر ایک ہی مرکزی حکومت کے ماتحت رہا۔ لیکن تمدنی حیثیت سے وہ ابتدا سے متحد رہا ہے۔ کیونکہ سارے ہندوستان کا ایک وہی پس منظر۔ وہی روایات، وہی مذہب، وہی ہیرو، وہی دیومالا، وہی علمی زبان (سنسکرت) رہی ہے۔ ان کی پرستش گاہیں بھی ایک ہی تھیں جو

سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سب جگہ وہی گانووں کی پنچائتیں تھیں، وہی نظریئے تھے اور وہی نظام حکومت ہر ہندوستانی سارے ملک کو "پنیہ بھومی" یعنی مقدس جگہ سمجھتا تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ باقی دنیا میں عموماً ملیچھ اور جنگلی لوگ آباد ہیں گویا ایک ایسی عام ہندی ذہنیت پیدا ہو گئی تھی جس پر ملک کی سیاسی تفریق کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرکزی حکومت میں چاہے کتنی تبدیلیاں ہوتی رہیں گاؤں کا پنچایتی نظام برقرار رہتا تھا۔

شنکر آچاریہ نے ہندوستان کے چاروں کونوں پر اپنے سنیاسیوں کے حلقے کے جو مٹھ قائم کئے تھے اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کو تمدنی حیثیت سے بالکل ایک سمجھتے تھے۔ پھر نہایت مختصر مدت میں سارے ہندوستان میں ان کی تحریک کو جو زبردست کامیابی ہوئی اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ذہنی اور تمدنی لہریں کس تیزی سے ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتی تھیں۔

شنکر آچاریہ نے شیومت کا پرچار کیا۔ چنانچہ یہ مت خاص کر جنوب میں بہت مقبول ہوئی۔ جہاں پرانے مندروں میں سے زیادہ مندر شیو کے نام کے ہیں۔ شمال میں گپتا دور میں وشنومت اور کرشن پوجا کا نئے سرے سے رواج ہوا۔ ہندو دھرم کے ان دونوں فرقوں (شیومت و شنومت) ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔

یہ خط کافی طویل ہو گیا۔ لیکن مجھے ابھی دور وسطیٰ میں ہندوستان کی حالت کے متعلق بہت کچھ کہنا ہے۔ اچھا۔ اب اگلے خط میں دیکھا جائے گا۔

(۴۵)

زمانہ وسطیٰ میں ہندوستان کی حالت

۱۴ مئی ۱۹۳۲ء

تمہیں خیال ہوگا کہ میں نے ایک کتاب ارتھ شاستر کا تم سے ذکر کیا تھا جو چانک یا کوتلیہ کی تصنیف ہے۔ یہ شخص اشوک کے دادا چندر گپت موریہ کا وزیر اعظم تھا۔ اس کتاب میں اس زمانہ کے لوگوں کی اور ان کے طرز حکومت کی ہر طرح کی تفصیل لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح کے ہندوستان کی ایک کھڑکی کھل گئی جس میں سے جھانک کر ہم اس وقت کا تھوڑا بہت حال دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کتابیں جن میں نظام حکومت کی پوری تفصیل دی ہو۔ ان کتابوں کے مقابلہ میں کہیں مفید ہوتی ہیں۔ جن میں بادشاہوں کا یا ان کی فتوحات کا مبالغہ آمیز حال درج ہو۔

چنانچہ ارتھ شاستر کی طرح کی ایک اور کتاب بھی ہے جس سے ہمیں دور وسطیٰ کے ہندوستان کے متعلق ایک اندازہ کرنے میں تھوڑی سی مدد ملتی ہے۔ اس کا نام نیتی سارا ہے جو شکر آچاریہ کی تصنیف ہے وہ ارتھ شاستر کی ٹکر کی تو نہیں ہے لیکن کچھ تو اس کی اور دوسری کتابوں کی مدد سے اور کچھ کتبوں وغیرہ کی مدد سے ہم یہ کوشش کریں گے کہ نویں یا دسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی ایک کھڑکی کھل جائے۔

نیتی سار امیں لکھا ہے کہ "رنگ یا نسل کے ذریعہ سے انسان کی روح برہمن نہیں بن سکتی"۔ گویا اس نظریہ کے مطابق ذات پات کی تقسیم نسل کی رو سے نہیں بلکہ اہلیت اور قابلیت کی رو سے ہونا چاہئے۔ آگے اس میں لکھا ہے کہ "سرکاری عہدوں پر تقرر کرتے وقت کام کرنے کی اہلیت سیرت اور ذاتی قابلیت کا لحاظ کرنا چاہئے نہ کہ ذات پات یا خاندان کا"۔ راجہ کو یہ تاکید ہے کہ وہ خودرائی سے کام نہ لے بلکہ جمہور کی رائے پر چلے۔ "رائے عامہ راجہ سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ جیسے پتلے پتلے دھاگوں کا بٹا ہوا رسا اتنا مضبوط ہوتا کہ شیر کو کھینچ لے جاتا ہے"۔

یہ سب بڑے اچھے نظریئے ہیں جو کہنے میں آج بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن سچ پوچھو تو ان سے عمل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ صحیح ہے کہ انسان اہلیت اور قابلیت کے ذریعہ بلند ہو سکتا ہے لیکن وہ یہ اہلیت و قابلیت حاصل کیونکر کرے؟ فرض کرو کہ کوئی لڑکا یا لڑکی بہت تیز اور ذہین ہے اور اگر معقول تعلیم و تربیت ہو جائے تو نہایت ہوشیار اور لائق آدمی بن سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہی نہ ہو تو وہ لڑکا یا لڑکی بیچاری کیا کرے؟

اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ رائے عامہ کسے کہتے ہیں؟ اور کن لوگوں کی رائے کو رائے عامہ سے تعبیر کرنا چاہئے؟ غالباً نیتی سارا کا مصنف لاکھوں شودر خادموں اور مزدوروں کو رائے دینے کا حق دار نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بیچارے کسی گنتی میں تھے

شاید رائے عامہ کا مفہوم محض با اقتدار اور اعلیٰ طبقہ کی رائے سے تھا
تاہم یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پہلے کی طرح ہندوستان کے زمانۂ وسطیٰ میں راجہ کے خداداد حقوق یا مطلق العنان حکومت کا نظریہ تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ وہ اس کتاب میں راجہ کی مجلس مشاورت کا ان اعلیٰ افسروں کا جن کے تحت میں کارہائے عامہ، چمن اور جنگل ہوتے تھے، دیہاتی اور شہری زندگی کی تنظیم کا، پلوں۔ گھاٹوں، سراؤں سڑکوں اور شہر یا گاؤں کی سب سے ضروری چیز یعنی نالیوں کا بھی حال درج ہے۔

گاؤں کی پنچایت کو اپنے گاؤں کے معاملات پر پورا اختیار ہوتا تھا اور سرکاری افسر پنچوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پنچایت ہی کاشت کے لئے زمین اٹھاتی تھی۔ وہی محاصل جمع کرتی تھی اور پھر سارے گاؤں کی طرف سے سرکاری مطالبہ داخل کرتی تھی اس کے علاوہ شاید ایک بڑی پنچایت یا مہاسبھا بھی ہوتی تھی جو سب پنچایتوں کے کام کی نگرانی کرتی تھی اور حسب ضرورت اس میں دخل بھی دیتی تھی۔ ان پنچایتوں کو عدالتی اختیارات بھی تھے، وہ منصب کی حیثیت سے مقدموں کی سماعت کرتی تھیں اور لوگوں کو سزا بھی دے سکتی تھیں۔

جنوبی ہند کے بعض قدیم کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ پنچ کس طرح منتخب ہوتے تھے اور ان کو اس کا اہل یا نااہل قرار دینے کی کیا خصوصیات مقرر تھیں۔ اگر کوئی پنچ پنچایتی روپئے کا حساب

نہیں دیتا تھا تو اسے نااہل قرار دیدیا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک نہایت عجیب قاعدہ یہ بھی تھا کہ پنچوں کے قریبی رشتہ داروں کا کسی عہدے پر تقرر نہیں ہو سکتا تھا۔ کاش یہ قانون آج بھی ہماری کونسلوں۔ اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں نافذ ہوجائے تو کیسا اچھا ہو۔

پنچایت کی کمیٹیوں کے رکن کی حیثیت سے ایک عورت کا بھی نام آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں بھی پنچایتوں اور ان کی کمیٹیوں میں منتخب ہو سکتی تھیں

یہ کمیٹیاں پنچایت کے منتخب شدہ اراکین میں سے ترتیب دی جاتی تھیں اور ہر کمیٹی ایک سال تک کام کرتی تھی۔ اگر کوئی رکن کسی قسم کی بدعنوانی کرتا تھا فوراً اسے برطرف کر دیا جاتا تھا۔

آریوں کے آئین حکومت کی بنیاد دیہی خود مختاری کے اسی نظام پر قائم تھی۔ اسی کی بدولت اسے تقویت حاصل تھی۔ گاؤں کی پنچائتیں اپنی آزادی کا بہت زیادہ پاس کرتی تھیں حتی کہ انھوں نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ کوئی سپاہی سرکاری پروانہ کے بغیر گاؤں کے اندر قدم نہ رکھنے پائے۔ نیتی سارا میں لکھا ہے کہ جب رعایا کسی افسر کی شکایت کرے تو راجہ کو اپنے افسر کی حمایت نہیں کرنی چاہیے بلکہ رعایا کا ساتھ دینا چاہیئے" اور اگر بہت سے لوگوں کو شکایت ہو تو اس افسر کو فوراً برخاست کر دینا چاہیئے۔ (بقول نیتی سارا "عہدے کے نشے سے کس کا دماغ خراب نہیں ہو جاتا" کیسی عمدہ بات ہے! کیا یہ افسروں کی اس جماعت پر پوری طرح صادق

نہیں آتی جو آج ہمارے ملک میں طرح طرح کی بے عنوانیاں اور بد نظمیاں کرتے ہیں؟

بڑے بڑے شہروں میں جہاں بہت سے دستکار اور تاجر ہوتے تھے ان کی انجمنیں بنا دی جاتی تھیں۔ چنانچہ دستکاروں کی انجمنیں لین دین کے ادارے اور تاجروں کی سبھائیں سب موجود تھیں۔ ان کے علاوہ مذہبی مجلسیں بھی تھیں۔ ان سب جماعتوں کو اپنے نجی معاملات میں پورا اختیار ہوتا تھا۔

راجہ لوگوں پر اتنا کم محصول عائد کرتا تھا کہ نہ انھیں کوئی نقصان پہنچے اور نہ وہ اس کے بوجھ سے دب جائیں گویا وہ اس مالی کی طرح محصول وصول کرتا تھا جو ہار گوندھنے کے لئے درختوں کے صرف پھول اور پتیاں توڑ لیتا ہے۔ اس شخص کی طرح نہیں جو جلانے کی لکڑی کی خاطر درخت کو جڑ سے کاٹ ڈالتا ہے۔

ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کے متعلق اسی قسم کی متفرق معلومات ادھر ادھر ہمیں مل جاتی ہیں۔ اس کا پتہ چلانا ذرا مشکل ہے کہ ان کتابوں میں جو زرّین نظریئے لکھے ہیں ان پر عمل کہاں تک ہوتا تھا کتابوں میں اچھے اچھے نظریئے اور اصول لکھ دینا تو آسان ہے لیکن ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔ بہر حال کتابوں سے ہمیں یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ کسی زمانے کے لوگوں کے خیالات اور تصورات کیا تھے، چاہے وہ ان پر پوری طرح عمل پیرا رہے ہوں یا نہ رہے ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے راجا اور حاکم مطلق العنان نہیں تھے۔ منتخب شدہ پنچایتیں ان کی روک تھام رکھتی تھیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شہروں اور

گانوؤں میں حکومت خود اختیاری کا دور دورہ تھا اور مرکزی حکومت اس میں بہت کم دخل دیتی تھی۔

لیکن جب میں لوگوں کے نظریات یا حکومت خود اختیاری کا تذکرہ کرتا ہوں تو اس سے میرا کیا مفہوم ہے ؟ ہندوستان کا تمام سماجی نظام ذات پات کے اصول پر قائم تھا۔ ممکن ہے کہ اصولاً اس میں کوئی سختی نہ ہو اور بقول ینتی سارا قابلیت یا اہلیت کو بھی اس میں دخل ہو۔ لیکن دراصل اس سے بہت کم فرق پڑتا ہے۔ حکومت برہمنوں چھتریوں کے ہاتھ میں تھی۔ بعض اوقات ان میں بالا دستی کے لئے ٹکر بھی ہو جاتی تھی لیکن عموماً یہ دونوں مل جل کر حکومت کرتے تھے اور ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ دوسروں کو وہ اُبھرنے نہیں دیتے تھے رفتہ رفتہ جب تجارت کو فروغ ہوا تو تاجروں کا طبقہ دولت مند ہو گیا اور اسے کچھ اہمیت حاصل ہو گئی۔ جیسے جیسے اسے اہمیت حاصل ہوتی گئی اس کے ساتھ کچھ رعاتیں ہونے لگیں اور اپنے طبقے کے نجی معاملات کا انتظام کرنے کی آزادی دے دی گئی لیکن حکومت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اور بیچارے شوار تو ہمیشہ ان سب سے نیچے رہے پھر ان سے نیچے بھی کچھ اور طبقے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی نیچ ذات کے لوگوں کو بھی موقع ملا ہے شودر بھی کبھی تخت تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہوا ہے۔ کسی پوری جماعت کے لئے سماجی میدان میں ترقی کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک قدم بڑھ جاتی تھی اور اکثر نئی قومیں ہندو دھرم میں شامل ہو جاتی تھیں۔ جنھیں ان کے نیچے جگہ ملتی تھی

رفتہ رفتہ اسی طرح وہ بھی آگے بڑھتی تھیں۔

اس لئے تمہیں یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ اگرچہ ہندوستان میں مغرب کی طرح غلامی کا رواج نہیں تھا لیکن ہمارا تمام سماجی نظام تفریق مدارج کے اصول پر قائم تھا۔ یعنی ایک طبقہ دوسرے کے اوپر تھا لہٰذا ان لاکھوں انسانوں کو جو سب سے نیچے ہوتے تھے اوپر والوں کا پورا بوجھ برداشت کرنا پڑتا تھا اور وہ سب مل کر ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اس کے علاوہ اوپر والے یہ کوشش کرتے تھے کہ یہ صورت ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے اور ساری طاقت انھی کے ہاتھ میں رہے۔ اس خیال سے وہ نیچے والوں کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا کبھی اتنا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔ کہ وہ اُبھر سکیں۔ گاؤں کی پنچایتوں میں شاید کسانوں کی کچھ آواز تھی اور وہاں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ چند ہوشیار برہمن ان پنچایتوں پر بھی چھا جاتے ہوں۔

آریوں کا قدیم سیاسی نظام اس زمانہ سے لے کر جب کہ وہ ہندوستان آئے اور دراوڑوں سے ان کا خلا ملا ہوا اس دورِ وسطیٰ تک جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، برابر جاری رہا۔ لیکن اس میں تدریجی تنزل اور کمزوری پیدا ہوتی گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ نظام پُرانا ہوگیا تھا یا شاید پیہم بیرونی حملوں نے رفتہ رفتہ اسے ناکارہ کردیا تھا۔

تمہیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ پرانے زمانے میں ہندوستان ریاضی میں بہت بڑھا ہوا تھا اور یہاں کے بڑے بڑے ریاضی دانوں میں ایک عورت لیلاوتی بھی مشہور گزری ہے۔ کہتے ہیں کہ

لیلاوتی اور اس کے والد بھاسکر آچاریہ اور شاید ایک اور شخص برھما گپتا نے سب سے پہلے کسرِ اعشاریہ ایجاد کی تھی۔ سنتے ہیں کہ الجبرا بھی ہندوستان کی ایجاد ہے۔ ہندوستان سے یہ عرب پہنچا اور وہاں سے یورپ۔ یہ لفظ "الجبرا" عربی سے نکلا ہے۔

(۴۶)

عالیشان انگ کور اور شری وجے

۱۷ر مئی ۳۲ء

اب چلو ذرا "ہند مزید" کو چلیں یعنی جنوبی ہند والوں کی ان نوآبادیوں اور بستیوں کو جو ملا ایشیا ر اور ہندی چین میں قایم ہوئی تھیں۔ یہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ان نوآبادیوں کو خاص اہتمام سے بالقصد بسایا گیا تھا وہ خود بخود آباد نہیں ہو گئیں۔ سمندر کے پیہم سفر کئے گئے ہوں گے اور جہازوں کی کافی مہارت حاصل کر لی ہوگی۔ جب کہیں مختلف مقامات پر بیک وقت یہ نوآبادیاں قائم کی گئی ہوں گی۔ یہ بھی میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ نوآبادیاں پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں قائم ہوئیں۔ یہ سب ہندو نوآبادیاں تھیں اور ان کے نام عموماً جنوبی ہند کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔ چند صدیوں کے بعد رفتہ رفتہ بودھ مت یہاں پھیلی حتیٰ کہ ساری ملا ایشیار بودھ ہو گئی۔

اچھا چلو پہلے ہندی چین چلیں۔ یہاں کی سب سے پہلی نوآبادی کا نام چمپا تھا۔ یہ انام میں واقع تھی۔ وہاں تیسری صدی عیسوی میں شہر پنڈ رنگم مشہور رہا ہے۔ اس کے دو سو برس بعد ایک دوسرے عظیم الشان شہر کمبوجہ کا عروج ہوا۔ یہ عالیشان عمارتوں اور پتھر کے مندروں سے بھرا پڑا تھا۔ یہیں نہیں بلکہ ساری ہندوستانی نوآبادیوں میں عالیشان عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ بڑے بڑے صناع اور معمار تھا

کے استاد ہندوستان سے گئے ہوں گے۔ وہ اپنے ساتھ ہندوستانی فن تعمیر کی روایات بھی لیتے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف نوآبادیوں اور جزیروں میں عمارتوں کے معاملہ میں خوب مقابلہ رہتا تھا۔ اور اس مقابلہ کی بدولت صناعی کے بہترین نمونے وجود میں آتے تھے۔

ان نوآبادیوں کے باشندے فطرتاً جہازرانی میں بہت ملکہ رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ انھوں نے یا ان کے آبا واجداد نے یہاں تک پہنچنے کے لئے بہر حال سمندر پار کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ چاروں طرف سمندر سے گھرے ہوئے تھے۔ جہازراں قوم بڑی آسانی سے تجارت کا پیشہ اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی تاجر تھے وہ اپنا مال سمندر کے راستے مختلف جزیروں کو لے جاتے تھے اور مغرب میں ہندوستان تک اور مغرب میں چین تک پہنچتے تھے۔ گویا ملا ایشیار کی مختلف حکومتیں عموماً تاجر طبقہ کے ہاتھ میں تھیں۔ اکثر ان میں آپس میں کشمکش رہتی تھی۔ کبھی کبھی بڑی لڑائیوں اور قتل و غارت کی نوبت بھی آجاتی تھی بعض اوقات کوئی ہندو ریاست کسی بودھ ریاست پر دھاوا بول دیتی تھی۔ لیکن اس زمانہ میں ان لڑائیوں کا کوئی مذہبی مقصد نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کی تہ میں تجارتی رقابت کام کرتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل بڑی بڑی طاقتوں میں اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی خاطر جنگ ہوجاتی ہے۔

تقریباً ۳ سو برس تک یعنی آٹھویں صدی عیسوی تک ہندی چین میں تین ہندو ریاستیں رہیں۔ نویں صدی میں وہاں ایک زبردست راجہ پیدا ہوا جس کا نام وجے ورمن تھا۔ اس نے ان تینوں ریاستوں

کو ملا کر ایک زبردست سلطنت بنالی۔ وہ غالباً بودھ تھا۔ اس نے رنگ کورمیں اپنی راجدھانی بنانا شروع کی جسے اس کے جانشین یشو ورمن نے تکمیل تک پہنچایا۔ کمبوڈیہ کی یہ سلطنت کوئی چارسو برس تک قائم رہی عام سلطنتوں کی طرح یہ بھی نہایت شانداور طاقتور کہی جاتی تھی۔ شاہی صدر مقام رنگ کور تھام سارے مشرق میں "عالیشان رنگ کور" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے قریب ہی رنگ کور روٹ کا عجیب وغریب مندر تھا۔ تیرھویں صدی میں کمبوڈیہ پر چاروں طرف سے حملے شروع ہوئے، اانام والوں نے مشرق کی طرف سے اور مقامی قبیلوں نے مغرب کی طرف سے دھاوا بول دیا چونکہ منگولوں نے شان قوم کو ان کے وطن سے نکال دیا تھا اس لئے جب اُنھیں اور کوئی جائے پناہ نہیں ملی تو شمال کی جانب سے انھوں نے بھی کمبوڈیہ پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ سلطنت کمبوڈیہ اس مسلسل جنگ اور مدافعت سے عاجز آگئی۔ پھر بھی شہر رنگ کور کا شمار مشرق کے عالیشان شہروں میں ہوتا رہا۔ ایک چینی سفیر نے جو ۱۲۹۷ء میں کمبوڈیہ کے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ یہاں کی عجیب وغریب عمارتوں کی بہت تعریف لکھی ہے۔

لیکن یکایک رنگ کور پر ایک زبردست آفت نازل ہوئی ۱۳۰۰ء میں دریائے میکانگ کے دہانے پر اتنی مٹی جمع ہوگئی کہ اس کا بہاؤ رک گیا۔ چنانچہ پانی پیچھے کو لوٹا اور اس عظیم الشان شہر کے آس پاس کا تمام علاقہ تہ آب ہوگیا۔ جس کی وجہ سے تمام زرخیز کھیت اور میدان دلدل بن گئے۔ اب شہر کی ساری آبادی بھوکوں

مرنے لگی۔ لیکن جب یہ چیز برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ شہر چھوڑنے اور دوسری جگہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ "عالیشان رنگ کوٹ" بالکل خالی ہو گیا اور ویرانی نے اس پر قبضہ جما لیا۔ کچھ عرصہ تک تو اس کی عجیب وغریب عمارتیں جنگلی جانوروں کی مسکن رہیں اس کے بعد ویرانی نے اس کے خوبصورت محلوں کو زمین کے برابر کر دیا اور بلاشرکت غیرے حکمرانی کرنے لگی۔

ریاست کمبوڈیہ عرصہ تک اس حادثہ کی تاب نہیں لا سکی رفتہ رفتہ وہ ختم ہو گئی اور ایک معمولی سا صوبہ ہو کر رہ گئی جس پر کبھی سیام حکومت کرتا تھا اور کبھی انام۔ لیکن اب بھی رنگ کوروٹ کے عالیشان مندر کے کھنڈر اس زمانہ کا کچھ پتہ دیتے ہیں جب یہاں ایک شاندار اور مایۂ ناز شہر آباد تھا جہاں دور دور کے سوداگر اپنا مال لے کر آتے ہوں گے اور یہ اپنے کاریگروں کی بنائی ہوئی اچھی اچھی چیزیں دوسرے ملکوں کو بھیجتا ہوگا۔

ہندی چین کے بالکل سامنے سمندر کے اس پار جزیرہ سماترا واقع تھا۔ یہاں بھی پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے پالووں نے نو آبادیاں قائم کی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ بہت بڑھ گئیں۔ شروع میں ملایا بھی سماترا کی سلطنت میں شامل تھا اور ایک عرصہ تک ملایا اور سماترا کی تاریخ بالکل مشترک رہی۔ اس ریاست کی راجدھانی سری دجے تھا جو اندر ہٹ کر سماترا کے پہاڑوں میں واقع تھا اور پالم بنگ ندی کے دہانے پر اس کا بندرگاہ تھا۔ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں بودھ مت تمام

سماترا میں پھیل گئی۔ سچ پوچھو تو سماترا ہی نے بودھ مت کے تبلیغی کام میں پیش قدمی کی اور بالآخر ملا ایشیا کے تمام ہندوؤں کو بودھ بنا لیا اسی لئے سماترا کی یہ سلطنت "شری وجے کی بودھ سلطنت کے نام سے مشہور ہے"

شری وجے کی سلطنت برابر بڑھتی رہی یہاں تک کہ سماترا اور ملایا کے علاوہ بورنیو۔ فلپائن۔ سیلیبس۔ نصف جاوا۔ نصف فارموسا۔ (جواب جاپان کے قبضہ میں ہے) اور لنکا بھی اسی میں شامل ہوگیا۔ اس کے علاوہ جنوبی چین میں کینٹن کے قریب ایک بندرگاہ بھی ان کے قبضہ میں تھی اور غالباً جنوبی ہند کے آخری کنارے پر لنکا کے بالمقابل بھی ایک بندرگاہ پر ان کا قبضہ تھا۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ بہت وسیع سلطنت تھی جس کی ساری ملا ایشیا پر حکومت تھی۔ ہندوستانی نوآبادیوں کا خاص پیشہ تجارت اور جہاز سازی تھا۔ چینی اور عربی مصنفوں نے سماترا کی اس سلطنت کے ماتحت بندرگاہوں اور نئی آبادیوں کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

سلطنت برطانیہ آج ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور جگہ جگہ اس کی بندرگاہیں اور بحری اڈوں میں کوئلہ پانی بھرنے کے اسٹیشن قائم ہیں مثلاً جبرالٹر۔ نہر سوئز (جو بیشتر برطانیہ ہی کے قبضہ میں ہے) عدن۔ کولمبو سنگاپور ہانگ کانگ وغیرہ۔ گذشتہ تین سو برس سے برطانیہ تاجروں کی قوم ہے اور اس کی تجارت اور قوت بحری طاقت پر منحصر ہے۔ اس لئے اسے ساری دنیا میں موزوں مقامات پر بندرگاہوں اور کوئلہ پانی بھرنے کے اسٹیشنوں کی ضرورت تھی۔ شری وجے کی سلطنت بھی ایک بحری طاقت تھی جس کا انحصار تجارت پر تھا۔ اس لئے تم دیکھو گے کہ جہاں

کہیں اسے قدم رکھنے کی جگہ ملی اس نے بھی بندرگاہ قائم کرلئے۔ سلطنت سماترا کی مقبوضات کی نمایاں خصوصیت ان کے محل وقوع کی موزونیت تھی یعنی وہ ایسے مناسب مقام پر واقع تھیں کہ وہاں سے آس پاس کے سمندروں پر حکمرانی کی جا سکے۔ عموماً ان میں سے دو دو پاس پاس واقع تھیں تاکہ اس حکمرانی کو برقرار رکھنے میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

چنانچہ سنگاپور بھی جو اب بہت بڑا شہر ہے ابتدا میں سماترا والوں ہی کی نو آبادی تھی۔ دیکھو اس کا نام بھی خالص ہندوستانی ہے یعنی یہ سنگھ پور کا بگڑا ہوا ہے۔ سنگاپور کے بالمقابل سمندر کے دوسری طرف سماترا والوں کی ایک دوسری نو آبادی بھی تھی۔ کبھی کبھی وہ آبنائے میں ایک بندرگاہ سے دوسرے بندرگاہ تک سمندر میں لوہے کی زنجیریں تان دیتے تھے تاکہ کوئی جہاز اس وقت تک ادھر سے نہ گذر سکے جب تک کافی چنگی ادا نہ کر دے۔

گویا شری وجے کی سلطنت، سلطنت برطانیہ سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ اگرچہ وہ اس سے بہت چھوٹی تھی لیکن وہ اس سے زیادہ عرصہ تک چلی جتنی سلطنت برطانیہ کے چلنے کی امید نہیں ہے۔ گیارہویں صدی میں اس کے عروج کا ستارہ کمال پر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چولا سلطنت کا ستارہ جنوبی ہند میں چمک رہا تھا۔ لیکن وہ چولا سلطنت سے زیادہ چلی۔ چولا اور شری وجے کے باہمی تعلقات معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ دونوں اولوالعزم قومیں تھیں جنھیں جہازرانی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ دونوں سامراجی مہموں کے درپے تھیں۔ دونوں کے پاس زبردست بیڑے تھے اور دونوں کا تجارت میں مقابلہ تھا۔

گیارھویں صدی کے شروع میں ان میں باہم جنگ چھڑ گئی۔ چولا بادشاہ راجندر اول نے ایک بحری مہم بھیجی جس نے سری وجے کو نیچا دکھایا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں سری وجے سلطنت پھر سنبھل گئی۔

گیارھویں صدی کے شروع میں چینی شہنشاہ نے سماترا کے بادشاہ کی خدمت میں کانسے کی بہت سی گھنٹیاں تحفے کے طور پر بھیجی تھیں۔ اس کے جواب میں سماترا کے بادشاہ نے ہاتھی دانت اور سنسکرت کی کتابیں بھیجیں۔ اس کے علاوہ ایک خط بھی بھیجا تھا جو کہتے ہیں کہ "ہندوستانی رسم الخط" میں سونے کی پتر پر کندہ کیا گیا تھا

سری وجے بہت عرصہ تک قائم رہی یعنی دوسری صدی سے لے کر پانچویں یا چھٹی صدی تک جب کہ اس نے بودھ مذہب قبول کیا اور پھر گیارھویں صدی تک جب وہ رفتہ رفتہ برابر ترقی کرتی رہی۔ اس کے بعد بھی تین سو برس تک اس کا اقتدار قائم رہا اور ملایشیا کی ساری تجارت اس کے ہاتھ میں رہی۔ بالآخر ۱۳۷۷ء میں پالودں کی ایک دوسری قدیم نو آبادی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

میں تمہیں یہ بتا چکا ہوں کہ سری وجے سلطنت لنکا سے کینٹن تک پھیلی ہوئی تھی اور درمیان کے بیشتر جزیرے اس کے قبضے میں تھے لیکن ایک چھوٹے سے علاقہ کو وہ فتح نہیں کر سکے۔ یہ جاوا کا مشرقی حصہ تھا جو برابر آزاد رہا اور جس نے بودھ مت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ گویا مغربی جاوا سری وجے کے ماتحت تھا اور مشرقی جاوا خود مختار تھا۔ مشرقی جاوا کی یہ ہندو سلطنت بھی تجارتی ریاست تھی اور اس کی تمام بہبودی تجارت پر منحصر تھی۔ وہ سنگاپو

کورشک کی نظروں سے دیکھتی ہوگی۔ کیونکہ اپنے محل وقوع کی وجہ سے وہ بہت بڑا استجارتی مرکز ہوگیا تھا گو یا شری وجے اور مشرقی جاوا یں کا نی چشمک تھی جو رفتہ رفتہ سخت دشمنی کی صورت اختیار کرگئی بارھویں صدی کے بعد سلطنت جاوا رفتہ رفتہ بڑھتا اور شری وجے گھٹنا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ چودہویں صدی یں (یعنی ۱۳۰۷ء یں) اس نے شری وجے کو شکست فاش دیدی۔ ان یں بڑی وحشیانہ جنگ ہوئی تھی اور تباہی و بربادی کا تو پوچھنا کیا۔ شری وجے اور سنگاپور کے دونوں شہر بالکل برباد ہوگئے۔ اس طرح ملا ایشیا کی دوسری زبردست سلطنت کا خاتمہ ہوا اور اس کے کھنڈروں پر ایک تیسری سلطنت مدجاپہت کی عمارت کھڑی ہوئی۔

اگرچہ مشرقی جاوا والوں نے جنگ یں شری وجے کے ساتھ سخت درندگی اور بربریت کا سلوک کیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ یہ ہندو ریاست تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج طے کر چکی تھی۔ اب بھی جاوا یں اس زمانہ کی بہت سی کتابیں ملتی ہیں لیکن اسے فن تعمیر یں۔ خاص کر مندروں کی تعمیر یں خاص امتیاز حاصل تھا۔ اس وقت وہاں تقریباً پانچ سو مندر موجود تھے۔ ان یں سے بعض تو اب بھی دنیا کی پتھر کی عمارتوں یں صناعی کے بہترین نمونے مانے جاتے ہیں۔ ان یں کے اکثر عالیشان مندر ۶۵۰ء اور ۹۵۰ء کے درمیانی زمانہ یں تعمیر ہوئے تھے۔ جاوا والے ہندوستان اور دوسرے قرب وجوار کے ملکوں سے بہت سے معمار اور استاد کاریگر لائے ہوں گے تاکہ ان مندروں کی تعمیر یں ان

سے مدد ملے۔ ہم جاوا اور سلطنت مدجاپہت کا حال اگلے خط میں لکھیں گے۔

یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بورنیو اور فلپائن دونوں نے یا تو نوآبادیوں کے واسطے سے فن تحریر ہندوستان ہی سے سیکھا۔ افسوس کہ اسپین والوں نے فلپائن کے بہت سے قدیم قلمی نسخے برباد کر دیئے۔

یاد رہے کہ ابتدا ہی سے یعنی ظہور اسلام کے پہلے سے ان جزیروں میں عربوں کی نوآبادیاں بھی تھیں۔ وہ لوگ بڑے ہوشیار تاجر تھے اور جہاں کہیں تجارت کا امکان ہوتا وہاں عرب ضرور پہنچ جاتے۔

(۴۷)

روم میں ظلمت کا دور

۱۹ رمئی ۱۹۳۲ء

مجھے اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ گذشتہ تاریخ کی بھول بھلیاں کی سیر کرانے کے لئے میں کوئی اچھا رہبر نہیں ہوں میں خود ان میں کھو جاتا ہوں پھر بھلا تمہاری رہنمائی کیا کر سکتا ہوں؟ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ شاید میں تمہاری کچھ تھوڑی سی مدد کر سکوں۔ اس لئے ان خطوں کے سلسلہ کو جاری رکھتا ہوں۔ کم از کم مجھے تو ان سے بڑی مدد ملتی ہے جب میں یہ خط لکھتا ہوں اور اپنی پیاری بیٹی کا تصور کرتا ہوں تو میں بالکل بھول جاتا ہوں کہ کمرہ کے اندر جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا ہوں درجہ حرارت ۱۱۲ ڈگری ہے اور سخت لو چل رہی ہے اور کبھی کبھی تو یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ میں بریلی کے ڈسٹرکٹ جیل میں ہوں۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں ملا ایشیا کا چودھویں صدی کے آخر تک کا حال بیان کیا تھا۔ لیکن شمالی ہند میں ابھی ہم ہرش کے زمانے سے یعنی ساتویں صدی سے بھی آگے نہیں بڑھے ہیں اور یورپ میں اس سے بھی زیادہ عرصہ طے کرنا ہے۔ یہ بہت مشکل ہے کہ ہر ملک کی تاریخ لکھنے میں ایک معینہ مدت کی پابندی کی جائے۔ میں اس کی کوشش تو کرتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات کہیں کہیں میں سینکڑوں برس آگے نکل جاتا ہوں جیسے رنگ کور اور رشری وجے کے معاملہ میں

ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ ان کا قصہ کسی حد تک ختم کرتا چلوں لیکن یہ ملحوظ رہے کہ جس زمانہ میں مشرق میں سلطنت کمبوڈیہ اور شری وجے کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان چین اور یورپ میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں ہندی چین اور ملا ایشیار کی ایک ہزار برس کی تاریخ چند صفحوں میں بیان کر ڈالی۔ یہ ملک ایشیار اور یورپ کی تاریخ کے اصلی دھارے سے دور تھے۔ اس لئے ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ لیکن ان کی تاریخ بھی بہت طویل اور مالا مال ہے، کارناموں سے تجارت سے فنون لطیفہ سے اور خاص کر فن عمارت سے۔ اس لئے وہ اس قابل ہے کہ اس کا غور سے مطالعہ کیا جائے ہندوستانیوں کے لئے تو ان ملکوں کا قصہ خاص دلچسپی کا باعث ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستان ہی کا ایک جزو تھے۔ ہندوستان ہی کے مرد عورتیں سمندر پار کرکے وہاں گئے تھے اور اپنے ساتھ ہندوستانی تہذیب و تمدن فنون لطیفہ اور مذہب بھی لے گئے تھے۔

اگرچہ ہم ملا ایشیار کے تذکرے میں بہت آگے نکل گئے لیکن ہندوستان میں ہم ابھی ساتویں ہی صدی میں ہیں ابھی ہمیں عرب جانا ہے اور ظہور اسلام پر بحث کرنا ہے اور اس نے یورپ اور ایشیا میں جو انقلاب برپا کر دیئے ان پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یورپ کے حالات کی رفتار بھی دیکھنا ہے۔

آؤ۔ پہلے یورپ پر ایک اور نظر ڈالیں اور ذرا پیچھے پلٹ چلیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ رومی شہنشاہ قسطنطین نے باسفورس کے کنارے

اس مقام پر جہاں پہلے بیزنٹیم تھا شہر قسطنطنیہ آباد کیا تھا۔ اس نے اپنی راجدھانی قدیم روم سے اس جدید روم میں منتقل کر لی۔ اس کے بعد ہی سلطنت روم دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ مشرقی سلطنت کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا اور مغربی سلطنت کا روم۔ مشرقی سلطنت کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہوا اور بہت سے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا پھر بھی یہ تعجب کی بات ہے کہ وہ صدی بہ صدی گیارہ سو برس تک چلی حتیٰ کہ ترکوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

مغربی سلطنت کی تاریخ اس سے مختلف ہے۔ اگرچہ رومیوں کا نام اور شہر روم کی جو اتنی مدت تک مغربی دنیا پر حکومت کر چکا تھا۔ بڑی دھاک تھی۔ پھر بھی یہ سلطنت اس قدر جلد بیٹھ گئی کہ حیرت ہوتی ہے۔ وہ شمالی قوموں میں سے کسی کے حملہ کی بھی تاب نہیں لا سکی۔ گوتھ قوم کے سردار الارک نے اٹلی پر حملہ کیا اور سنہ ۴۱۰ء میں روم پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ونڈال آئے انھوں نے بھی روم کو برباد کیا۔ ونڈال ایک جرمن قوم تھی جو فرانس اور اسپین ہوتی ہوئی افریقہ پہنچی اور اس جگہ جہاں پہلے کارتھیج کی حکومت تھی۔ اپنی ایک سلطنت قائم کر لی۔ اس قدیم کارتھیج سے وہ بحر روم عبور کر کے اٹلی پہنچے اور انھوں نے روم پر قبضہ کر لیا۔ پیونک میں روم کو جو فتح حاصل ہوئی تھی شاید یہ اس کا انتقام تھا اگرچہ ایک عرصہ کے بعد لیا گیا۔

اسی دوران میں ہن قوم جو ابتداءً وسطی ایشیا یا منگولیا سے آئی تھی طاقت پکڑ گئی۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے۔ وہ دریائے ڈنیوب کے مشرق میں اور مشرقی رومی سلطنت کے شمال اور مغرب میں

آباد ہو گئے تھے۔ اپنے سردار اٹلا کی رہنمائی میں انھوں نے بڑا زور باندھا حتیٰ کہ قسطنطنیہ کی حکومت اور شہنشاہ ان سے برابر خائف رہتا تھا۔ اٹلا نے انھیں دھمکا دھمکا کر بڑی بڑی رقمیں وصول کیں۔ مشرقی سلطنت کو اچھی طرح ذلیل کرنے کے بعد اٹلا نے مغربی سلطنت کا رخ کیا۔ اس نے گال پر حملہ کیا اور جنوبی فرانس کے بہت سے شہروں کو تاراج کر دیا۔ شاہی فوجیں اس کی ٹکر کی نہیں تھیں۔ لیکن فرینک اور گوتھ جرمنی قومیں جنھیں روم والے جنگلی کہتے تھے ان کے حملے سے بہت خوفزدہ ہو گئیں اور شاہی فوجوں کے ساتھ مل گئیں۔ پھر ان سب نے مل کر ٹرائس کے میدان میں اٹلا اور ہن قوم کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی کام آئے لیکن اٹلا کو شکست ہوئی اور ہن پسپا ہو گئے۔ یہ ۴۵۱ء کا ذکر ہے لیکن اس شکست کے باوجود اٹلا کے سر پہ جنگ کا بھوت سوار تھا۔ وہ اٹلی پہنچا اور شمال کے بہت سے شہروں کو لوٹا اور انھیں آگ لگا دی اس کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے پیچھے ظلم و تشدد اور سنگدلی کی دائمی یادگار چھوڑ گیا۔ آج بھی اٹلا ہن بے دردانہ تباہی و بربادی کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال ہن قوم اس کے مرنے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گئی وہ جگہ جگہ آباد ہو گئی اور دوسرے باشندوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئی یہ قریب قریب وہی زمانہ تھا جب سفید ہنوں نے ہندوستان پر یورش کی تھی۔

اس کے چالیس برس بعد تھیوڈرک نامی ایک گوتھ روم کا بادشاہ ہوا۔ بس یہ مغربی سلطنت کا آخری زمانہ تھا اس کے کچھ عرصہ بعد مشرقی سلطنت کے بادشاہ جسٹی نین نے اٹلی کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس نے اٹلی اور سسلی دونوں کو فتح کیا۔ لیکن بہت جلد یہ دونوں

پھر اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور مشرقی سلطنت کو اپنی حفاظت سے کب فرصت تھی کہ ان کا کچھ تدارک کرتی۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ شاہی شہر روم اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ہر اس قوم کے سامنے جھک گیا جس نے اس پر حملہ کرنے کی ہمت کی۔ ممکن ہے لوگ یہ خیال کریں کہ روم کی طاقت زائل ہو چکی تھی یعنی محض ڈھول کے اندر پول تھا۔ غالباً یہ خیال صحیح ہوگا اتنے عرصہ تک روم کی طاقت کے قائم رہنے کا راز اس کے ظاہری وقار اور دھاک میں مضمر تھا اس کی قدیم عظمت کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ دنیا کا سردار ہے اس لئے اس کی عزت کرتے تھے اور خواہ مخواہ اس سے خوفزدہ رہتے تھے۔ اسی وجہ سے رومی سلطنت اتنے عرصہ تک باقی رہی۔ ظاہر میں تو وہ سلطنتوں میں ایک طاقتور ملکہ تھی۔ لیکن حقیقت میں بالکل ناکارہ تھی دکھانے کے لئے تو وہاں امن وسکون تھا اور اس کے تھیٹروں، تفریح گاہوں اور بازاروں میں بھیڑ لگی رہتی تھی لیکن حقیقت میں وہ موت کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ اس کی تباہی کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ کمزور ہو گئی تھی بلکہ یہ کہ اس نے عوام کی غلامی اور خواری کی بنیاد پر دولت مند طبقہ کی تہذیب کی عمارت کھڑی کی تھی میں اپنے کسی پچھلے خط میں غریبوں کے بلوؤں اور بغاوتوں کا حال لکھ چکا ہوں جسے نہایت بے دردی سے دبایا گیا تھا۔ ان بغاوتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ روم کا سماجی نظام کتنا بوسیدہ ہو گیا تھا۔ اس کا زوال خود بخود شروع ہو چکا تھا۔ گوتھ وغیرہ شمالی قبیلوں کی آمد نے اس کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان حملہ آوروں کو کچھ زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا

پڑا۔ رومی کسان اپنی زبوں حالی سے عاجز آگیا تھا۔ اس نے اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ رہے غریب مزدور اور غلام تو ان کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔

مغربی رومی سلطنت کے ختم ہوتے ہی یورپ میں نئی نئی قومیں منظر عام پر آئیں۔ مثلاً گوتھ۔ فرینک وغیرہ وغیرہ۔ ان کے نام گنا کر تمہیں پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ مغربی یورپ کے موجودہ باشندے مثلاً جرمن فرانسیسی وغیرہ انہی کی اولادیں ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ملک صفحۂ تاریخ پر نمودار ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں ہمیں بہت ہی ادنیٰ درجہ کی تہذیب کی ایک جھلک بھی نظر آتی ہے۔ شہر روم کی تباہی کے ساتھ وہاں کی عیش وعشرت اور شان و شوکت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور وہ نمائشی تہذیب جو برسوں سے چلی آتی تھی ایک دن میں غائب ہوگئی۔ کیونکہ اس کی جڑیں تو مدت سے کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ غرض یہ عجیب وغریب حادثہ ہم نے اپنے علم کی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ انسانیت کس طرح رجعت قہقری کرتی ہے۔ یہ صورت ہندوستان میں۔ مصر میں چین میں یونان میں اور روم میں غرضکہ ہر جگہ پیش آئی ہے۔ یعنی انسان بڑی جانفشانی سے علم اور تجربہ حاصل کرتا ہے۔ اور تہذیب و تمدن کو نشوو نما دیتا ہے کہ یکایک یہ سلسلہ رک جاتا ہے بلکہ ترقی کے بجائے اٹا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ماضی پر پردہ سا پڑ گیا۔ اگرچہ کبھی کبھی ہمیں اس کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ لیکن علم اور تجربے کے پہاڑ پر پھر نئے سرے سے چڑھنا پڑتا ہے۔ غالباً ہر مرتبہ انسان ذرا اور اونچا چڑھ جاتا ہے اور اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے کچھ سہولتیں

مہیا کر جاتا ہے۔ اس کی مثال بھی کوہ ایورسٹ کی مہموں کی سی ہے۔ ہر مہم میں لوگ چوٹی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ ممکن ہے وہ دن بھی جلد آجائے جب دنیا کی یہ سب سے اونچی چوٹی سر ہو جائے۔

غرض سارے یورپ پر تاریکی چھا گئی اور "تاریکی کا دور" شروع ہو گیا۔ اب زندگی بھاری اور ان گھڑ ہو کر رہ گئی تعلیم کا کوئی ذکر نہیں تھا بس لڑنے سے سروکار تھا۔ مشغلہ تھا تو یہی تھا اور تفریح تھی تو یہی تھی اب معلوم ہوتا تھا کہ سقراط اور افلاطون کے زمانے کو جگ کے جگ گذر گئے ہیں۔

یہ تو ہوا مغرب کا حال۔ اب ذرا مشرقی سلطنت پر ایک نظر ڈالو تمہیں خیال ہو گا کہ قسطنطین نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کے ایک جانشین شہنشاہ جولین نے عیسائی مذہب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پرانے دیوی دیوتاؤں کی پرستش بحال کرے۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا۔ پرانے دیوتاؤں کے دن تو پورے ہو چکے تھے اب عیسائیت ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ عیسائی لوگ جولین کو منکر جولین کہتے تھے اور اسی لقب سے وہ تاریخ میں بھی مشہور ہے۔

جولین کے بعد بھی ایک دوسرا بادشاہ ہوا جو اس کے بالکل برعکس تھا اس کا نام تھیوڈوسیس تھا۔ اسے "اعظم" کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس نے پرانے مندروں اور دیوی دیوتاؤں کی پرانی مورتیوں کو تباہ کرنے میں اپنی عظمت کا ثبوت دیا۔ وہ نہ صرف غیر عیسائیوں کا دشمن تھا بلکہ ان عیسائیوں کا بھی شدید مخالف

تھا جو اس کے خیال کے مطابق کٹر عیسائی نہیں تھے۔ وہ کسی ایسے مذہب یا رائے کو گوارا نہیں کرتا تھا جسے وہ نہیں مانتا ہو۔ تھیوڈ وسیس نے کچھ عرصہ کے لئے مشرقی اور مغربی دونوں سلطنتوں کو ملا لیا اور دونوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ یہ ۳۹۲ء کا یعنی روم پر جنگلی قوموں کے حملے سے پہلے کا ذکر ہے

عیسائی مذہب برابر پھیلتا رہا۔ غیر عیسائیوں سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ وہاں تو ساری جنگ و جدال مختلف عیسائی فرقوں میں آپس ہی میں ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ رواداری سے کتنے دور تھے۔ تمام ایشیائی افریقہ۔ مغربی ایشیا، اور یورپ میں صدہا اکھاڑے ایسے موجود تھے۔ جہاں یہ عیسائی اپنے عیسائی بھائیوں کو لاٹھی ڈنڈے۔ لات گھونسے اور اسی قسم کے نرم طریقوں سے سچے مذہب کی تعلیم دیتے تھے۔

۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک جسٹی نین قسطنطنیہ میں برسر حکومت رہا یہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس نے اٹلی سے گوتھوں کو نکال دیا اور کچھ عرصہ تک اٹلی اور سسلی دونوں مشرقی سلطنت میں شامل رہے اس کے بعد گوتھوں نے اٹلی کو پھر چھین لیا۔

جسٹی نین نے قسطنطنیہ میں ایا صوفیہ کا نہایت خوبصورت گرجا تعمیر کیا۔ جس کا شمار اب بھی بہترین بازنطینی گرجوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بڑے بڑے قانون دانوں سے تمام مروجہ قانون جمع کرا کے انھیں مدون کرایا۔ جسٹی نین کا نام میں اس وقت بھی جانتا تھا جب مجھے مشرقی رومی سلطنت اور اس کے بادشاہوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے اس کی قانونی کتاب

"ضابطۂ جسٹی نین" پڑھائی گئی تھی۔ اگرچہ خود جسٹی نین نے قسطنطنیہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی تھی لیکن اس نے فلسفۂ یونان کی اکادمی اور تمام قدیم مدارس حکماً بند کر دیئے۔ یہ مدارس افلاطون کے قائم کئے ہوئے تھے اور کوئی ایک ہزار برس سے جاری تھے۔ فلسفہ ہر کٹر مذہب کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کو سوچنے کی تعلیم دیتا ہے۔

غرضکہ اب ہم چھٹی صدی تک پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ روم اور قسطنطنیہ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ روم پر شمال کی جرمن قوموں نے قبضہ کر لیا اور قسطنطنیہ یونانی سلطنت کا مرکز بن گیا اگرچہ اس کا نام اب بھی 'رومی' تھا۔ روم کا زوال شروع ہو گیا اور وہ گر گرا اپنے ان فاتحین کی تہذیب کے ادنی درجہ پر پہنچ گیا جنھیں وہ اپنے عروج کے زمانہ میں 'وحشی' کہتا تھا۔ قسطنطنیہ میں اگرچہ کچھ قدیم روایات باقی تھیں لیکن تہذیب کے معاملہ میں اس کا معیار گرتا چلا جا رہا تھا۔ مختلف عیسائی فرقے اپنی اپنی فوقیت کی خاطر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور مشرق کی عیسائیت کو جو ترکستان چین اور حبش تک پہنچ چکی تھی قسطنطنیہ اور روم دونوں سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ یورپ کا تاریک دور شروع ہو چکا تھا اب تک یہاں کی تعلیم یونانی یا قدیم لاطینی علوم پر جو یونانی ہی سے لئے گئے تھے۔ مشتمل تھی۔ لیکن ان قدیم یونانی کتابوں دیوی دیوتاؤں کا ذکر اور فلسفہ کی بحث ہوتی تھی۔ اس لئے یہ کتابیں اس ابتدائی دور کے متقی پرہیزگار اور متعصب عیسائی کے پڑھنے کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھیں چنانچہ ان پر بندشیں عاید کی گئیں اور اکثر علوم و فنون کو سخت صدمہ پہنچا۔

تاہم علوم و فنون کو باقی رکھنے میں بھی عیسائیت کا کچھ ہاتھ ہے۔ بودھ مت کے سنگھ کی طرح عیسائیوں نے بھی خانقاہیں بنائیں جو بڑی تیزی سے ہر طرف پھیل گئیں۔ ان خانقاہوں میں بعض اوقات قدیم علوم کو پناہ ملی اور یہیں جدید فنون کی بنیاد پڑی جو کئی صدیوں بعد خوب پھلے پھولے۔ ان خانقاہوں کے راہبوں نے علم و فن کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو کسی نہ کسی طرح روشن رکھا۔ ان کی یہ خدمت بھی قابل قدر ہے کہ انھوں نے اسے گل ہونے سے بچا لیا۔ لیکن یہ روشنی ایک تھوڑی سی جگہ میں محدود تھی۔ اس کے بعد اندھیرا گھُپ تھا۔

عیسائیت کے ابتدائی دور میں ایک اور عجیب ذہنیت طاری تھی۔ بہت سے عیسائی مذہبی جوش سے متاثر ہو کر ریگستانوں میں یا ایسے دور افتادہ مقامات میں چلے جاتے تھے جہاں انسان کا گذر نہ ہو اور وہاں تنہائی میں زندگی بسر کرتے تھے وہ اپنے آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ نہاتے دھوتے نہیں تھے۔ اور عموماً یہ کوشش کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ تکلیفیں برداشت کریں۔ مصر میں یہ چیز بہت عام تھی اور وہاں اس قسم کے بہت سے راہب ریگستانوں میں رہتے تھے۔ غالباً ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جتنی زیادہ تکلیفیں اٹھائیں گے اور جتنا کم نہائیں دھوئیں گے اتنا ہی زیادہ وہ پاک ہو جائیں گے اسی قسم کا ایک راہب برسوں ایک ستون کی چوٹی پر بیٹھا رہا! رفتہ رفتہ یہ راہب معدوم ہو گئے۔ لیکن ایک زمانہ تک بہت سے پکے عیسائیوں کا یہ عقیدہ رہا کہ دنیا میں کسی چیز کا لطف اٹھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ مصائب انگریزی کے اس عقیدے نے تمام عیسائی ذہنیت کو رنگ دیا

اب یورپ میں اس چیز کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ اب تو ہر شخص زندگی کے مزے لوٹنے کی تگ و دو میں دیوانہ ہو رہا ہے اور اس تگ و دو کا ایک نتیجہ لطف و تفریح کے بجائے عموماً تکان اور پژمردگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن ہندوستان میں آج بھی کہیں کہیں ایسے لوگ ملتے ہیں جو مصر کے عیسائی راہبوں کی سی حرکتیں کرتے ہیں وہ اپنا ایک ہاتھ اونچا کئے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ سوکھ جاتا ہے یا نوکدار سلاخیں گاڑ کر اس پر بیٹھے رہتے ہیں یا اسی قسم کی طرح طرح کی لغو اور احمقانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بعض لوگ جاہلوں سے روپیہ اینٹھنے کے لئے یہ ڈھکوسلے کرتے ہیں اور ممکن ہے بعض یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس ریاضت سے زیادہ پاک ہو جائیں گے۔ گویا کسی نیک کام کے لئے اپنے جسم کو نکما کر دینا بھی کوئی معقول بات ہے۔

یہاں مجھے مہاتما بودھ کا ایک قصہ یاد آگیا جو ہمارے قدیم دوست ہیون سانگ نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کا ایک نوجوان چیلہ اپنے آپ کو اذیتیں دے رہا تھا۔ بودھ نے اس سے پوچھا "اے نوجوان۔ جب تم میرے چیلے نہیں ہوئے تھے تو کبھی ستار بجایا تھا؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں" "اچھا تو سنو" بودھ نے کہا "اس سے ایک سبق نکلتا ہے۔ اگر اس کے تار بہت کس جائیں تو ان کی آواز بے سری ہو جاتی ہے اور اگر ڈھیلے ہو جائیں تو ان میں ہم آہنگی اور دلکشی نہیں رہتی۔ یہ ہم آہنگی تو اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب تار نہ تو بہت کسے ہوں اور نہ ڈھیلے۔ یہی حال ہمارے جسم کا ہے۔ اگر اس پر زیادہ سختی

کر دگے تو یہ تھک جائے گا اور دماغ سست ہو جائے گا اور
اگر بہت نرمی کر دگے تو جذبات مشتعل ہوں گے اور قوت
ارادی کمزور پڑ جائے گی ۔"

(۴۸)

اسلام کا ظہور

۱۲ مئی ۱۹۳۲ء

ہم نے بہت سے ملکوں کی تاریخ کا اور بہت سی سلطنتوں کے عروج و زوال کا مطالعہ کیا لیکن اب تک ہمارے اس قصہ میں عرب کا کہیں ذکر نہیں آیا بجز اس کے کہ وہاں کے جہاز راں اور سوداگر دنیا کے دور دور دراز ملکوں تک پہنچے تھے۔ اچھا ذرا نقشے پر ایک نظر ڈالو۔ عرب کے مغرب میں مصر ہے۔ شمال میں شام اور عراق ہیں۔ قریب ہی مشرق میں ایران ہے۔ اور شمال و مغرب میں کچھ فاصلہ پر ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ ہیں یونان بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ اور ہندوستان بھی سمندر کے دوسری جانب واقع ہے۔ چین اور مشرق بعید سے قطع نظر، عرب تہذیب یافتہ ملکوں کے بیچوں بیچ میں واقع تھا۔ عراق میں دریائے دجلہ اور فرات کے کنارے بڑے بڑے شہر آباد ہوئے۔ اسی طرح مصر میں اسکندریہ۔ شام میں دمشق اور ایشیائے کوچک میں انطاکیہ بہت مشہور گذرے ہیں۔ عرب لوگ سیاح اور تاجر تھے۔ وہ ان شہروں میں بارہا گئے ہوں گے۔ پھر بھی تاریخ میں عرب کا کوئی خاص ذکر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا تہذیب یافتہ نہیں تھا۔ جتنے آس پاس کے ملک تھے۔ نہ تو اس نے کبھی دوسرے ملکوں کو فتح کرنے کی کوشش کی، نہ اسے تابع کرنا آسان تھا۔

ریگستانی ملک میں پہاڑوں اور ریگستانوں کی وجہ سے لوگ بڑے مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں۔ جنھیں آزادی سے عشق ہوتا ہے اس لئے انھیں قابو میں لانا بڑا مشکل ہوتا ہے اس کے علاوہ عرب کوئی دولتمند ملک بھی نہ تھا۔ اس لئے سامراجی اور فاتح اس طرف رخ بھی نہیں کرتے تھے وہاں سمندر کے قریب صرف دو چھوٹے چھوٹے شہر تھے۔ یعنی مکّہ اور یثرب۔ ان کے سوا ریگستانوں میں بس چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ اور یہاں کے باشندے عموماً بدّو کہلاتے تھے یعنی "ریگستان کے باشندے" تیز رفتار اونٹ اور حسین گھوڑے ان کے مستقل ساتھی تھے اور خچّر بھی اپنی غیر معمولی قوت برداشت کی وجہ سے بڑا وفادار اور قابل قدر رفیق سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے ملکوں میں تو خچّر یا گدھے سے تشبیہ دینا توہین سمجھا جاتا تھا۔ لیکن عرب میں اسے عزت افزائی سمجھتے تھے۔ بات یہ ہے کہ ریگستانوں میں زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ اس لئے دوسری جگہ کے مقابلہ میں وہاں طاقت اور قوت برداشت کی سب سے زیادہ قدر ہوتی ہے۔

ریگستانوں کے یہ باشندے بڑے مغرور۔ تنک مزاج اور جھگڑالو تھے۔ وہ قبیلے قبیلے ایک ساتھ رہتے تھے۔ اور دوسرے قبیلوں سے برابر لڑا کرتے تھے۔ سال میں ایک مرتبہ آپس میں صلح کر لیتے تھے اور مکّہ کو اپنے دیوتاؤں کی زیارت کرنے جاتے تھے جہاں ان کی مورتیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان دیوتاؤں کے علاوہ وہ سنگ اسود یا کعبہ کی پوجا کرتے تھے۔

ان کی زندگی خانہ بدوشی کی زندگی تھی جس میں مختلف قبیلے

اور ان کے سردار ہوتے تھے۔ گویا وسطی ایشیا وغیرہ کی قومیں تہذیب و تمدن اختیار کرنے سے پہلے جیسی زندگی بسر کرتی تھیں اسی طرح کی ان کی زندگی بھی تھی۔ وہ بڑی بڑی سلطنتیں جو عرب کے آس پاس قائم ہوتی تھیں اکثر عرب کو بھی اپنے دائرۂ حکومت میں شامل کر لیتی تھیں۔ لیکن حقیقت میں یہ محض برائے نام ہوتا تھا۔ کیونکہ ریگستان کی خانہ بدوش قوموں پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تمہیں شاید یاد ہو کہ ایک مرتبہ شام کے پامیرا علاقے میں ایک عربی سلطنت بھی قائم ہوئی تھی۔ اور تیسری صدی عیسوی میں اس کا چند روز عروج رہا تھا۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ بھی خاص عرب میں شامل نہیں تھی۔ غرض یہ بدو نسلاً بعد نسلٍ ریگستانی زندگی بسر کرتے رہے اور ان کے جہاز تجارت کے سلسلہ میں آتے جاتے رہے گویا عرب جس حال میں تھا اسی پر قائم رہا۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ بعض لوگ عیسائی ہو گئے بعض یہودی لیکن بیشتر اپنے ۳۶۰ بتوں اور کعبے کے سنگ اسود کو پوجتے رہے۔

یہ دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے کہ وہ عرب قوم جو صدیوں سے خوابیدہ تھی اور بظاہر دنیا کے واقعات سے اسے کوئی تعلق نہیں تھا یکایک اس طرح جاگ اٹھی اور اس نے ایسے زبردست جوشِ عمل کا ثبوت دیا کہ ساری دنیا دنگ رہ گئی اور ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ چنانچہ عربوں کی یہ داستان کہ وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ میں کس تیزی سے پھیل گئے اور تہذیب و تمدن کے کس اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے، تاریخ کے حیرت انگیز کرشموں میں شمار کی جاتی ہے۔

اسلام وہ نئی قوت تھی جس نے عربوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا اور ان میں خود اعتمادی و جوش عمل کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اس مذہب کے بانی ایک نئے پیغمبر محمدؐ تھے جو مکہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے ان میں اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کرنے کی عجلت نہیں تھی اس لئے وہ عرصہ تک نہایت خاموشی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی عام طور پر لوگ ان سے محبت کرتے تھے اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کا لقب ہی "امین" پڑ گیا لیکن جب انھوں نے اپنے نئے مذہب کی تبلیغ شروع کی، خاص کر جب مکہ کے بتوں کی مخالفت کی تو ان کے خلاف ایک شور برپا ہو گیا۔ بالآخر انھیں مکہ چھوڑنا پڑا اور جان بچانی مشکل ہو گئی۔ وہ اپنی تعلیم میں اس چیز پر خاص زور دیتے تھے کہ خدا ایک ہے اور میں 'محمدؐ' اس کا رسول ہوں۔

مکہ والوں سے تنگ آکر انھوں نے یثرب کے چند دوستوں اور حامیوں کے یہاں پناہ لی۔ مکہ سے اس روانگی کو عربی میں ہجرت کہتے ہیں اور اسلامی سنہ اسی زمانہ سے (یعنی ۶۲۲ء سے) شروع ہوتا ہے۔ یہ ہجری سنہ قمری سنہ ہے۔ یعنی چاند سے اس کا حساب لگتا ہے اس لئے یہ ہمارے شمسی سنہ سے جو عام طور رائج ہے پانچ چھ دن کم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہجری مہینے ہمیشہ ایک موسم میں نہیں پڑتے۔ گویا جو مہینہ کسی سال جاڑوں میں پڑتا ہے۔ وہ چند برس بعد بیچ گرمیوں میں پہنچ جاتا ہے۔

اگرچہ اسلام ہجرت سے کچھ پہلے شروع ہو چکا تھا لیکن حقیقت میں اس کی ابتدا، اسی وقت سے ہوئی۔ یثرب نے محمدؐ کا پر جوش خیر مقدم کیا اور ان کی تشریف آوری کے اعزاز میں اپنے شہر کا نام

بدل کر مدینۃ النبی یعنی" نبی کا شہر" رکھ دیا۔ یا جسے اختصار کے طور پر اب محض مدینہ کہتے ہیں۔ مدینہ کے باشندے جنھوں نے نبی کی مدد کی تھی۔ انصار (یعنی نبی کے مددگار) کہلائے ان کی اولاد اس لقب پر فخر کرتی ہے۔ چنانچہ آج بھی وہ اپنے نام کے ساتھ اسے استعمال کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم اسلام یا عربوں کی فتوحات کا تذکرہ کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف کے حالات پر ایک نظر ڈالیں ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ روم کا زوال ہو گیا۔ قدیم یونانی رومی تہذیب کا خاتمہ ہوا اور وہ تمام سماجی نظام جو اس نے قائم کیا تھا درہم برہم ہو گیا۔ شمالی یورپ کی قوموں اور قبیلوں کو اب اہمیت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔ روم سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش میں انھوں نے ایک بالکل نئی قسم کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ابھی اس کی ابتدا تھی اور صرف ایک دھندلا سا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ گویا قدیم چیزیں فنا ہو چکی تھیں اور جدید ابھی عالم وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اس لئے سارے یورپ پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ کے مشرقی گوشے میں اب بھی مشرقی رومی سلطنت برسر اقتدار تھی اور شہر قسطنطنیہ اب بھی ایک عظیم الشان شہر تھا جو اس زمانہ میں یورپ میں سب سے بڑا مانا جاتا تھا۔ اس کی تماشا گاہوں میں کھیل کود اور کرتب ہوا کرتے تھے اور شان و شوکت اور نمود و نمائش کا خوب زور شور تھا اس کے باوجود سلطنت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایرانیوں کے ساتھ برابر جنگ رہتی تھی۔ یہاں تک خسرو ثانی نے سلطنت روم کا کچھ علاقہ بھی چھین لیا تھا۔ عرب پر بھی برائے نام خسرو کی حکومت

تھی - اس نے مصر کو بھی فتح کر لیا تھا اور قسطنطنیہ تک جا پہنچا تھا - لیکن شہنشاہ ہرقل نے اسے شکست دے دی - اس کے بعد خسرو کو خود اس کے بیٹے کیقباد نے قتل کر دیا -

غرض مغرب میں یورپ اور مشرق میں ایران دونوں کا حال نہایت زبوں تھا - اس پر طرہ یہ کہ عیسائی فرقوں کی آپس کی خانہ جنگیوں کی کوئی انتہا نہیں تھی - یورپ اور افریقہ دونوں جگہ وہ فسق و فجور اور نفاق و فساد میں مبتلا تھی - ایران میں زرتشتی مذہب سرکاری مذہب تھا اور جبریہ لوگوں کے حلق میں ٹھونسا جاتا تھا - گویا یورپ افریقہ اور ایران میں ہر جگہ لوگ موجودہ مذہب سے عاجز آ گئے تھے - اسی زمانہ میں یعنی ساتویں صدی کے اوائل میں سارے یورپ میں خوفناک طاعون پھیل گیا اور لاکھوں آدمی اس کی نذر ہو گئے -

ہندوستان میں ہرش وردھن کی حکومت اور ہیون سانگ اسی زمانہ میں یہاں آیا تھا - ہرش کے دورِ حکومت میں تو ہندوستان بہت طاقتور تھا لیکن اس کے بعد ہی شمالی ہند کے حصے بکھرے ہو گئے اور بہت کمزور ہو گیا - چین میں تانگ خاندان کا دور ابھی شروع ہی ہوا تھا ۶۲۷ء میں ان کا ایک زبردست بادشاہ تائی سنگ تخت پر بیٹھا - اس کے زمانے میں چینی سلطنت مغرب میں بحرِ کیسپین تک پہنچ گئی - وسطی ایشیا کے قریب قریب تمام ملک اس کی بادشاہی کو تسلیم کرتے تھے اور اسے خراج ادا کرتے تھے لیکن اس تمام وسیع سلطنت میں غالباً کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی -

ظہور اسلام کے وقت ایشیا اور یورپ کی دنیا کی یہ کیفیت

تھی۔ چین اگرچہ طاقتور تھا لیکن دور تھا۔ ہندوستان بھی کچھ عرصہ تک طاقتور رہا لیکن اس سے بہت زمانے تک کوئی تصادم ہی نہیں ہوا رہ گئے یورپ اور افریقہ تو وہ کمزور اور شل ہو چکے تھے۔ ان میں جان باقی نہیں تھی۔

ہجرت کے سات سال کے اندر اندر محمدؐ مکہ کے مالک و مختار کی حیثیت سے وہاں داخل ہوئے لیکن اس سے پہلے مدینہ ہی سے انھوں نے دنیا کے بادشاہوں کے نام فرمان بھیجے۔ کہ ایک خدا اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔ قسطنطنیہ کے شہنشاہ ہرقل کو یہ فرمان اس وقت ملا تھا جب وہ شام میں ایرانیوں سے مصروف جنگ تھا ایران کے بادشاہ کو بھی یہی پیام بھیجا تھا اور سنا ہے کہ چین کے بادشاہ تائی سنگ کو بھی اسلام کی دعوت دی تھی۔ ان بادشاہوں کو حیرت ہوئی ہوگی کہ یہ کون غیر معروف شخص ہے جو ہم پر اس طرح حکم چلاتا ہے!

ان پیاموں سے ہم تصور کر سکتے ہیں کہ محمدؐ کو اپنی ذات پر اور اپنے پیام پر کتنا اعتماد ہوگا۔ یہی اعتماد اور ایمان انھوں نے اپنے پیروؤں میں پیدا کر دیا۔ اسی نے انھیں تسکین دی اور اسی نے اُنھیں اُبھارا۔ یہاں تک کہ ریگستان کے ان باشندوں نے جن کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں تھی معروف دنیا کا نصف حصہ فتح کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ ایمان اور خود اعتمادی بہت بڑی چیز تھی جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے انھیں اخوت کا سبق بھی سکھایا یعنی یہ بتایا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی

ہیں اور سب برابر ہیں۔ گویا لوگوں کے سامنے ایک طرح کی جمہوریت پیش کی گئی۔ اس زمانہ کی ناکارہ عیسائیت کے مقابلہ میں اخوت کے اس پیام میں نہ صرف عربوں کو بلکہ ان تمام ملکوں کے باشندوں کو جہاں جہاں وہ گئے ہوں گے بڑی کشش محسوس ہوئی ہو گی۔

محمدؐ نے ۶۳۲ء میں یعنی ہجرت کے صرف دس سال بعد رحلت فرمائی۔ لیکن اس مختصر مدت میں وہ عرب کے جنگ جو قبیلوں سے ایک قوم بنانے میں کامیاب ہو گئے اور اسے جوش ایمانی سے سرشار کر دیا۔ ان کے خاندان کے ایک عزیز ابو بکرؓ ان کے جانشین یا خلیفہ ہوئے۔ جانشینی کا تصفیہ عام جلسہ میں ایک طرح کے بے ضابطہ انتخاب کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ دو سال بعد ابو بکرؓ نے وفات پائی اور عمرؓ ان کے جانشین ہوئے جو دس سال تک خلیفہ رہے۔

ابو بکرؓ اور عمرؓ زبردست شخصیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے عرب اور اسلام کی عظمت کا سنگ بنیاد رکھا۔ خلیفہ کی حیثیت سے وہ دونوں مذہبی پیشوا بھی تھے اور سیاسی سردار بھی۔ گویا بادشاہ بھی اور پوپ بھی۔ اپنی مقتدر حیثیت اور سلطنت کی روز افزوں طاقت کے باوجود انھوں نے سادگی کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور عیش و عشرت اور شان و شوکت کو ہمیشہ ٹھکرایا۔ اسلام کی جمہوریت ان کے لئے ایک زندہ چیز تھی لیکن خود ان کے ماتحت افسر اور امیر ریشمین کپڑے پہننے لگے تھے اور عیش عشرت میں پڑ گئے تھے چنانچہ بہت سی روایتیں مشہور ہیں کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ دونوں نے ان افسروں کو بارہا لعنت ملامت کی اور سزا دی۔ حتیٰ کہ اکثر تکلفات پر زار و قطار روئے

بھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی ساری قوت سادگی اور جفاکشی میں ہے اور اگر عرب بھی ایرانی یا قسطنطنیہ کے محلوں کے سے تعیشات میں پڑ گئے تو وہ ناکارہ تباہ ہو جائیں گے۔

ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اس مختصر سی بارہ برس کی حکومت میں عربوں نے مشرقی رومی سلطنت اور ایران کی ساسانی حکومت دونوں کو شکست دے دی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مقدس شہر بیت المقدس پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا اور سارا شام۔ عراق اور ایران اس نئی عرب سلطنت میں شامل ہو گیا۔

(۴۹)

عربوں نے اسپین سے منگولیا تک فتح کرلیا

۲۳ مئی ۱۹۳۲ء

بعض دوسرے مذاہب کے بانیوں کی طرح محمدؐ نے بھی مروجہ رسوم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مذہب کی سادگی اور وضاحت نے اور جمہوریت و مساوات کی خصوصیت نے آس پاس کے ملکوں کے عوام الناس کو بہت متاثر کیا۔ مطلق العنان بادشاہ اور انھیں کی طرح خودسر اور ظالم مذہبی پیشوا عرصہ سے انھیں کچل رہے تھے۔ وہ اس نظام سے تنگ آگئے تھے اور انقلاب کے لئے بالکل تیار تھے۔ اسلام یہ انقلاب لے کر آیا وہ ان کے حق میں نعمت ثابت ہوا کیونکہ اس کے ذریعہ سے ان میں طرح طرح کی اصلاحیں ہوئیں اور بہت سی پرانی برائیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اسلام نے اگرچہ کوئی اتنا زبردست سماجی انقلاب تو نہیں کیا کہ امیر غریبوں کو بالکل نہ لوٹ سکیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ خود مسلمانوں کے اندر اس نے اس لوٹ کو بہت کچھ کم کردیا اور ان میں یہ احساس پیدا کردیا کہ وہ سب ایک عظیم الشان برادری کے فرد ہیں۔

چنانچہ عرب فتوحات پر فتوحات کرتے چلے گئے۔ اکثر انھیں بغیر لڑے فتح حاصل ہوتی گئی۔ رسولؐ کی رحلت کے پچیس سال کے اندر اندر عربوں نے ایک طرف تو پورا ایران، شام، ارمینا اور وسطی

ایشیار کا کچھ حصّہ فتح کر لیا اور دوسری طرف مصر اور شمالی افریقہ کا کچھ علاقہ. مصر سب سے زیادہ آسانی سے ان کے قبضہ میں آیا۔ کیونکہ رومی شہنشاہوں کے ہاتھوں یہی سب سے زیادہ لٹا تھا اور مختلف عیسائی فرقوں کی رقابتوں کا بھی سب سے زیادہ شکار رہا تھا۔ یہ فسانہ بھی مشہور ہے کہ عربوں نے سکندریہ کا مشہور کتب خانہ جلا ڈالا تھا۔ لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے۔ کہ یہ قصّہ بالکل غلط ہے. عرب تو کتابوں کے عاشق تھے پھر وہ ایسی وحشیانہ حرکت کیسے کر سکتے تھے۔ خیال یہ ہے کہ قسطنطنیہ کا بادشاہ تھیوڈوسیس جس کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں اس کتب خانے کے ایک حصّہ کی بربادی کا ذمہ دار ہے۔ اس کا ایک جزو تو بہت پہلے جولیس سیزر کے محاصرہ میں تباہ ہو گیا تھا۔ رہا سہا اس بادشاہ نے ختم کر دیا۔ دراصل وہ بت پرستی کی قدیم یونانی کتابوں کا سخت دشمن تھا۔ کیونکہ ان میں یونانی دیوی دیوتاؤں کا ذکر اور فلسفہ کی بحث ہوتی تھی اور وہ تھا بڑا کٹر عیسائی۔ چنانچہ سنا گیا ہے کہ وہ ان کتابوں سے اپنا حمام گرم کیا کرتا تھا۔

عرب والے مشرق اور مغرب میں دونوں طرف بڑھتے چلے گئے۔ مشرق میں انھوں نے ہرات۔ کابل اور بلخ فتح کیا اور سندھ ندی اور صوبۂ سندھ تک پہنچ گئے۔ لیکن اس کے آگے ہندوستان میں انھوں نے پیش قدمی نہیں کی اور سینکڑوں برس تک ہندوستان کے راجاؤں سے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ رہے۔ مغرب میں بھی وہ برابر بڑھتے چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ ان کا سپہ سالار عقبہ تمام شمالی افریقہ فتح کرتا ہوا بحر اوقیانوس کے کنارے تک یعنی موجودہ

مراقش کے مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ یہ رکاوٹ اسے بہت ناگوار ہوئی اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سمندر میں جہاں تک جا سکتا تھا گیا۔ پھر خدا کے سامنے اس بات کی شکایت کی کہ اس سمت اب کوئی زمین نہیں ہے۔ جسے وہ اس کی راہ میں فتح کر سکے۔

افریقہ اور مراقش ہوتے ہوئے مختصر سا سمندر عبور کر کے یہ عرب اسپین اور یورپ میں پہنچ گئے۔ قدیم یونانی اس تنگ آبنائے کو "ہرکولیس کے ستون" کہا کرتے تھے۔ عربی سپہ سالار جس نے یہ مہم سر کی تھی جبرالٹر پر اُترا تھا۔ چنانچہ اس بندرگاہ کا نام بھی اسی کے نام پر پڑ گیا اس کا نام طارق تھا اور جبرالٹر کا نام دراصل "جبل الطارق" تھا جس کے معنی ہیں "طارق کا پہاڑ"۔

اسپین بہت جلد فتح ہو گیا۔ اس کے بعد عربوں نے جنوبی فرانس پر یلغار کی۔ گویا محمدؐ کی وفات کے سو سال کے اندر اندر عربی سلطنت جنوبی فرانس اور اسپین سے لے کر تمام شمالی افریقہ اور نہر سویز تک اور عرب و ایران سے لے کر وسطی ایشیا اور منگولیا کی سرحد تک پھیل گئی۔ ہندوستان کا کوئی حصہ بجز سندھ کے شامل نہیں تھا۔ یورپ پر عرب دو طرف سے حملہ کر رہے تھے یعنی ایک تو براہ راست قسطنطنیہ کی طرف سے اور دوسرے افریقہ کے راستے سے فرانس پر جنوبی فرانس میں عرب بہت تھوڑی تعداد میں تھے اور اپنے وطن سے بہت دور تھے انھیں عرب سے کافی کمک نہ پہنچ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ عرب والے خود وسطی ایشیا فتح کرنے میں مصروف تھے۔ پھر بھی فرانس کے ان عربوں نے مغربی یورپ کے لوگوں کو اتنا خوفزدہ کر دیا تھا کہ انھوں


عربوں کی فتوحات
تور
اسپین
ترکستان
بغداد
ایران
انڈس
دمشق
مصر
مدینہ
عرب
افریقیہ

نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے آپس میں مل کر ایک زبردست اتحاد قائم کر لیا۔ چارلس مارٹل اس متحدہ جماعت کا سردار تھا۔ اس نے فرانس میں ٹورس کے مقام پر عربوں کو شکست دی۔ اس شکست نے یورپ کو عربوں سے بچا لیا۔ چنانچہ ایک مورخ لکھتا ہے کہ "پوری دنیا کی سلطنت عربوں کے ہاتھ میں آتے آتے رہ گئی"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عرب جنگ ٹورس میں جیت گئے ہوتے تو یورپ کی تاریخ آج بالکل مختلف ہوتی۔ یورپ میں انھیں کوئی اور روکنے والا نہیں تھا۔ وہ سیدھے قسطنطنیہ پہنچ کر دم لیتے اور راستے میں جو ریاستیں پڑتیں ان کا خاتمہ کرتے ہوئے۔ مشرقی رومی سلطنت کا قلع قمع کر دیتے پھر عیسائیت کے بجائے اسلام یورپ کا مذہب ہوتا۔ اور خدا جانے کیا کیا تبدیلیاں نہ ہوئی ہوتیں۔ لیکن یہ سب تو قیاس آرائیاں ہیں جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ یعنی عرب فرانس ہی میں روک دیئے گئے لیکن اسپین میں وہ اس کے بعد بھی سینکڑوں برس تک رہے اور حکمرانی کرتے رہے۔

اب اسپین سے منگولیا تک عربوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور ریگستانوں کے یہ خانہ بدوش اس عظیم الشان سلطنت کے سربلند حکمراں تھے۔ یورپ والے انھیں سارا سن (**Saracens**) کہتے تھے۔ شاید یہ صحرانشین کا بگڑا ہوا ہے جس کے معنی ہیں "ریگستان کے رہنے والے"۔ لیکن ان ریگستان کے رہنے والوں نے بہت جلد مدنیت اختیار کر لی اور عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ اب ان کے شہروں میں بھی بڑے بڑے عالیشان محل نظر آنے لگے مگر دور دور تک فتوحات حاصل

کر لینے کے باوجود ان کی خانہ جنگی کی پُرانی عادت نہ گئی اور اب توڑنے کی معقول وجہ بھی موجود تھی کیونکہ اب عرب کی سرداری کے معنی تھے ایک عظیم الشان سلطنت کی فرماں روائی چنانچہ خلافت کے لئے اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ قبیلوں کے نجی جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔ جن سے ایک عام خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی تھی ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے دو فرقے ہو گئے۔ یعنی سُنی اور شیعہ یہ فرقے اب تک موجود ہیں۔

دو بڑے خلفاء یعنی ابو بکر اور عمر کے بعد ہی مشکلات شروع ہو گئیں۔ کچھ عرصہ تک محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ کے خاوند علیؑ خلیفہ رہے۔ لیکن باہمی تصادم برابر جاری رہا۔ بالآخر علیؑ قتل ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ان کے صاحبزادے حسینؑ کو سارے خاندان سمیت کربلا کے میدان میں تہ تیغ کیا گیا۔ کربلا کا یہی وہ المناک حادثہ ہے جس کا سوگ ہر سال محرم کے مہینے میں تمام مسلمان عموماً اور شیعہ خصوصاً مناتے ہیں۔

اب خلیفہ مطلق العنان بادشاہ ہو گیا۔ جمہوریت یا انتخاب وغیرہ کا نام تک نہیں رہا۔ وہ بھی اسی طرح کا بادشاہ ہوتا تھا جیسے اس زمانے کے اور مطلق العنان حکمراں۔ محض اصولی طور پر وہ مذہبی پیشوا یا امیرالمومنین بھی مانا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ حتیٰ کہ بعض بادشاہوں نے تو اس اسلام کو جس کے وہ خاص محافظ سمجھے جاتے تھے۔ سخت ہتک کی۔

کوئی سو برس تک امیہ خاندان میں خلافت رہی دمشق ان کا دارالخلافہ تھا۔ چنانچہ اس قدیم شہر میں اچھے سے اچھے محلوں مسجدوں

نہروں اور کوشکوں سے چار چاند لگ گئے تھے۔ دمشق کا سلسلۂ آب رسانی ساری دنیا میں مشہور تھا۔ اس زمانہ میں عربوں نے فن تعمیر کا ایک خاص طرز پیدا کیا جو عربی فن تعمیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں سجاوٹ کو زیادہ دخل نہیں ہوتا لیکن اپنی انتہائی سادگی کے باوجود نہایت شاندار اور خوشنما ہوتا ہے۔

دراصل عرب اور شام کی دلکش کھجور کے درخت کا تخیل اس میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کی محرابوں۔ ستونوں۔ میناروں اور گنبدوں کو دیکھ کر محراب دار اور گنبد نما کھجوروں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

یہ فن تعمیر ہندوستان بھی پہنچا۔ لیکن ہندوستانی طرز سے مل جل کر ایک مخلوط طرز پیدا ہو گیا۔ عربی فن تعمیر کے چند بہترین نمونے اب بھی اسپین میں موجود ہیں۔

سلطنت اور دولت کے جلو میں عیش وعشرت اور تعیشات کے کھیل و تفریح کے سامان بھی آئے۔ گھوڑ دوڑ عربوں کا بہت محبوب شغل تھا اور پولو۔ شکار اور شطرنج سے بھی انھیں خاص شغف تھا۔ اسی طرح فن موسیقی بالخصوص گانے کا شوق فیشن تھا۔ حتیٰ کہ دارالخلافہ گوئیوں اور ان کے طائفوں سے بھرا پڑا۔

رفتہ رفتہ اسلام میں ایک اور تبدیلی بھی پیدا ہو گئی جو نہایت قابل افسوس تھی۔ یہ عورتوں سے متعلق تھی۔ عربوں میں عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں یعنی وہ گھروں میں چھپ کر اور بند ہو کر نہیں بیٹھتی تھیں وہ برابر باہر نکلتی تھیں۔ مسجدوں اور وعظ کے جلسوں میں جاتی تھیں حتیٰ کہ خود تقریریں کرتی تھیں۔ لیکن فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں نے اپنے دونوں جانب کی قدیم سلطنتوں (یعنی مشرقی رومی سلطنت اور ایرانی

سلطنت اکے رسم و رواج کی زیادہ سے زیادہ نقل اتارنا شروع کر دی
انھوں نے رومی سلطنت کو تو شکست دی اور ایرانی سلطنت کا
قلع قمع کیا لیکن خود ان کی بری عادتوں کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ یہ قسطنطنیہ
اور ایران ہی کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ عربوں میں عورتوں کے پردے کا
رواج ہو گیا۔ رفتہ رفتہ حرم کی بنیاد پڑی اور مردوں اور عورتوں کو اس
کا موقع نہ رہا کہ آپس میں مل جل سکیں بدقسمتی سے یہ پردہ اسلامی سماج
کی خصوصیت بن گیا اور جب مسلمان ہندوستان آئے تو ہندوستانیوں نے
بھی اُن سے یہ سیکھ لیا۔ مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ بعض لوگ اب
بھی اس وحشت کو گوارا کرتے ہیں۔ جب کبھی میں ان عورتوں کا تصوّر
کرتا ہوں جو اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکیں اور باہر کی
دنیا سے بالکل الگ ہو کر رہ گئیں ہیں تو ہمیشہ قید خانے یا چڑیا گھر کا نقشہ
میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ بھلا کوئی قوم کیسے ترقی کر سکتی ہے
اگر اس کی نصف آبادی ایک قسم کے جیل خانے میں بند پڑی ہو؟

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اب ہندوستان پردے کو بڑی تیزی
سے ترک کر رہا ہے۔ مسلمان بھی ایک حد تک اس مصیبت سے نجات
پا چکے ہیں۔ ترکی میں کمال پاشا نے تو اس کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے اور
مصر میں بھی یہ ختم ہو رہا ہے۔

بس ایک بات مجھے اور کہنا ہے۔ اس کے بعد یہ خط ختم کر دوں
گا۔ اگرچہ عرب لوگ اپنی بیداری کے ابتدائی دور میں جوش ایمانی
سے سرشار تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نہایت روادار تھے اور
ان کی مذہبی رواداری کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بیت المقدس

میں خلیفہ عمرؓ نے اس کا خاص ثبوت دیا تھا۔ اسپین میں عیسائیوں کی بہت بڑی آبادی موجود تھی جسے اپنے ضمیر کی پوری آزادی حاصل تھی اگرچہ ہندوستان میں اس زمانہ میں سندھ کے علاوہ کسی جگہ اُن کی حکومت نہیں رہی۔ لیکن ہندوؤں سے اکثر ان کا واسطہ پڑتا تھا اور بڑے خوشگوار تعلقات رہے۔ سچ پوچھو تو تاریخ کے اس دور کی سب سے خاص چیز یہی تھی کہ عربی مسلمان جتنے روادار تھے یورپ کے عیسائی اتنے ہی متعصب تھے۔

(۵۰)

بغداد اور ہارون الرشید

۲۷ رمئی ۱۹۳۲ء

دوسرے ملکوں کا تذکرہ شروع کرنے سے پہلے ابھی ہم عربوں کا قصہ بیان کریں گے۔

میں اپنے پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ کوئی سو برس تک رسولؐ کے خاندان کی ایک شاخ بنو امیہ میں خلافت رہی۔ ان کا دارالخلافہ دمشق تھا اور ان کے زمانے میں عربی مسلمان اسلام کا پیام دور دور تک لے گئے یہ عرب دور دراز ملکوں میں تو فتوحات کرتے تھے لیکن خود ان کے وطن میں لڑائی جھگڑے جاری تھے اور اکثر خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی۔ بالآخر رسول کے خاندان کی ایک دوسری شاخ نے بنو امیہ کا خاتمہ کر دیا۔ یہ آپ کے چچا عباس کی اولادیں تھے اس لئے انھیں عباسی یا بنو عباس کہتے ہیں عباسی آئے تو تھے بنو امیہ کے مظالم کی تلافی کا دعویٰ لے کر لیکن جب انھیں فتح حاصل ہوگئی تو ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری میں انھوں نے بنو امیہ کو بھی مات کر دیا۔ انھوں نے حتی الامکان امیہ خاندان کے ایک ایک فرد کو ڈھونڈھ نکالا اور چُن چُن کر انھیں بڑے وحشیانہ طریقے سے قتل کیا۔

۷۵۰ء میں عباسی خلفاء کے طویل دورِ حکومت کی اس طرح ابتدا ہوئی، اگرچہ یہ کچھ خوشگوار اور مبارک ابتدا نہ تھی پھر بھی عربی تاریخ میں عباسیوں کا دور بہت درخشاں گذرا ہے۔ لیکن بنو امیہ

کے زمانہ کے مقابلہ میں اب بہت کچھ انقلاب ہو چکا تھا۔ خانہ جنگیوں نے تمام عربی سلطنت کو ہلا دیا تھا۔ عباسیوں کی وطن میں تو فتح ہو گئی لیکن اسپین کا صوبہ دار امیہ خاندان سے تھا اس نے عباسیوں کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ہی افریقہ کا صوبہ بھی کم و بیش خود مختار ہو گیا مصر نے بھی اس کی پیروی کی بلکہ اس نے ایک دوسرے خلیفہ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ چونکہ مصر بہت قریب تھا اور اسے آسانی سے ڈرایا دھمکایا اور اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا اس لئے اکثر اس کی سرزنش کی جاتی رہی لیکن افریقہ کا کوئی تدارک نہ ہو سکا۔ رہا اسپین تو وہ اتنا دور تھا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ غرض عباسیوں کی تخت نشینی کے بعد عربی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اب خلیفہ سارے مسلمانوں کا سردار یا امیر المومنین نہ رہا۔ اس کے علاوہ اسلام بھی اب متحد و متفق نہ تھا۔ اسپین کے عربوں اور عباسیوں کو ایک دوسرے سے اتنی سخت نفرت تھی کہ اگر ایک پر کوئی بلا نازل ہو تو دوسرا خوش ہوتا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود عباسی خلیفہ بڑے زبردست فرمانروا تھے۔ ان کی سلطنت عام معیار کے مطابق ایک بڑی سلطنت تھی۔ وہ پرانا جذبۂ ایمانی اور جوش عمل جو پہاڑوں کو فتح کر لیتا تھا اور سوکھے جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پھیل جاتا تھا اب کہاں تھا؟ اب نہ وہ سادگی باقی رہ گئی تھی اور نہ جمہوریت تھی اور خلیفہ بھی ایران کے شہنشاہ سے جسے عربوں کے اسلاف نے شکست دی تھی یا قسطنطنیہ کے بادشاہ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ رسول کے زمانہ کے عربوں میں وہ عجیب و

غریب طاقت اور زندگی تھی جس کا بادشاہوں کی فوجیں بھی مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے زمانہ کی دنیا میں سرفراز اور سر بلند تھے اور جس وقت وہ آندھی کی طرح اٹھتے اور طوفان کی طرح بڑھتے تھے تو بڑے بڑے بادشاہوں اور ان کے لشکروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ عوام ان بادشاہوں سے عاجز آگئے تھے اور عرب عوام کی بہبودی اور سماجی انقلاب کا پیام لے کر آئے تھے اس لئے سب ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔

لیکن اب یہ سب باتیں کہاں تھیں۔ اب تو ریگستان کے رہنے والے محلوں میں براج رہے تھے اور کھجوروں کے بجائے لذیذ ترین غذائیں کھاتے تھے۔ جب خود ان کی چین سے گزرتی تھی تو سماجی انقلاب یا تبدیلیوں کی فکر کیوں کرتے؟ انھوں نے بھی شان و شوکت کے معاملہ میں پرانی سلطنتوں سے بازی لے جانے کی کوشش کی۔ اور اس سلسلہ میں ان کی بہت سی بری عادتیں بھی سیکھ لیں۔ ان میں سے ایک بری عادت جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں عورتوں کو گھروں میں بند کر کے رکھنا ہے۔

اب دارالخلافہ دمشق کی بجائے عراق میں بغداد کو منتقل ہو گیا۔ دارالخلافہ کی یہ تبدیلی خود اپنی جگہ پر نہایت اہم تھی کیونکہ بغداد ایرانی بادشاہوں کی گرمیوں کی آرام گاہ تھا۔ اس کے علاوہ دمشق کے مقابلہ وہ یورپ سے زیادہ دور تھا۔ گویا اب عباسیوں کی نظر یورپ کے بجائے ایشیا کی طرف زیادہ تھی۔ ابھی تو قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی بہت سی کوششیں اور یوروپین اقوام سے بہت سی لڑائیاں ہونا باقی تھیں۔ لیکن یہ سب لڑائیاں عموماً مدافعتی ہوئیں۔ فتوحات کا زمانہ

تو اب ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے عباسی خلیفہ یہ چاہتے تھے جو کچھ سلطنت باقی رہ گئی ہے اس کو مضبوط اور مستحکم بنالیں۔ اسپین اور افریقہ کو چھوڑ کر بھی یہ سلطنت بہت بڑی تھی۔

بغداد کا نام تو تمہیں خوب یاد ہوگا۔ وہی ہارون الرشید اور شہرزاد کا بغداد جس کے حیرت انگیز قصے الف لیلہ میں لکھے ہیں؟ عباسی خلفاء کے زمانہ میں جس شہر کو عروج ہوا یہ وہی الف لیلہ کا شہر تو تھا۔ یہ بہت بڑا شہر تھا۔ جو محلوں۔ سرکاری دفتروں۔ اسکولوں اور کالجوں۔ بڑی بڑی دکان۔ باغوں اور چمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں کے تاجروں کی مشرق اور مغرب کے ساتھ نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت جاری تھی بیشمار سرکاری حکام سلطنت کے دور دراز کے مقامات کی خبر رکھتے تھے۔ نظام حکومت اب زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا تھا اور بہت سی محکموں پر مشتمل تھا۔ ڈاک کا نہایت معقول انتظام تھا۔ اور اس کے ذریعہ سے سلطنت کا گوشہ گوشہ دارالخلافہ سے منسلک تھا۔ اسپتالوں کی افراط تھی۔ ساری دنیا سے لوگ بغداد آیا کرتے تھے۔ خاص کر عالموں طالب علموں اور صناعوں کے لئے یہ خاص کشش رکھتا تھا کیونکہ یہ مشہور تھا کہ خلیفہ قابل لوگوں کی اور ماہرین فن کی بڑی قدر کرتا ہے۔

خلیفہ خود بڑی عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اس کے چاروں طرف غلاموں کا مجمع رہتا تھا اور عورتوں سے پُر تھا۔ ظاہری شان وشوکت کے لحاظ سے سلطنت عباسیہ ۷۵۰ء سے ۸۰۹ء تک ہارون الرشید کے زمانہ میں اوج کمال پر تھی۔ ہارون الرشید کے دربار میں چین کے شہنشاہ اور مغرب کے بادشاہ چارلس کے پاس سے سفیر آیا کرتے تھے۔ غرض بغداد

اور عباسی سلطنت، فن حکومت، تجارت اور علم وفضل کی ترقی کے معاملہ میں اسپین کو چھوڑ کر جو عربوں ہی کی زیر حکومت تھا سارے یورپ سے بڑھی ہوئی تھی۔

عباسی دور سے خاص طور پر ہمیں اس لئے دلچسپی ہے کہ اس نے سائنس کا ایک نیا شوق پیدا کر دیا۔ تم جانتی ہو کہ جدید دنیا میں سائنس بہت بڑی چیز ہے۔ ہم اس کے بہت زیادہ مرہون منت ہیں۔ سائنس محض بیٹھ کر مختلف چیزوں کے ظہور میں آنے کی دعا نہیں کیا کرتی۔ وہ اس کی جستجو کرتی ہے کہ یہ چیزیں کیوں اور کیسے ظہور میں آتی ہیں۔ وہ تجربوں پر تجربے کرتی ہے۔ بار بار کوشش کرتی ہے۔ کبھی ناکام رہتی ہے اور کبھی کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ تھوڑا تھوڑا کر کے انسانی علم میں اضافہ کرتی ہے۔ ہماری موجودہ دنیا قدیم دور یا دور وسطیٰ سے بالکل مختلف ہے۔ اور یہ سب سائنس ہی کا طفیل ہے۔ سچ پوچھو تو جدید دنیا سائنس کی ساختہ و پرداختہ ہے۔

قدیم زمانہ میں نہ تو مصر میں، نہ چین میں اور نہ ہندوستان میں سائنس کا رواج تھا البتہ قدیم یونان میں اس کا تھوڑا بہت چرچا تھا۔ اس کے بعد روم میں اس کا نشان تک نہیں ملتا۔ لیکن عربوں میں تحقیق تفتیش کا یہ جذبہ موجود تھا اس لئے انھیں موجودہ سائنس کا بانی کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ بعض مضامین میں مثلاً طب اور ریاضی میں انھوں نے ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے پنڈت اور ریاضی داں کافی تعداد میں بغداد پہنچے تھے اور بہت سے عربی طالب علم شمالی ہند میں ٹکسیلا میں آئے تھے جو اب بھی بہت بڑی یونیورسٹی تھی اور طب کی تعلیم کے لئے خاص طور پر مشہور تھی۔ طبی اور دیگر مضامین کی سنسکرت کتابوں

کا خاص طور پر عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ بہت سی چیزیں مثلاً کاغذ سازی عربوں نے چینیوں سے سیکھی لیکن دوسروں سے حاصل کئے ہوئے علم کی بنا پر انھوں نے خود بھی تحقیق و تفتیش کی اور بہت سی اہم چیزیں دریافت کرلیں۔ مثلاً دوربین اور قطب نما سب سے پہلے انہی نے ایجاد کی طب کے معاملہ میں عربی حکما اور جراح سارے یورپ میں مشہور تھے۔

اس میں شک نہیں کہ بغداد ان تمام علمی تحریکوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دوسرا مرکز قرطبہ تھا۔ جو مغرب میں عربی اسپین کا دار السلطنت تھا۔ ان کے علاوہ عربی دنیا میں اور بہت سی یونیورسٹیاں بھی تھیں جہاں علم کا چراغ روشن تھا۔ مثلاً قاہرہ اور بصرہ اور کوفہ وغیرہ لیکن ان تمام مشہور شہروں کی ناک بغداد تھا جس کے متعلق ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ "وہ اسلام کا صدر مقام، عراق کا چشم و چراغ سلطنت کی راجدھانی اور حسن و جمال تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کا مرکز تھا۔ اس کی آبادی بیس لاکھ سے زیادہ تھی۔ یعنی ہمارے موجودہ کلکتہ یا بمبئی سے قریب قریب دو گنی تھی۔

تمھیں یہ سن کر دلچسپی ہوگی کہ موزے پہننے کی ابتدا بغداد کے امرانے کی تھی ہماری ہندوستانی زبان میں موزہ کا لفظ عربی سے آیا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی کا لفظ شمیس عربی لفظ قمیص کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ قمیص اور موزے دونوں عرب سے قسطنطنیہ پہنچے اور وہاں سے سارے یورپ میں۔

عرب ہمیشہ سے بہت بڑے سیاح تھے۔ وہ برابر دور دور تک بحری سفر کرتے تھے اور افریقہ میں۔ ہندوستان کے ساحل پر ملایا میں حتیٰ کہ چین میں بھی انھوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کرلیں ان کا ایک

مشہور سیاح البیرونی گذرا ہے۔ جو ہندوستان بھی آیا تھا اور ہیون سانگ کی طرح اس نے بھی سفرنامہ لکھا ہے۔

عرب لوگ مورّخ بھی تھے اور ہمیں اپنی کتابوں اور تاریخوں سے ان کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھے اچھے افسانے اور داستانیں لکھتے تھے ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے عباسی خلفاء اور ان کی سلطنت کا نام بھی نہ سُنا ہوگا۔ لیکن اس پُر اسرار اور رومانی شہر الف لیلہ کے بغداد کو ضرور جانتے ہوں گے۔ تخیل کی دنیا اکثر واقعات کی دنیا کے مقابلہ میں زیادہ حقیقی اور دیرپا ہوتی ہے۔

ہارون الرشید کے انتقال کے بعد ہی عربی سلطنت مصیبت میں پھنس گئی۔ ہر جگہ بدنظمی کا دور دورہ ہو گیا۔ بہت سے صوبے خودمختار ہو گئے۔ اور صوبیدار مستقل بادشاہ بن بیٹھے۔ خلیفہ روز بروز کمزور ہوتا گیا۔ یہاں تک ایک دن ایسا آیا جب کہ خلیفہ صرف شہر بغداد اور آس پاس کے گاؤں کا حکمران رہ گیا ایک خلیفہ کو تو اس کے سپاہیوں نے محل سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا تھا اور اسے قتل کر ڈالا تھا اس کے بعد کچھ مدت تک چند با اقتدار لوگوں کا طوطی بولتا رہا جن کے ہاتھوں میں خلیفہ کٹھ پتلی کی طرح تھا اور یہ اس کی آڑ میں خود حکومت کرتے رہتے۔

اب اسلام کا اتحاد ایک قصہ ماضی تھا۔ مصر سے خراسان تک ہر جگہ جدا جدا سلطنتیں قائم ہو گئیں اور مشرق میں اس کے آگے کے علاقے سے خانہ بدوش قومیں مغرب کی طرف اُمنڈ کر آنے لگیں

وسطی ایشیا کے قدیم ترک اب مسلمان ہوگئے تھے۔ انھوں نے بڑھ کر بغداد پر قبضہ کر لیا۔ انھیں سلجوقی ترک کہتے ہیں۔ سارا یورپ یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ انھوں نے قسطنطنیہ کی فوجوں کو شکست فاش دے دی۔ کیونکہ یورپ اس خیال میں تھا کہ عرب اور مسلمان اپنی ساری طاقت کھو چکے ہیں اور روز بروز کمزور ہو جا رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عربوں کی حالت بہت گر گئی تھی لیکن اب اسلام کا پرچم بلند رکھنے کے لئے سلجوقی ترک میدان میں آئے اور یورپ کو مقابلہ کی دعوت دی۔

چنانچہ یہ دعوت فوراً قبول کر لی گئی اور یورپ کی عیسائی قوموں نے مسلمانوں سے لڑنے اور اپنے مقدس شہر بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے صلیبی جنگیں شروع کیں کوئی سو برس تک عیسائیت اور اسلام، شام، فلسطین اور ایشیائے کوچک پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں دست و گریباں رہے حتیٰ کہ انھوں نے ایک دوسرے کو بالکل شل کر دیا اور ان ملکوں کی زمین کا چپہ چپہ انسانی خون سے رنگین کر دیا۔ اس کے علاوہ، یہاں کے تمام بڑے بڑے شہروں کی رونق اور تجارت سب غارت ہو گئی اور سرسبز و شاداب کھیت بنجر بن گئے۔

غرض اس طرح وہ آپس میں لڑتے رہے لیکن اس سے بیشتر کہ یہ لڑائی ختم ہو، منگولیا میں چنگیز خاں مغل پیدا ہوا جسے لوگ "اشعب عالم" کہتے ہیں اور واقعی اس نے ایشیا اور یورپ دونوں کو ہلا دیا۔ آخر کار اس نے اور اس کی اولاد نے بغداد اور اس کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ بغداد کا یہ عظیم الشان اور مشہور شہر مغلوں

کے تخت و تاراج کے بعد محض راکھ اور مٹّی کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے بیس لاکھ باشندوں میں سے اکثر ہلاک ہو گئے یہ ۱۲۵۸ء کا واقعہ ہے۔

بغداد کو اب پھر عروج حاصل ہو رہا ہے اور وہ حکومت عراق کا صدر مقام ہے۔ لیکن اب تو اُسے اپنے ماضی کا ایک دھندلا سا عکس سمجھنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مغلوں کے حملہ کی تباہی سے پھر کبھی نہ پنپ سکا۔

(۱۵)

شمالی ہند، ہرش کے زمانے سے محمود غزنوی کے حملوں تک

یکم جون ۳۲ء

تھوڑی دیر کے لئے ہم عربوں کے قصے کو یہیں چھوڑتے ہیں تاکہ دوسرے ملکوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں جس زمانے میں عربوں نے طاقت حاصل کی، فتوحات پر فتوحات کیں، سارے ایشیا اور یورپ میں پھیل گئے اور پھر ان کا زوال ہوا۔ اس زمانہ میں ہندوستان چین اور یورپ کے مختلف ملک کس حال میں تھے؟ اس کی ایک آدھ جھلک تو ہم دیکھ چکے ہیں یعنی ۷۳۲ء میں فرانس کے ٹورس کے میدان میں چارلیس مارٹل کی سرکردگی میں ایک مشترکہ فوج نے عربوں کو شکست دی۔ دوسری طرف عربوں نے وسطی ایشیا کو فتح کیا اور ہندوستان میں وہ سندھ تک پہنچ گئے۔ اچھا پہلے ہندوستان سے شروع کریں۔

قنوج کے راجہ ہرش وردھن کا ۶۴۸ء میں انتقال ہوا۔ اور اس کے انتقال کے بعد ہی شمالی ہند کا سیاسی تنزل بہت نمایاں ہو گیا۔ کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ برابر جاری تھا جسے ہندو دھرم اور بدھ مت کے تصادم سے اور مدد ملی۔ ہرش کے زمانے میں ظاہری کروفر بہت تھا لیکن یہ صرف تھوڑے دن رہا۔ اس کے بعد شمال میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ کبھی ان میں سے کسی کسی کا تھوڑے دن کے لئے عروج ہو جاتا تھا اور کبھی وہ آپس میں لڑا جھگڑا کرتی تھیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ

ہے کہ ہرش کے بعد کے ان تین سو برس میں بھی علم و فن کا برابر چرچا رہا اور مفاد عامہ کے لئے بہت سی اچھی اچھی عمارتیں وغیرہ تعمیر ہوئیں سنسکرت کے بہت مشہور مُصنف مثلاً بھبوتی اور راج شیکرا اسی زمانہ میں گذرے ہیں اور بہت سے راجا بھی اگرچہ سیاسی حیثیت سے وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن اس لحاظ سے بہت نامور ہوئے ہیں کہ علم و فن نے ان کے زمانے میں بہت ترقی کی۔ ان میں سے ایک راجہ بھوج بھی تھے جو قدیم طرز کے بادشاہوں میں قابل تقلید نمونہ سمجھے جاتے ہیں اور آج تک لوگ اُن کی مثال دیتے ہیں۔

لیکن ان چند درخشاں مثالوں سے قطع نظر شمالی ہند بحیثیت مجموعی رو بہ انحطاط تھا۔ جنوبی ہند پھر آگے بڑھ رہا تھا اور شمال پر چھاتا جا رہا تھا میں اپنے کسی[1] پچھلے خط میں اس زمانہ کا جنوب کا کچھ حال لکھ چکا ہوں یعنی چلوکیہ۔ چولا۔ پالو اور راشٹر کوٹ کی سلطنتوں کا تذکرہ کر چکا ہوں اس کے علاوہ میں شنکر آچاریہ کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ جنھوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں سارے ملک کے عالموں اور جاہلوں دونوں کے دل و دماغ پر سکہ بٹھا دیا۔ اور ہندوستان سے بدھ مت کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس وقت وہ ایک پرانے مذہب کو ہندوستان سے باہر نکالنے میں مصروف تھے اس وقت ایک نیا مذہب ہندوستان کے دروازے تک پہنچ گیا تھا جو کچھ عرصہ بعد اپنے ساتھ فتوحات کا ایک سیلاب لے کر آیا اور ہندوستان کے قدیم نظام کو ڈانواڈول کر دیا۔

عرب والے ہندوستان کی سرحد پر اسی وقت پہنچ گئے تھے

---

[1] ملاحظہ ہو باب ۴۴

جب ہرش زندہ تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے لئے وہ وہیں رک گئے اور انھوں نے سندھ کے قبضہ پر اکتفا کی۔ لیکن ۷۱۱ء میں ایک ۱۷ برس کا نوجوان محمدؐ بن قاسم عربی فوج لے کر آیا اور پنجاب کے مغرب میں ملتان تک وادیٔ سندھ کو فتح کرتا ہوا پہنچ گیا۔ ہندوستان میں عربوں کی فتوحات کی یہ آخری حد تھی۔ اگر وہ جانیں لڑا دیتے تو ممکن تھا کہ اور آگے بڑھ جاتے۔ چونکہ شمالی ہند بہت کمزور ہو گیا تھا اس لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا۔ اگرچہ ان عربوں اور آس پاس کے راجاؤں میں کافی لڑائیاں ہوتی رہیں لیکن انھوں نے ملک فتح کرنے کی باضابطہ کوشش نہیں کی۔ اس لئے سیاسی حیثیت سے عربوں کا سندھ فتح کر لینا کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا فتح تو ہندوستان کو مسلمانوں نے کئی سو برس بعد کیا ہے لیکن تمدنی حیثیت سے عربوں اور ہندوستانیوں کے میل جول سے بہت اہم نتائج مترتب ہوئے ہیں۔

جنوبی ہند کے راجاؤں سے خاص کر راشٹر کوٹوں سے عربوں کے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ بہت سے عرب ہندوستان کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی بستیوں میں مسجدیں بھی بنا لی تھیں۔ عرب سیاح اور تاجر ہندوستان کے مختلف حصوں میں آتے جاتے تھے۔ عرب طالب علم کافی تعداد میں شمال کی ٹکسیلا یونیورسٹی میں آتے تھے جو طب کی تعلیم کے لئے خاص طور پر مشہور تھی۔ کہتے ہیں کہ ہارون الرشید کے زمانے میں ہندوستان کی سند بغداد میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے طبیب اسپتالوں اور طبی مدرسوں کی تنظیم کے لئے بلائے جاتے تھے۔ ریاضی اور علم ہیئت کی سنسکرت کی کتابوں کے عربی میں ترجمے کئے گئے تھے۔

غرض عربوں نے قدیم ہندی آریہ تہذیب سے بہت کچھ حاصل کیا۔ انھوں نے ایران کی آریہ تہذیب اور یونانی تہذیب سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ وہ ایک نئی قوم کی طرح تھے جس کا جوش عین شباب پر ہوتا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے چاروں طرف جتنی قدیم تہذیبیں دیکھیں ان سب سے فائدہ اٹھایا۔ سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا اور ان سب کی مدد سے انھوں نے خود اپنی ایک چیز بنا لی۔ یعنی عربی تہذیب کی بنیاد ڈالی عام تہذیبوں کی طرح اس نے بھی بہت مختصر زندگی پائی۔ لیکن یہ نہایت درخشاں زندگی تھی جو یورپ کے دور وسطیٰ کی تاریکی کے سامنے جگمگاتی نظر آتی ہے۔

یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ عربوں نے تو۔ ہندی آریہ۔ ایرانی اور یونانی تہذیبوں کے ساتھ اختلاط سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ لیکن ہندوستانی، ایرانی اور یونانی اس سے محروم رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب اس میدان میں بالکل نو وارد تھے اور جوش و ولولے سے بھرے ہوئے تھے۔ برخلاف اس کے دوسری قومیں مسن ہو گئی تھیں پرانی لکیر کی فقیر تھیں اور تبدیلی یا انقلاب کی طرف ان کی ذرا توجہ نہ تھی حیرت کی بات ہے کہ زمانے اور سن و سال کا پوری کی پوری قوم پر بھی وہی اثر ہوتا ہے جو افراد پر ہوتا ہے۔ یعنی اس کے قدم بھی ایک بوڑھے شخص کی طرح آہستہ آہستہ پڑنے لگتے ہیں۔ دماغ اور جسم میں کوئی لچک باقی نہیں رہتی۔ گویا وہ قدامت پرست ہو جاتے ہیں اور ہر طرح کی تبدیلی سے ڈرتے اور بھاگتے ہیں۔

غرض کہ ہندوستان پر عربوں کے اس میل جول کا جو کئی

سو برس تک رہا کوئی اثر نہ پڑا۔ لیکن اس طویل عرصہ میں اُسے اس نئے مذہب یعنی اسلام کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور حاصل ہوگئی ہوگی۔ عرب مسلمانوں کی آمدورفت برابر جاری تھی۔ انھوں نے یہاں مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ کبھی کبھی اپنے مذہب کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور بہت سے لوگوں کو مسلمان بھی کر لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں اس چیز پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ نہ ہندو دھرم اور اسلام میں کوئی تصادم یا جھگڑا ہوا۔ یہ بات اس لئے قابل لحاظ ہے کہ کچھ عرصے بعد ان دونوں مذہبوں میں ٹکر ہوئی اور لڑائی جھگڑے شروع ہوگئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ گیارہویں صدی میں مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہاتھ میں تلوار لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے چنانچہ اس کا زبردست ردعمل ہوا یعنی باہمی منافرت اور کشمکش نے سابقہ رواداری کی جگہ لے لی۔

یہ تلوار سے کام لینے والا قتل و غارت کا طوفان برپا کرتا اور آگ لگاتا ہوا ہندوستان آیا محمود غزنوی تھا۔ غزنی افغانستان میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ دسویں صدی میں غزنی اور اس کے قرب و جوار میں ایک چھوٹی سی سلطنت قائم ہوئی۔ وسطی ایشیا کی ریاستیں محض برائے نام خلیفۂ بغداد کے ماتحت تھیں۔ لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ خلیفہ ہارون الرشید کے انتقال کے بعد خلافت کمزور ہوگئی حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور اس کی جگہ بہت سی خودمختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ اس وقت ہم اُسی زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ ۹۷۵ء میں غزنی اور قرب و جوار میں سبکتگین نامی ایک ترکی غلام نے اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی۔

اس نے ہندوستان پر بھی حملہ کیا تھا۔ اس زمانہ میں لاہور کا راجہ جے پال تھا وہ اتنا دلیر تھا کہ سبکتگین کے مقابلہ کے لئے وادی کابل تک بڑھ گیا جس کی وجہ سے اسے شکست کھانی پڑی۔

سبکتگین کے بعد اس کا بیٹا محمود اس کا جانشین ہوا وہ بڑا بانکا سپہ سالار تھا اور لشکر کشی میں کمال رکھتا تھا چنانچہ وہ ہر سال ہندوستان پر حملہ کیا کرتا تھا۔ قتل و غارتگری کا بازار کرتا۔ اور بے شمار دولت اور قیدی ساتھ لے جاتا تھا۔ اس نے کل سترہ حملے کئے۔ صرف ایک کشمیر کا حملہ تو ناکام رہا۔ باقی سب کامیاب ہوئے۔ یہاں تک کہ شمالی ہند میں سب اس کے نام سے کانپتے تھے وہ پاٹلی پتر متھرا اور سومناتھ تک پہنچا۔ سنا ہے کہ تھانیسور سے وہ بے شمار دولت اور دو لاکھ قیدی لے گیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ دولت اسے سومناتھ میں ہاتھ لگی۔ کیونکہ یہاں ایک بہت بڑا مندر موجود تھا جس میں صدیوں کے نذرانے جمع تھے کہتے ہیں جب محمود سومناتھ کے قریب پہنچا تو ہزاروں آدمیوں نے مندر میں جا کر پناہ لی اس توقع میں کہ ضرور کوئی معجزہ ظاہر ہوگا اور وہ دیوتا جن کی وہ پرستش کرتے ہیں انھیں بچائے گا لیکن معجزے تو بس عقیدت مندوں کے تخیل ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ محمود نے مندر کو مسمار اور وہاں کی دولت پر قبضہ کر لیا اور پچاس ہزار آدمی اس معجزے کے انتظار میں فنا ہو گئے جو نہ ظاہر ہونا تھا نہ ہوا۔

سنہ ۱۰۳۰ء میں محمود کا انتقال ہو گیا اس وقت تمام پنجاب اور سندھ اس کے زیر نگیں تھا لوگ اسے اسلام کا بڑا حامی سمجھتے ہیں جو ہندوستان میں اسلام پھیلانے آیا تھا۔ مسلمان عموماً اس کی قدر

کرتے ہیں اور ہندو اس سے نفرت کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مذہبی آدمی نہ تھا مسلمان تو ضرور تھا لیکن یہ اس کی شخصیت کا محض ایک ضمنی پہلو تھا۔ دراصل وہ ایک سپاہی اور بڑا لاجواب سپاہی تھا۔ عام سپاہیوں کی طرح وہ ہندوستان کو فتح کرنے اور لوٹنے آیا تھا اور چاہے اس کا کسی مذہب سے تعلق ہوتا وہ یہی کرتا۔ اس سلسلہ میں یہ چیز بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس نے سندھ کے مسلمان فرمانروا کو حملہ کی دھمکی دی تھی چنانچہ جب اس نے خراج دینا منظور کیا اور اطاعت قبول کی اسوقت اس کی جان چھوڑی۔ اس نے خلیفہ بغداد کو بھی قتل کی دھمکی دی تھی اور اس سے سمرقند کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لئے ہمیں اس عام غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہئے کہ محمود ایک کامیاب سپاہی کے سوا کچھ اور بھی تھا۔

محمود اپنے ساتھ بہت سے ہندوستانی صناع اور معمار بھی غزنی لے گیا اور وہاں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی جسے اس نے "بہشتی دلہن" کا خطاب دیا تھا۔ وہ باغوں کا بھی بہت شوقین تھا۔

محمود نے متھرا کا کچھ حال بھی لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتنا بڑا شہر تھا۔ اپنے غزنی کے صوبیدار کے نام ایک خط میں وہ لکھتا ہے کہ "یہاں متھرا میں ہزاروں عمارتیں موجود ہیں جو اتنی مستحکم ہیں جیسے مومن کا ایمان۔ یہ شہر لاکھوں دینار کے صرف کے بعد اپنی موجودہ حالت کو پہنچا ہوگا اور یہ ناممکن ہے کہ آئندہ دو سو برس تک اس کی کوئی جدید مثال پیش کی جا سکے۔"

محمود کی بیان کی ہوئی متھرا کی یہ تفصیل فردوسی کے شاہنامے میں ملتی ہے۔ فردوسی محمود کے زمانے کا بڑا مشہور فارسی شاعر تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کا اور اس کی تصنیف شاہنامے کا ذکر پچھلے سال اپنے کسی خط میں کیا تھا۔ قصہ یوں مشہور ہے کہ فردوسی نے محمود کے حکم سے شاہنامہ لکھا تھا اور محمود نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہر شعر کے عوض اُسے ایک دینار انعام میں دیا جائے گا۔ لیکن فردوسی نے اختصار کا لحاظ نہ رکھا اس نے بڑی شرح و بسط سے شاہنامہ لکھا۔ پھر جب اس نے یہ ہزاروں اشعار کا مجموعہ محمود کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے اس کے کارنامے کی تعریف تو بہت کی لیکن انعام دینے کا جو بے سوچے سمجھے وعدہ کر لیا تھا اسے پورا نہیں کیا۔ اس نے موعودہ رقم سے بہت کم اسے دینا چاہی لیکن فردوسی خفا ہو گیا اور اس نے ایک کوڑی بھی قبول نہیں کی۔

ہم نے ہرش سے محمود تک بہت کافی زمانہ طے کر ڈالا اور چند ثانیوں (پیراگراف) میں ہندوستان کی ساڑھے تین سو برس کی تاریخ بیان کر دی۔ اس طویل زمانے میں غالباً بہت سی دلچسپ باتیں ہوئی ہوں گی لیکن مجھے اس کا علم نہیں ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ میں خاموش رہوں۔ یہ ممکن تھا کہ میں تمہیں ان راجاؤں کا حال سُناتا جو ایک دوسرے سے ہمیشہ دست و گریباں رہتے تھے اور کبھی کبھی شمالی ہند میں خاصی بڑی سلطنتیں قائم کر لیتے تھے مثلاً بنجال کی سلطنت وغیرہ یا قنوج کے عالیشان شہر کے انقلابات کا ذکر کرتا کہ کس طرح پہلے کشمیر کے راجاؤں نے اس پر حملہ کیا اور کچھ عرصہ کے لئے قبضہ کر لیا۔ پھر بنگال کے راجہ اور آخر میں جنوبی ہند کے راشٹر کوتوں نے اس پر اپنا پرچم لہرایا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ خواہ مخواہ تمہارے دماغ میں اور الجھن پیدا ہو جائے گی۔

اب ہم ہندوستان کی تاریخ کے طویل باب کے اختتام پر آپہنچے ہیں اور اب نیا باب شروع ہونے والا ہے تاریخ کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کرنا نہ صرف مشکل بلکہ غلط بھی ہے۔ یہ تو ایک بہتی ہوئی ندی ہے جس کی دھار کبھی رکتی نہیں پھر بھی یہ بدلتی رہتی ہے اور کبھی کبھی ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلی یکایک ظاہر نہیں ہوتی بلکہ رفتہ رفتہ واقع ہوتی ہے۔ غرض جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ تاریخ کے کبھی ختم نہ ہونے والے تماشے کا پہلا ایکٹ ختم ہو رہا ہے۔ یعنی ہندو دور پر رفتہ رفتہ پردہ گر رہا ہے اور ہندی آریہ تہذیب جو ہزاروں برس ہندوستان میں پھلی پھولی ایک نو وارد کے ساتھ کشمکش میں مبتلا ہونے والی ہے۔ لیکن ملحوظ رہے کہ یہ انقلاب یکایک نہیں بلکہ نہایت آہستہ آہستہ ہوا، شمال میں تو محمود کے ساتھ اسلام آ گیا۔ لیکن جنوب میں عرصہ تک اسلام نے کوئی فتوحات نہ کیں اور بنگال بھی کوئی دوسو برس تک اس کے اثر سے آزاد رہا۔ شمال میں چتور بھی موجود ہے جو آگے چل کر تاریخ میں اپنی جانبازی کے لئے بہت مشہور ہوا اور راجپوت قوم کا زبردست گڑھ بنا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اب اسلامی فتوحات کا طوفان امنڈا امنڈ کر آ رہا تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہ سکتی تھی۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ قدیم ہندی آریہ تہذیب اب زوال پذیر تھی۔

چونکہ وہ بدیشی فاتح کو روک نہیں سکتی تھی اس لئے اب اس نے مدافعانہ طرز اختیار کیا اور اپنی حفاظت کی کوشش میں اس نے اپنے پاس ایک دیوار سی کھینچ لی۔ اس نے ذات پات کے نظام کو جس میں

اب تک تھوڑی بہت لچک باقی تھی نہایت سخت اور محدود کر دیا اور اپنی عورتوں کی آزادی کو کم کر دیا۔ دیہی پنچایتوں میں بھی رفتہ رفتہ کچھ خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ تاہم اگرچہ ایک تازہ دم قوم کے سامنے اسے جھکنا پڑا لیکن اس نے ان نو واردوں پر اپنا اثر ڈالنے اور انھیں اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس میں جذب کرنے کی اب بھی اتنی قوت موجود تھی کہ تہذیب و تمدن کے معاملہ میں وہ ایک حد تک اپنے فاتحوں کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ مقابلہ ہندی آریہ تہذیب اور مہذب عربوں میں نہیں تھا۔ بلکہ مہذب مگر زوال پذیر ہندوستان اور وسطی ایشیا کی نیم مہذب اور خانہ بدوش قوموں میں تھا جو حال ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ بدقسمتی سے ہندوستان والوں نے تہذیب کے اس فقدان اور محمود کے حملوں کی تباہ کاریوں کو اسلام کا مظہر سمجھ لیا ہے۔ اسی وجہ سے آپس کی منافرت بڑھ گئی۔

(۵۲)

یورپ کے ملکوں کی تشکیل

۲ر جون ۳۲ء

پیاری بیٹی! اب کیا ہم یورپ چلیں؟ پہلے ہم اس کا ذکر کر رہے تھے تو اس کا بُرا حال تھا۔ روم کی تباہی کے معنی مغربی یورپ کی تہذیب کی تباہی کے تھے اور مشرقی یورپ میں بجز اس حصے کے جو قسطنطنیہ کے زیر نگین تھا حالت اور بھی ابتر تھی۔ اٹلاہن نے یورپ کے بیشتر حصہ کو پھونک دیا تھا اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ لیکن مشرقی رومی سلطنت اگرچہ نیم جان تھی۔ پھر بھی سانس باقی تھا اور کبھی کبھی یکایک سنبھالا بھی لے لیتی تھی۔

روم کی تباہی سے مغرب کو جو دھکا پہنچا اس کے بعد مختلف چیزوں نے نئی صورت اختیار کرنا شروع کی۔ پوری شکل تو بہت زمانہ میں جا کر بنی لیکن اس کے خط و خال سے نئے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ عیسائیت برابر پھیلتی رہی۔ کچھ اپنے درویشوں اور امن و سکون کے عالموں کی بدولت اور کبھی اپنے جنگجو بادشاہوں کی تلوار کی بدولت۔ اب نئی نئی سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ فرانس۔ بلجیم اور جرمنی کے کچھ حصہ میں فرینک قوم نے (جسے تم کہیں فرانسیسی نہ سمجھ لینا) کلووس کی سرکردگی میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ بادشاہ ۴۸۱ء سے ۵۱۱ء تک حکمرانی کرتا رہا۔ اس کا خاندان اس کے دادا کے نام پر میرو ونگین خاندان کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد خود انہی کے دربار کا ایک افسر یعنی ناظر محلات ان پر حاوی ہو گیا۔ چنانچہ یہ

عہدہ موروثی ہوگیا اور ناظر محلات مختار کل اب اصلی حکمراں یہی داروغہ تھے اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتے تھے۔

انہی میں کا ایک ناظر چارلس مارٹل تھا جس نے ۷۳۲ء میں عربوں کو فرانس کی جنگ ٹورس میں شکست دی تھی اس فتح کے ذریعہ اس نے عربوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک دیا۔ اور عیسائیوں کی نظر میں گویا یورپ کو بچا لیا اس سے اس کے دبدبہ اور شہرت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ لوگ اسے عیسوی دنیا کا بچانے والا سمجھتے تھے۔ اس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ سے پاپائے روم کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس لئے ان کی نظریں چارلس مارٹل کی طرف اُٹھنے لگیں۔ مارٹل کے بیٹے پیپن نے اپنے بادشاہ کو جو اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ گدی سے اتار دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ ظاہر ہے کہ پوپ نے بڑی خوشی سے اس کی تائید کی۔

پیپن کا بیٹا شارل میں تھا۔ پوپ کو پھر کسی مصیبت کا سامنا ہوا چنانچہ اس نے شارل مین کو مدد کے لئے بلایا۔ شارلی فوراً آیا اور اس کے دشمنوں کو بھگا دیا۔ ۸۰۰ء میں بڑے دن کے تہوار کے روز شارل مین کے سر پر رومی شہنشاہی کا تاج رکھا اور کلیسا میں خوب جشن منایا گیا۔ گویا اُسی دن سے مقدس رومی سلطنت کی بنیاد پڑی جس کا تذکرہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔

یہ نہایت عجیب سلطنت تھی اور اس کی آئندہ کی تاریخ اس سے بھی زیادہ عجیب گزری کیونکہ یہ رفتہ رفتہ اس طرح غائب ہوئی جیسے ایلیس کے قصہ میں چی شایر کی بلی جس کا صرف تبسم باقی رہ گیا اور خود غائب ہوگئی۔

یہ مقدس رومی سلطنت، سابقہ مغربی رومی سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ یہ تو بالکل دوسری چیز تھی۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا میں بس یہی ایک سلطنت ہے اور اس کا شہنشاہ (شاید پوپ کے علاوہ) ساری

دنیا کے ہر فرد و بشر کا آقا ہے۔ صدیوں تک یورپ اور شہنشاہ میں اس معاملہ میں بڑی کشمکش رہی کہ بڑا کون ہے۔ لیکن یہ تو بعد کا قصہ ہے۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ یہ سلطنت اس قدیم رومی سلطنت کا نقش ثانی سمجھی جاتی تھی جس کا کبھی اقصائے عالم میں سکہ چل رہا تھا اور جس کا دارالسلطنت روم ملکۂ عالم کہلاتا تھا اب اس میں ایک صفت کا اور اضافہ ہو گیا یعنی عیسائیت کی پشت پناہی کا۔ اس لئے یہ سلطنت مقدس قرار پائی اور بادشاہ زمین پر خدا کا نائب سمجھا جانے لگا۔ یہی حیثیت پوپ کی بھی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کے متعلق صرف سیاسی معاملات تھے اور دوسرے کے سپرد سیاسی مسائل۔ بہر حال اسی قسم کا کچھ عقیدہ تھا اور غالباً اس عقیدے کی بدولت یورپ میں بادشاہ کے ربانی حقوق کا خیال پیدا ہوا۔ شہنشاہ کو محافظ دین کہتے تھے۔ تم یہ چیز دلچسپی سے سنو گی کہ آج کل انگریزوں کے بادشاہ کو بھی محافظ دین کا خطاب ہے۔

اس رومی شہنشاہ کا ذرا خلیفۂ اسلام سے مقابلہ کرو جو امیرالمومنین کہلاتا تھا۔ ابتدا میں تو سچ مچ خلیفہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کا پیشوا ہوتا تھا۔ لیکن آگے چل کر وہ محض نمائشی خلیفہ رہ گیا۔

قسطنطنیہ کے بادشاہوں کو مغرب کی یہ نئی "مقدس رومی سلطنت" ایک آنکھ نہ بھائی۔ جب شارل مین کی تاج پوشی ہوئی اس زمانہ میں قسطنطنیہ میں ایک عورت آئرین ملکہ بن بیٹھی تھی۔ یہی وہ کمبخت تھی جس نے ملکہ بننے کے لئے اپنے بیٹے کو قتل کر ڈالا تھا۔ غرض اس کے زمانے میں حالت بہت ابتر تھی ایک وجہ یہ بھی تھی جس کی بنا پر پوپ کو قسطنطنیہ سے قطع تعلق کرنے اور شارل مین کو بادشاہ بنانے کی جرات ہوئی



یورپ نویں صدی میں
ڈین
شمالی سلاف قوم
عرب
مشرقی سلطنت
بغداد

بہرحال اب شارل مین عیسائیوں کے مغربی ممالک کا سردار، زمین پر خدا کا نائب۔ اور مقدس سلطنت کا شہنشاہ تھا۔ یہ الفاظ کتنے پرشکوہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا صرف یہی مقصد ہوتا ہے کہ لوگوں کو دھوکا دیں اور ان پر ایک طرح کا جادو کر دیں۔ حکومت نے اکثر خدا اور مذہب کی آڑ لے کر دوسروں کو بیوقوف بنانے اور اپنی قوت بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ عام لوگوں کے لئے راجہ بادشاہ اور بڑے بڑے مذہبی پیشوا بھی دیوتاؤں کی طرح مبہم اور خیالی ہستیاں ہوتے ہیں کیونکہ وہ ساری دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور اسی راز کی زندگی کی وجہ سے لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ ذرا درباروں کے آداب اور قواعد وضوابط کے اہتمام کا گرجا یا مندر کی پوجا کے آداب سے مقابلہ کرو کہ اس میں بھی وہی اہتمام ہوتا ہے۔ دونوں جگہ وہی سجدے ہیں وہی ڈنڈوت ہے۔ غرض بچپن ہی سے ہمیں مختلف شکلوں میں قوت و اقتدار کی پرستش کرنا سکھائی جاتی ہے یہ سب خوف کی اطاعت ہوتی ہے۔ محبت کی نہیں ہوتی۔

شارل مین بغداد کے ہارون الرشید کا ہم عصر تھا اس کی ہارون الرشید سے خط وکتابت بھی ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں یہ چیز قابل لحاظ ہے کہ اس نے یہ معاہدہ تجویز کیا تھا کہ ہم دونوں مل کر ایک طرف مشرقی رومی سلطنت سے اور دوسری طرف اسپین کے عربوں سے لڑیں۔ بظاہر اس تجویز کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر بھی اس سے بادشاہوں اور سیاسی آدمیوں کی ذہنیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ذرا خیال تو کرو کہ ایک "مقدس" شہنشاہ جو عیسائیوں کا سردار ہے ایک عیسائی اور ایک اسلامی سلطنت کے خلاف بغداد کے خلیفہ سے اشتراک عمل کرنا چاہتا

ہے تمہیں خیال ہو گا کہ اسپین کے عربوں نے بغداد کے عباسی خاندان کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خود مختار ہو گئے تھے اس لئے خلفائے بغداد ان سے ناراض تھے۔ لیکن وہ اتنی دور تھے کہ ان کی سرزنش نہیں کر سکتے تھے اسی طرح قسطنطنیہ والوں اور شارل مین کے درمیان باہم سخت منافرت تھی لیکن یہاں بھی فاصلہ جنگ میں حارج تھا۔ بہرحال یہ تجویز ضرور تھی کہ ایک عیسائی اور ایک عرب قوت مل کر ایک دوسری عرب اور عیسائی قوت سے جنگ کریں۔ بادشاہوں کے ذہن میں عموماً یہ چیز ہوتی تھی کہ کسی طرح قوت و اقتدار اور دولت حاصل کریں لیکن مذہب کو آلۂ کار بنایا جاتا تھا۔ ہر جگہ یہی صورت ہوئی ہے۔ ہندوستان میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ محمود نے مذہب کے نام پر حملہ کیا لیکن خود دولت سمیٹی۔ مذہب کا نعرے لگانے سے لوگ اکثر فائدے اٹھاتے ہیں۔

لیکن ہر زمانے میں لوگوں کے خیالات بدلتے رہتے ہیں اس لئے پرانے زمانے کے لوگوں کے متعلق ہمارے لئے کوئی صحیح رائے قائم کرنا سخت مشکل ہے۔ یہ بات ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ بہت سی باتیں جو آج ہمیں بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں انھیں بالکل عجیب لگتی ہوں گی اسی طرح ان کی عادتیں اور ان کے خیالات آج ہمیں عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال جس وقت لوگ اعلیٰ مقاصد اور مقدس سلطنت اور نائب خدا اور پوپ کے بارے میں جو جانشین مسیح سمجھا جاتا تھا بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے تھے اس وقت مغرب کی حالت اتنی ابتر تھی جس کی انتہا نہیں شارل مین کے بعد ہی اٹلی اور روم دونوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ نابکار قسم کے بے شمار مرد اور عورتیں جو جی چاہتا تھا کرتے

تھے اور پاپائے روم کی گدی پر جسے جی چاہتا تھا بٹھاتے تھے اور جسے جی چاہتا تھا اتار دیتے تھے۔

سچ پوچھو تو زوال روم کے بعد مغربی یورپ میں جو عام بدنظمی پیدا ہوگئی تھی اسی کی وجہ سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر سلطنت کا پھر احیا رہو جائے تو حالات سنبھل سکتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں کے نزدیک یہ عزت کا معاملہ تھا کہ ان کا بھی کوئی نہ کوئی شہنشاہ ضرور ہو۔ اس زمانہ کا ایک قدیم مُصنّف لکھتا ہے کہ شارل کو اس لئے شہنشاہ بنایا گیا۔ "کہ اگر عیسائیوں میں شہنشاہ کا نام باقی نہیں رہا تو کہیں کوئی کافر عیسائیوں کو ذلیل نہ کرے"۔

شارل کی سلطنت میں فرانس بلجیم۔ ہالینڈ۔ سوٹزرلینڈ۔ نصف جرمنی اور نصف اٹلی شامل تھا۔ اس کے جنوب و مغرب میں اسپین تھا جہاں عربوں کی حکومت تھی۔ شمال و مشرق میں سلاف اور دوسری قومیں تھیں۔ شمال میں ڈنمارک والے اور نارتھمین تھے۔ جنوب و مشرق میں بلغاریہ اور سرویہ والے تھے اور ان کے پرے مشرقی رومی سلطنت تھی جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔

شارل مین کا ۸۱۴ء میں انتقال ہوا۔ اس کے مرتے ہی سلطنت کی تقسیم پر جھگڑے ہونے لگے۔ اس کی اولاد کارلوونگین کہلاتی ہے۔ (لاطینی میں چارلس کو کارولس کہتے ہیں۔ اسی سے کارلوونگین نکلا) اُن کی عرفیتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ نکمے سے تھے۔ مثلاً اُن میں کا کوئی تو "موٹے" کے لقب سے مشہور تھا۔ کوئی "گنجے" کے لقب سے اور کوئی "متقی" کے لقب سے۔ شارل مین کی سلطنت کے ٹکڑے ہو جانے

کے بعد اسی میں سے جرمنی اور فرانس کا ڈھانچہ بنا۔ ایک قوم کی حیثیت سے جرمنی کی ابتدا ۸۴۳ء سے ہوتی ہے کہتے ہیں کہ شہنشاہ اوٹو اعظم نے جو ۹۶۲ء سے ۹۷۳ء تک حکمراں رہا جرمنی والوں کو ایک جداگانہ قوم بنا دیا۔ فرانس ابھی اوٹو کی سلطنت میں نہیں تھا ۹۸۷ء میں ہیوکاپے نے کارلوونگین خاندان کے کمزور بادشاہوں کو فرانس سے نکال کر خود اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ کوئی باضابطہ قبضہ نہیں تھا کیونکہ فرانس کے بڑے بڑے علاقے خود مختار امرا کے ماتحت تھے جو اکثر آپس میں لڑا کرتے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے زیادہ وہ شہنشاہ اور پاپائے روم سے خائف رہتے تھے اس لئے ان کے مقابلے میں ایک ہو جاتے تھے۔ ہیوکاپے کے زمانے سے فرانسیسی قوم کی ابتدا ہوتی ہے فرانس اور جرمنی کے درمیان شروع زمانے ہی سے رقابت کے آثار نظر آتے ہیں جو ایک ہزار برس سے اب تک برابر چلی آتی ہے تعجب کی بات ہے کہ فرانس اور جرمنی کے دو بڑے دیسی ملک جو نہایت مہذب اور لائق و فائق ہیں نسلاً بعد نسلٍ اس پرانے کینے کو دل میں پرورش کرتے چلے آئیں۔ لیکن شاید ان کا اس میں اتنا زیادہ قصور نہیں ہے جتنا ان دونوں کی حکومت اور معاشرت کے نظام کا ہے۔

قریب قریب اسی زمانے میں روس بھی تاریخ کے پردے پر نمودار ہوا۔ کہتے ہیں کہ شمال کے ایک شخص یورک نے ۸۵۰ء میں روسی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جنوب مشرقی یورپ میں بلغاریہ والے بھی ایک مقام پر آباد ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ان کا طرز عمل ایک حد تک جارحانہ ہے۔ یہی حالت سردیا والوں کی ہے۔ ان کے

علاوہ مقدس رومی سلطنت اور موجودہ روس کے درمیان ہنگیار قوم یعنی ہنگری والوں اور پول قوم نے بھی اپنی اپنی سلطنتیں قائم کرنا شروع کردی ہیں۔

اسی عرصہ میں شمالی یورپ کے لوگ جہازوں میں بیٹھ کر مغربی اور جنوبی ملکوں میں آئے اور وہاں ان لوگوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا تم نے ان ڈنمارک والوں اور دوسرے شمال والوں کا حال تو پڑھا ہوگا جو لوٹ مار کرنے انگلستان گئے تھے۔ لیکن یہ شمال والے (نارتھ مین یا نارس مین یا جو بعد میں نارمن کہلائے) پہلے بحر روم میں گئے اور وہاں سے اپنے جہازوں ہی میں دریاؤں کے ذریعے ملکوں کے اندر پہنچ گئے۔ اور جہاں کہیں گئے خوب لوٹ مار کی۔ اس وقت اٹلی میں سخت ابتری تھی اور روم کی حالت نہایت ابتر تھی اس لئے انھوں نے روم کو خوب لوٹا اور قسطنطنیہ تک کو دھمکایا۔ ان لٹیروں اور ڈاکوؤں نے مغربی فرانس پر جہاں اب نارمنڈی ہے اور جنوبی اٹلی اور سسلی پر قبضہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ وہ وہاں آباد ہوگئے اور آقا اور زمیندار بن بیٹھے جیساکہ عام طور پر جب ڈاکو دولت مند ہوجاتے ہیں تو زمیندار بن بیٹھتے ہیں۔ نارمنڈی کے انھی نارمنوں نے ۱۰۶۶ء میں ولیم کی سرکردگی میں جو فاتح کے لقب سے مشہور ہے انگلستان کو فتح کیا۔ گویا انگلستان بھی اب عالم وجود میں آرہا ہے۔

اب ہم یورپ میں عیسوی سنہ کے ایک ہزار برس کے قریب قریب خاتمہ پر پہنچ گئے ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب محمود غزنوی ہندستان پر حملے کررہا تھا۔ بغداد کے عباسی خلفاء کا اقتدار ختم ہورہا تھا اور

مغربی ایشیا میں سلجوقی ترک نئے سرے سے اسلام کا علم بلند کر رہے تھے اسپین اب بھی عربوں کے قبضے میں تھا لیکن ان کا اپنے وطن عرب سے اب کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور خلفائے بغداد سے ان کی ان بن تھی۔ شمالی افریقہ بغداد سے بالکل آزاد تھا اور مصر میں نہ صرف خود مختار حکومت بلکہ جداگانہ خلافت قائم تھی۔ چنانچہ کچھ عرصے تک مصری خلیفہ شمالی افریقہ پر بھی حکمرانی کرتے رہے۔

(۵۳)

جاگیرداری نظام

۱۴ر جون ۳۲ء

پچھلے خط میں ہم موجودہ زمانے کے فرانس۔ جرمنی روس اور انگلستان کی ابتدا۔ ہوتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اس زمانہ کے لوگ بھی ان ملکوں کے متعلق وہی خیال رکھتے تھے جو آج ہم رکھتے ہیں ہم انھیں مختلف قومیں سمجھتے ہیں۔ مثلاً انگریز قوم۔ فرانسیسی قوم جرمن قوم وغیرہ اور یہ قومیں اپنے ملک کو اپنا وطن سمجھتی ہیں۔ اور یہ وطنیت کا تخیل دنیا میں بہت نمایاں ہے۔ ہندوستان میں ہماری جنگ آزادی بھی ایک وطنی اور قومی جنگ ہے۔ لیکن اس زمانہ میں وطنیت کا یہ تخیل بالکل مفقود تھا۔ البتہ عالم عیسائیت کا تخیل ضرور موجود تھا یعنی ہر عیسائی اپنے آپ کو عیسائی جماعت کا رکن سمجھتا تھا جو کافروں یا مسلمانوں سے مختلف ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے ذہن میں عالم اسلام سے تعلق کا تخیل تھا جسے وہ مشرکین کی دنیا سے جدا سمجھتے تھے۔

لیکن عالم اسلام کا یہ تخیل بہت مبہم تھا اور اس کا عوام کی روزمرّہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صرف خاص خاص موقعوں پر ان سے کام لیا جاتا تھا تاکہ لوگوں میں مذہبی جوش پیدا ہو جائے اور وہ حسب ضرورت اسلام یا عیسائیت سے لڑ سکیں۔ ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ وطنیت کے بجائے بس ایک خاص قسم کے رشتے سے وابستہ تھا یعنی جاگیرداری نظام میں کچھ رئیس بن بیٹھتے تھے اور باقی ان کی رعایا زوال کے بعد مغرب کا قدیم نظام فنا ہو چکا تھا۔ ہر جگہ بدنظمی طوائف الملوکی اور جبر و تشدد کا دور دورہ تھا ایک طاقتور

آدمی کے جو کچھ ہاتھ لگتا اس پر قبضہ کر لیتا تھا اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا تھا جب تک کوئی اس سے زیادہ طاقت ور آکر اس سے چھین نہ لے۔ بڑے بڑے مضبوط قلعے تعمیر کئے جاتے تھے اور ان قلعوں کے نواب چھوٹے چھوٹے لشکر لے کر آس پاس کے دیہات پر دھاوے کیا کرتے تھے اور خوب لوٹ مار کرتے تھے اور کبھی کبھی اپنے جیسے دوسرے رئیسوں سے بھی لڑ مرتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ بیچارے کسان اور مزدور پستے تھے۔ اس بد نظمی سے جاگیرداری کا نظام پیدا ہوا۔

کسان تو منظم تھے نہیں اس لئے وہ اپنے آپ کو ان ڈاکو رئیسوں کے ہاتھ سے بچا نہیں سکتے تھے اور نہ کوئی مرکزی حکومت تھی جو ان کی حفاظت کرتی۔ اس لئے انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ ان لوگوں سے صلح کر لیں یعنی انھوں نے ان سے یہ معاہدہ کر لیا کہ ہم تمہیں پیداوار کا کچھ حصہ دیتے رہیں گے اور دوسرے طریقوں سے بھی تمہاری خدمت کیا کریں گے بشرطیکہ تم ہمیں لوٹنا اور پریشان کرنا بند کر دو اور دوسرے رئیسوں سے ہماری حفاظت کرو۔ اسی طرح چھوٹے رئیسوں نے بڑے رئیسوں سے صلح کر لی۔ لیکن یہ چھوٹے رئیس کسان تو تھے نہیں جو بڑے رئیسوں کو اپنے کھیت کی کچھ پیداوار دیتے اس لئے انھوں نے وعدہ کیا کہ جب ضرورت پڑے گی ہم تمہاری طرف سے لڑیں گے اور فوجی خدمت انجام دیں گے۔ اس کے عوض میں بڑے رئیسوں کا فرض تھا کہ وہ چھوٹے رئیسوں کی حفاظت کرے گویا یہ چھوٹے رئیس ان کے باج گزار تھے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ زیادہ بڑے رئیس اور امرا ہوتے تھے اور اس جاگیرداری نظام میں سب سے اوپر بادشاہ ہوتا تھا۔ لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں تھا۔ ان کے نزدیک آسمان پر بھی تثلیث کی صورت میں یہ نظام موجود تھا جس کا حاکم اعلیٰ

خدا تھا -

یورپ کی بدنظمیوں سے رفتہ رفتہ یہ نظام پیدا ہوا تمہیں خیال ہوگا کہ اس زمانہ میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی اور نہ کوئی پولیس وغیرہ تھی۔ ہر قطعۂ زمین کا مالک اس حصّہ کا اور اس کے باشندوں کا آقا اور حکمراں سب کچھ تھا۔ گویا وہ ایک چھوٹا سا بادشاہ ہوتا تھا جس کا یہ کام تھا کہ خدمت گذاری اور پیداوار کے کچھ حصّے کے عوض لوگوں کی حفاظت کرے۔ گویا وہ ان لوگوں کے ولی نعمت ہوتے تھے جو ان کی رعیت کہلاتے تھے اصولی طور پر وہ اپنے سے بالاتر رئیس کی جانب سے علاقہ کا مالک ہوتا تھا اس لئے وہ اس کا تابع ہوتا تھا اور اس کی فوجی خدمت انجام دیتا تھا -

کلیسا کے عمال بھی اس جاگیرداری نظام میں شریک تھے وہ بیک وقت پادری بھی ہوتے تھے اور نواب بھی جرمنی میں تو نصف زمین اور نصف دولت انہی پادریوں کے ہاتھ میں تھی اور خود پوپ بھی بہت بڑا رئیس تھا -

غرضکہ یہ سارا نظام مدارج اور طبقوں پر مشتمل تھا۔ مساوات کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ سب سے نیچے رعیت تھی جسے تمام سماجی نظام کا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ یعنی چھوٹے رئیسوں کو بڑے رئیسوں کا۔ ان سے بڑے رئیسوں کا اور بالآخر بادشاہوں کا۔ اسی طرح کلیسا کے تمام اخراجات یعنی لاٹ پادری سے لے کر چھوٹے پادریوں تک اخراجات بھی انہی پر پڑتے تھے۔ یہ رئیس چاہے چھوٹے ہوتے یا بڑے، نہ کھانے پینے کی کوئی چیز پیدا کرتے تھے نہ اور کسی قسم کی دولت۔ اسے وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کا خاص شغل لڑنا تھا اور جب اس سے فرصت ملتی تو شکار کھیلتے یا مصنوعی جنگ اور باہمی مقابلے کرتے۔ وہ نہایت اُجڈ اور جاہل قسم کے لوگ تھے جنہیں لڑنے اور کھانے پینے

کے سوا تفریح کے طریقے بھی معلوم نہیں تھے ۔ گویا کھانے پینے کی چیز اور دوسری ضروریات زندگی پیدا کرنے کا سارا بوجھ کسانوں اور دستکاریوں پر تھا۔ سلسلے نظام کے اوپر بادشاہ ہوتا تھا جو ایک طرح خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا۔

غرضکہ جاگیرداری نظام کی تہ میں یہی تخیل کارفرما تھا اصولی طور پر تو رئیسوں کا فرض تھا کہ اپنی رعایا کی حفاظت کریں لیکن عملاً ان کی مرضی قانون کا حکم رکھتی تھی ۔ ان کے حکام بالا یا بادشاہ کبھی ان کی روک ٹوک نہیں کرتے تھے اور کسان اتنے کمزور تھے کہ ان کے احکام سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے چونکہ وہ نسبتاً بہت زبردست تھے اس لئے اپنی رعیت کو جتنا نچوڑ سکتے تھے نچوڑ لیتے تھے اور صرف اتنا چھوڑ دیتے تھے کہ بڑی تنگی ترشی سے بسر کر سکیں ۔ ہر ملک میں ہمیشہ زمین کے مالکوں کا یہی طریقہ رہا ہے ۔ زمین کی ملکیت سے وہ شریف بھی بن جاتے ہیں ۔ جو کوئی جوالمرد ڈاکو جو زمین پر قبضہ کرلے اور ایک قلعہ تعمیر کرلے بس وہ شریف اور رئیس ہو جاتا ہے ۔ اور دنیا اس کی عزت کرنے لگتی ہے ۔ اس ملکیت سے قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس قوت کے ذریعہ سے وہ کسانوں پیدا کرنے والوں یا مزدوروں سے جتنا حاصل کر سکتا ہے اسے چھوڑتا نہیں ۔ قوانین بھی زمین کے مالک ہی کی مدد کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی خود ان کے یا اُن کے طرفداروں کے بنائے ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ زمین افراد کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ملکیت ہونا چاہئے ۔ ریاست یا قوم کی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ سبھی لوگ اس کے مالک ہیں ۔ اس لئے پھر نہ کوئی دوسروں کو لوٹ سکتا ہے نہ ان سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔

لیکن یہ خیالات تو بعد میں پیدا ہوئے جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے

ہیں اس وقت لوگوں کے یہ خیالات نہیں تھے۔ اس وقت تو عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور اس مصیبت سے نجات پانے کی انھیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے وہ اسے چار و ناچار جھیلتے تھے اور انتہائی محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ فرماںبرداری عادت ان کے دلوں پر نقش کردی گئی تھی اور جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو انسان سب کچھ گوارا کر سکتا ہے۔ گویا ہم نے دیکھا کہ ایسی سماج ترتیب پا گئی جس میں ایک طرف تو رئیس اور ان کے سرپرست تھے اور دوسری طرف بہت ہی غریب کسان اور مزدور تھے۔ رئیسوں کے پتھر کے قلعوں کے آس پاس رعیت کی مٹی یا لکڑی کی جھونپڑیاں ہوتی تھیں گویا ایک طرح سے دو دنیائیں ہوتی تھیں جن میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا یعنی رئیس کی دنیا اور رعیت کی دنیا اور یہ رئیس اپنی رعیت کو چوپاؤں سے کچھ ہی بہتر سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی چھوٹے پادری رعیت کو رئیسوں کی دست درازیوں سے بچاتے تھے۔ لیکن عام طور پر پادری بھی رئیسوں ہی کا ساتھ دیتے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بڑے بڑے پادری خود رئیس ہوتے تھے۔

ہندوستان میں اس طرح کا جاگیرداری نظام نہیں ہے لیکن اس سے ملتی جلتی ایک چیز موجود ہے ہماری دیسی ریاستوں میں ان کے رئیسوں سرداروں اور متعلقین میں اب بھی ریاست کی بہت سی روایات چلی آتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کا ذات پات کا رواج اگرچہ اس جاگیرداری نظام سے بالکل مختلف ہے لیکن اس نے سماج کو بہر حال متعدد طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ لیکن شاید میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چین میں نہ کبھی مطلق العنانی کو فروغ ہوا اور نہ کبھی کسی طبقہ کو کوئی فوقیت یا افضلیت

حاصل ہوئی۔ امتحان کے قدیم طریقے کی وجہ سے اونچے سے اونچے عہدے پر پہنچنے کا راستہ ہر شخص کے لئے کھلا ہوا تھا۔ البتہ ممکن ہے کہ عمل میں بہت سے موانع رہے ہوں۔

غرض اس جاگیرداری نظام میں مساوات یا آزادی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ مانا کہ حقوق اور فرائض کا تخیل تھا یعنی رئیس زمین کی کچھ پیداوار اور رعیت سے خدمت لینے کا حق رکھتا تھا اور اس کے عوض ان کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ حقوق ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور فرائض کو سب بھول جاتے ہیں اب بھی بعض یورپی ملکوں میں اور ہندوستان میں بڑے بڑے جاگیردار موجود ہیں وہ اپنے اسامیوں سے بڑی بڑی رقمیں لگان کے طور پر وصول کرتے ہیں لیکن خود ذرہ برابر کام نہیں کرتے اور فرض کا احساس مدت ہوئی کہ فراموش ہو چکا ہے۔

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یورپ کی ان پرانی وحشی قوموں نے جو آزادی کی اتنی عاشق تھیں کس طرح اس جاگیرداری نظام کے سامنے جس میں آزادی کا نام بھی نہیں تھا سر تسلیم خم کر دیا یہ قبیلے خود اپنے سردار منتخب کرتے تھے اور انھیں زیادتیاں کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ لیکن اب مطلق العنانی اور خود مختاری کا دور دورہ تھا اور انتخاب کا تو کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی۔ ممکن ہے کہ کلیسا نے جن اصولوں کی تبلیغ کی اُن سے یہ مخالف جمہوریت خیالات پھیل گئے ہوں۔ بادشاہ زمین پر خدا کا پرتو (ظل اللہ) تصور کیا جانے لگا۔ پھر بھلا کوئی خدا کے پرتو کی نافرمانی یا اس پر ردو قدح کیسے کرتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداری نظام میں آسمان زمین سب شامل تھے۔

ہندوستان میں بھی آزادی کا قدیم آریہ تخیل رفتہ رفتہ بدل گیا وہ کمزور ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گیا لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ دور وسطیٰ کے اوائل میں پھر بھی اس کے کچھ آثار باقی تھے جیسا کہ شکر آچاریہ کی نیتی سارا اور جنوبی ہند کے بعض کتبوں سے اندازہ ہوتا ہے۔

یورپ میں آزادی اب آہستہ آہستہ نئی شکلوں میں ظاہر ہو رہی تھی زمین کے مالکوں اور اس پر کام کرنے والوں یعنی رئیسوں اور اُن کی رعیت کے علاوہ صناعوں اور تاجروں کے دو طبقے اور بھی تھے ان لوگوں کو اس جاگیرداری نظام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بدنظمی کے زمانہ میں تو تجارت اور دستکاری کو کچھ فروغ نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے تجارت بڑھتی گئی۔ تاجروں اور کاریگروں کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا وہ دولتمند ہو گئے اور یہ رئیس اور جاگیردار ان کے پاس قرض لینے کے لئے پہنچنے لگے وہ انھیں قرض تو دیدیتے تھے لیکن اس پر اصرار کرتے تھے کہ ہمارے ساتھ کچھ خاص عایتیں کی جائیں ان رعایتوں سے ان کی قوت میں اور اضافہ ہوا۔ چنانچہ اب رئیسوں کے قلعوں کے چاروں طرف رعیت کی جھونپڑیوں کے بجائے چھوٹے چھوٹے قصبے نظر آنے لگے جن کے بیچوں بیچ ایک گرجا یا گلڈ ہال ہوتا تھا اور چاروں طرف مکانات۔ تاجروں یا صناعوں نے اپنی اپنی انجمنیں قائم کی تھیں اور ان انجمنوں کے صدر مقام گلڈ ہال کہلاتے تھے۔ بعد میں یہی گلڈ ہال ٹاؤن ہال کہلانے لگے غالباً تمہیں لندن کا گلڈ ہال تو یاد ہوگا۔ اسے تو تم نے دیکھا ہے۔

یہ نئے شہر مثلاً کولون۔ فرنیک فرٹ۔ ہیمبرگ وغیرہ رئیسوں کے گڑھیوں کے مدمقابل بن گئے۔ ان میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو رہا تھا یعنی تاجروں کا طبقہ جو اتنا دولت مند ہو گیا تھا کہ ان رئیسوں کی ذرا پروا نہیں کرتا تھا۔

خیر یہ تو باہمی کشمکش کی ایک طویل داستان ہے۔ اکثر بادشاہ بھی جو اپنے رئیسوں اور جاگیرداروں کی قوت سے خوفزدہ رہتا تھا شہر والوں کا ساتھ دیتا تھا۔ تو بہ ایں ہمہ بہت آگے نکل گیا۔

اس خط کے شروع میں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس زمانہ میں وطنیت کا کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ لوگوں کو اگر کوئی خیال تھا تو محض اپنے ذاتی فرض کا یا اپنے آقاؤں کی فرمانبرداری کا۔ انھوں نے تو ان کی خدمت کرنے کی قسم کھا رکھی تھی نہ کہ ملک کی خدمت کی۔ حتیٰ کہ بادشاہ بھی ان کے لئے ایک مبہم شخصیت تھی کیونکہ وہ ان سے دور رہتا تھا اگر کوئی رئیس بادشاہ کے خلاف بغاوت کرتا تھا تو یہ اس کا منصب تھا۔ رعیت کو تو صرف اپنے رئیس کی پیروی کرنی تھی۔ یہ چیز وطنیت کے اس تخیل سے بہت مختلف تھی جو ایک عرصے کے بعد دنیا میں پیدا ہوا۔

(۵۴)

چین خانہ بدوشوں کو مغرب کی طرف ہٹاتا ہے

۵ رجون ۳۲ء

کوئی ایک مہینے سے میں نے تمہیں چین اور مشرق بعید کے ملکوں کا حال نہیں لکھا ہے۔ اس عرصہ میں ہم نے یورپ، ہندوستان اور مغربی ایشیا کے انقلابات کا ذکر کیا۔ عربوں کو آناً فاناً پھیلتے اور فتوحات پر فتوحات کرتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ یورپ تاریکی کے غار میں گرا اور اس میں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس عرصہ میں چین کی رفتار بدستور اور عام طور پر قابل اطمینان رہی۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں تانگ بادشاہوں کے دور حکومت میں چین ساری دنیا سے زیادہ مہذب اور خوش حال ملک تھا اور وہاں انتظام حکومت بھی سب سے اچھا تھا۔ یورپ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ کیونکہ روم کے زوال کے بعد وہ بہت گر گیا تھا۔ شمالی ہند کی حالت بھی اکثر خراب رہتی تھی۔ مانا کہ کبھی کبھی اس کا ستارہ چمک اٹھتا تھا جیسے کہ ہرش کے دور حکومت میں، لیکن بحیثیت مجموعی وہ تنزل کر رہا تھا جنوبی ہند شمالی ہند کے مقابلے میں زیادہ سرگرم عمل تھا اور سمندر پار اس کی نوآبادیوں (انگ کور اور شری وجے) کا ایک عظیم الشان دور شروع ہونے والا تھا۔ البتہ اس زمانہ میں بعض چیزوں میں اگر کوئی چین کا مدمقابل تھا تو وہ صرف بغداد اور اسپین کی حکومتیں تھیں۔ لیکن ان کا عروج بھی نسبتاً بہت تھوڑے دن رہا۔ تاہم یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے

کہ ایک بادشاہ نے جسے تخت سے اتار دیا گیا تھا عربوں سے مدد مانگی تھی اور ان کی مدد سے اپنا کھویا ہوا تاج و تخت پھر حاصل کر لیا تھا۔

غرض چین اس زمانہ میں تہذیب کے معاملہ میں سب سے پیش پیش تھا اور اس زمانہ کے یوریبوں کو بجا طور پر نیم وحشی کہہ سکتا تھا، گویا معروف دنیا میں وہ سب سے برتر تھا۔ معروف دنیا میں نے اس لئے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ امریکہ کا اس زمانہ میں کیا حال تھا ہاں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میکسیکو پیرو اور ان کے آس پاس کے ملکوں میں سیکڑوں برس سے تہذیب و تمدن موجود تھا بعض باتوں میں تو وہ بہت آگے تھے اور بعض باتوں میں اتنے ہی پیچھے بھی تھے لیکن مجھے ان کا اتنا کم حال معلوم ہے کہ کچھ زیادہ لکھنے کی جرأت نہیں ہوتی، بہر حال اتنا تمہیں ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ میکسیکو میں۔ وسطی امریکہ میں اور انکاس کی پیرو سلطنت میں تہذیب و تمدن موجود تھا جو مایا تہذیب کے نام سے مشہور ہے۔ ممکن ہے کہ جو لوگ مجھ سے زیادہ قابل ہوں وہ تمہیں ان ملکوں کے متعلق کچھ زیادہ معقول باتیں بتا سکیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ مجھے ان سے بہت دلچسپی ہے لیکن جتنی دلچسپی ہے اتنا ہی میں ان سے ناواقف ہوں۔

ایک اور بات بھی تمہیں ذہن میں رکھنا چاہئے۔ پچھلے خطوں میں تم یہ پڑھ چکی ہو کہ وسطی ایشیا سے بہت سے خانہ بدوش قبیلے اٹھے اور انھوں نے مغرب کی طرف یورپ کا رُخ کیا، یا ہندوستان میں آ پہنچے۔ ہن سیتھین۔ ترک وغیرہ وغیرہ یکے بعد دیگرے ٹڈی دل کی طرح آتے رہے۔ تمہیں خیال ہوگا کہ سفید ہن تو ہندوستان آئے اور اٹلا دا کے ہن یورپ گئے۔ اس کے علاوہ سلجوقی ترک بھی جنھوں نے سلطنت بغداد پر

قبضہ کیا تھا وسطی ایشیا ہی سے آئے تھے ۔ اس کے بعد ترکوں کی ایک اور شاخ یعنی عثمانی ترک آنے والے تھے جو قسطنطنیہ کو فتح کرتے ہوئے وائنا کی فصیل تک پہنچ گئے تھے ۔ پھر اسی وسطی ایشیا یا منگولیا سے وہ خوفناک مغل بھی اٹھنے والے تھے ۔ جو یورپ کے وسط تک سب ملکوں کو فتح کر چکے تھے اور چین کو بھی اپنا محکوم کر لیا تھا ۔ انہی کی اولاد میں سے ایک شخص نے ہندوستان میں ایک نئے خاندان اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس میں چند مشہور حکمراں گذرے ہیں ۔

وسطی ایشیا کے ان خانہ بدوش قبیلوں سے چین ہمیشہ برسر پیکار رہتا تھا یا شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ خانہ بدوش چین کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیتے تھے چنانچہ وہ اپنی حفاظت پر مجبور رہتے انہی کی مدافعت کے لئے انھوں نے دیوار چین بنائی تھی اس میں شک نہیں کہ اس سے کچھ نہ کچھ سکون ہو گیا لیکن یہ حملوں کا پورا سد باب تھوڑی کر سکتی تھی ۔ ہر شہنشاہ کو وقتاً فوقتاً ان خانہ بدوشوں کو بھگانے کی ضرورت پیش آتی تھی ۔ اسی بھگانے اور پیچھا کرنے کے سلسلے میں چینی سلطنت مغرب میں دور تک یعنی بحر کیسپین تک پھیل گئی ۔ چینی لوگ سامراج کے بہت دلدادہ نہیں تھے یہ صحیح ہے کہ ان کے بعض بادشاہ سامراجی اور فتوحات کے حریص تھے لیکن دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں چینی ہمیشہ امن پسند رہے اور جنگ و فتوحات کے بہت شوقین نہیں تھے ۔ چین میں اہل جنگ کے مقابلہ میں اہل علم کو ہمیشہ زیادہ عزت اور وقعت حاصل رہی ہے ۔ اس کے باوجود کبھی کبھی چینی سلطنت بہت وسیع ہو گئی اس کا سبب زیادہ تر وہ اشتعال تھا جو شمال اور مغرب کی جانب خانہ بدوشوں کے متواتر حملوں اور چھیڑ

چھاڑ سے پیدا ہوتا تھا۔ جو بادشاہ زیادہ طاقتور ہوتے تھے وہ انھیں مغرب کی جانب دور بھگا دیتے تھے تاکہ ان سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے لیکن اس سے ہمیشہ کی مشکل حل نہیں ہوتی تھی البتہ چند روز کے لئے سکون ہوجاتا تھا

اگرچہ چین والوں کو تو کچھ سکون حاصل ہوجاتا تھا لیکن ان کی مصیبت دوسری قوموں اور ملکوں کو جھیلنی پڑتی تھی کیونکہ ادھر سے جب چینی ان خانہ بدوشوں کو بھگاتے تھے تو وہ دوسرے ملکوں پر چڑھ دوڑتے تھے یعنی ہندوستان کا رخ کرتے تھے۔ بار بار یورپ پہنچتے تھے۔ چنانچہ ہان شہنشاہوں کی بدولت دوسرے ملکوں میں ہن۔ تاتاری اور دوسرے خانہ بدوش قبیلے آئے اور تانگ خاندان نے یہ ترک یورپ کو تحفے کے طور پر دیئے

اب تک تو چینی ان خانہ بدوش قبیلوں سے اپنی حفاظت کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہوتے رہے۔ لیکن اب ان کی تاریخ کا ایسا دور شروع ہوتا ہے جب وہ اس میں ناکام رہے۔

جیسا کہ ہر شاہی خاندان میں ہوتا ہے رفتہ رفتہ تانگ خاندان میں بھی نااہل بادشاہ ہونے لگے جن میں اپنے بزرگوں کی کوئی خوبیاں باقی نہیں رہی تھیں بلکہ عیش پسند بن کر رہ گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام حکومت میں بے عنوانیاں اور بداطواریوں نے گھر کرلیا۔ اور محصول کا بار بڑھنے لگا جس کا اثر زیادہ تر غریب طبقہ پر پڑتا تھا۔ اس کی وجہ سے بے اطمینانی اور عام بے چینی میں اضافہ ہوا۔ حتیٰ کہ ۹۰۷ء میں اس خاندان کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

اس کے بعد بھی کوئی پچاس برس تک بہت سے ادنیٰ قسم کے بادشاہ ہوتے رہے جن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پھر ۹۶۰ء میں چین کے ایک دوسرے

زبردست خاندان کا دور دورہ شروع ہوا۔ یہ سنگ خاندان کے نام سے مشہور ہے اور اس کا بانی کاؤسو تھا۔ لیکن سرحد پر اور اندرون ملک دونوں جگہ مشکلات کا سامنا بدستور رہا کسانوں پر لگان کا بار بہت زیادہ تھا اور وہ اس سے سخت دل برداشتہ تھے۔ ہندوستان کی طرح وہاں کا نظام آراضی بھی لوگوں کے لئے ناقابل برداشت ہوگیا تھا اور جب تک یہ بالکل بدل نہ جائے امن یا ترقی کی کیا امید ہو سکتی تھی لیکن اس کا ایک سرے سے بدل دینا کبھی آسان نہیں ہوتا جو لوگ موجودہ نظام میں سب سے اوپر ہوتے ہیں وہ جہاں کوئی تبدیلی کی تجویز کی گئی فوراً چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ آج کل ہمیں اپنے ملک میں اور خاص کر اپنے صوبے میں اس کا خوب تجربہ ہو رہا ہے لیکن اگر وقت پر سمجھ بوجھ کر یہ تبدیلی نہ کی جائے تو وہ خود بخود ہو کر رہتی ہے اور پھر سارے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

تانگ خاندان اسی وجہ سے فنا ہوگیا کہ اس نے یہ تبدیلی نہیں کی سنگ خاندان کو بھی اسی کی بدولت پریشانیوں کا برابر سامنا رہا بالآخر ایک ایسا شخص پیدا ہوا جو بڑی حد تک کامیاب ہوگیا تھا اس کا نام وانگ آن شیہ تھا اور وہ گیارھویں صدی میں سنگ بادشاہ کا وزیراعظم تھا۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ چین کا نظام حکومت کنفیوشس کے اصولوں پر قائم تھا۔ تمام عہدہ داروں کو کنفیوشس کی تعلیمات میں امتحان دینا پڑتا تھا اور کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ اس کے بتائے ہوئے راستے کے خلاف قدم اُٹھا سکے۔ وانگ آن شیہ نے بھی اس کی ممانعت نہیں کی بلکہ نہایت عجیب طریقہ سے اس کی نئی تشریح کی جب کوئی نازک موقع آپڑتا تو عقلمند لوگ یہی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

کہ وانگ کے بعض اصول ہمارے زمانے کے اصولوں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ اس کے اصولوں کا لب لباب یہ تھا کہ غریبوں پر سے محصول کا بوجھ کم کیا جائے اور امیروں پر جو ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں یہ بار زیادہ ڈالا جائے۔ چنانچہ اس نے لگان میں کمی کر دی اور کسانوں کو اجازت دی کہ اگر وہ نقد کی شکل میں ادا نہ کر سکیں تو جنس کی صورت میں ادا کر دیں۔ امیروں پر اس نے انکم ٹیکس لگایا۔ یہ محصول بالکل جدید چیز سمجھا جاتا ہے لیکن چین میں یہ نو سو برس پہلے رائج تھا۔ کسانوں کی امداد کے لئے اس نے یہ تجویز بھی کی کہ حکومت انھیں تقاوی دیا کرے جو فصل کٹنے پر وصول کر لی جائے۔ ایک دوسرا حل طلب مسئلہ اناج کی قیمت کا اتار چڑھاؤ تھا۔ شاید تمہیں علم ہو کہ ہمارے ہندوستانی کسانوں کو پچھلے دو سو برس میں اناج اور دوسری پیداوار کی قیمتوں کے بے انتہا گر جانے سے کتنا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ جب بازار کا بھاؤ زیادہ گر جاتا ہے تو غریب کسانوں کو اپنی پیداوار کے عوض بہت تھوڑا روپیہ ہاتھ آتا ہے انھیں اس کا بیچنا مشکل ہو جاتا ہے اس لئے نہ وہ لگان ادا کر سکتے ہیں نہ ضرورت کی دوسری چیزیں خرید سکتے ہیں۔ وانگ آن شیہ ہندوستان کی موجودہ برطانوی حکومت سے کہیں زیادہ عقلمند تھا چنانچہ اس نے اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی کہ حکومت خود اناج خریدے اور بیچا کرے تاکہ بھاؤ میں اتار چڑھاؤ نہ ہونے پائے۔

وانگ نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ تعمیرات عامہ کے سلسلے میں ہرگز بیگار نہ لی جائے۔ جس سے کام لیا جائے اسے پوری اجرت دی جائے اس نے پاؤ چیا کے نام سے مقامی فوجی دستے بھی قائم کئے تھے۔ لیکن وانگ

کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اپنے زمانہ سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد اس کی تمام اصلاحات مٹی میں مل گئیں۔ البتہ اس کے بنائے ہوئے فوجی دستے کوئی آٹھ سو برس تک باقی رہے۔

چونکہ سنگ خاندان کے بادشاہ ان مشکلات کو جو درپیش تھیں حل کرنے کی جرأت نہ رکھتے اس لئے وہ رفتہ رفتہ ان کی نذر ہوگئے۔ شمال کی وحشی قوم ختن کا پلہ ان سے بھاری تھا چونکہ وہ خود ان کی سرکوبی کرنے سے معذور تھے اس لئے انھوں نے شمال ومغرب کی کین قوم یعنی زرین تاتاریوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ کین آئے اور ختن قوم کو مار بھگایا۔ لیکن خود وہاں جم گئے اور پھر ہٹنے کا نام نہ لیا اس لمز در شخص یا ملک کی جو طاقتور سے مدد لیتا ہے ہمیشہ یہی گت ہوتی ہے غرض کہ کین قوم نے شمالی چین پر قبضہ کرلیا اور پیکنگ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ سنگ خاندان جنوب کی طرف ہٹ گیا اور بڑھتی ہوئی قوم کے سامنے برابر دبتا چلا گیا۔ اب گویا شمالی چین میں کین سلطنت اور جنوبی چین میں سنگ سلطنت ہوگئی۔ اور اب انھیں جنوبی سنگ کہنے لگے شمال میں سنگ خانداں کی حکومت سنہ ۹۶۰ء سے ۱۱۲۷ء تک رہی اور جنوب میں انھوں نے صرف ڈیڑھ سو برس حکومت کی حتیٰ کہ سنہ ۱۲۶۰ء میں مغلوں نے ان کا خاتمہ کردیا۔ لیکن قدیم ہندوستان کی طرح چین نے بھی اس کی یوں تلافی کی کہ اُن مغلوں کو اپنے میں جذب کرلیا اور وہ پورے چینی ہوکر رہ گئے

غرض چین ان خانہ بدوش قوموں سے زیر ہوگیا لیکن اسی دوران میں اس نے انھیں مہذب بھی بنا دیا اس لئے اُسے اتنا نقصان نہیں

پہنچا جتنا ان قوموں کے ہاتھوں یورپ یا ایشیا کے بعض ملکوں کو پہنچا تھا۔
شمالی اور جنوبی چین کے دونوں سنگ خاندان سیاسی حیثیت سے اتنے طاقتور نہیں تھے جتنے ان کے پیش رو تانگ خاندان کے بادشاہ تھے۔ لیکن انھوں نے تانگ خاندان کی فنون لطیفہ کی روایات کو برابر قائم رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی۔ جنوبی سنگ خاندان کے زمانے میں جنوبی چین نے فنون لطیفہ۔ شاعری اور مصوری میں بہت ترقی کی۔ خاص کر قدرتی مناظر کی مصوری میں کیونکہ اس زمانے کے مصور قدرتی مناظر کے بڑے دلدادہ تھے۔ چینی کے برتنوں کا رواج اسی وقت سے شروع ہوا ہے۔ جنھیں مصوروں کی دستکاری نے اور زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ ان کا حسن و کمال برابر ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ دو سو برس بعد منگ بادشاہوں کے زمانے میں بہتر سے بہتر اور عجیب و غریب نمونے تیار ہونے لگے چین کے منگ دور کا برتن دیکھ کر اب بھی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

(۵۵)

جاپان کا شوگنی دورِ حکومت

۶ر جون ۱۹۳۲ء

چین سے بحرِ زرد کو عبور کر کے جاپان جانا بہت آسان ہے۔ چونکہ ہم اتنے قریب آگئے ہیں اس لئے کیوں نہ وہاں بھی ہوتے چلیں اس سے پہلے ہم نے جو وہاں کی سیر کی تھی وہ تم کو یاد ہوگی۔ اس وقت ہم نے دیکھا تھا کہ وہاں بڑے بڑے خاندان اقتدار حاصل کرنے کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے اور مرکزی حکومت رفتہ رفتہ وجود میں آ رہی تھی۔ بادشاہ محض کسی بڑے اور طاقتور خاندان کا سردار ہونے کے بجائے اب مرکزی حکومت کا صدر ہو گیا تھا اس مرکزی حکومت کے مظہر کے طور پر نارا کو پایۂ تخت بنایا گیا تھا چینی طرزِ حکومت کی نقل ہو رہی تھی اور فنونِ لطیفہ۔ مذہب اور سیاست کے معاملہ میں بہت کچھ براہ راست چین سے یا اس کے واسطے سے حاصل کیا جاتا رہا تھا حتیٰ کہ جاپان کا اصلی نام " دائی نیپن" بھی چین ہی سے لیا گیا تھا۔

ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ فوجی وارا نامی ایک زبردست خاندان نے ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھے۔ کوئی دو سو برس تک وہ حکومت کرتے رہے حتیٰ کہ بادشاہ ان سے عاجز آگئے اور انھوں نے یہ صورت اختیار کی کہ تخت سے دست بردار ہو کر خانقاہوں میں گوشہ نشین ہو جاتے تھے۔ لیکن بھکشو بن کر دنیا سے کنارہ کشی کرنے کے بجائے یہ بادشاہ حکومت کے معاملات میں بہت دخل دیتے

رہتے تھے۔ اور وہ اس طرح کہ برسرِ حکومت بادشاہ کو جو عموماً ان کا بیٹا ہوتا تھا وہیں سے بیٹھے بیٹھے مشورے دیا کرتے تھے یوں انھوں نے فوجی دارہ خاندان سے کسی حد تک نجات پائی۔ یہ نہایت پیچیدہ عمل تھا لیکن فوجی دارہ خاندان کے اختیارات کم کرنے میں انھیں بہر حال کامیابی ہوگئی۔ اب اصلی طاقت ان بادشاہوں کے ہاتھ میں آگئی جو یکے بعد دیگرے گدّی چھوڑ کر بھکشو بن جاتے تھے اسی لئے ان کو "گوشہ نشین بادشاہ" کہتے ہیں۔

اسی عرصہ میں دوسری تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں اور بڑے بڑے زمینداروں کا جو سپاہی بھی تھے ایک نیا طبقہ پیدا ہوگیا۔ فوجی دارہ خاندان نے یہ زمیندار بنائے تھے اور انھیں حکومت کی جانب سے محاصل جمع کرنے کی خدمت سپرد کی تھی انھیں "ڈالمیو" کہتے تھے یعنی بڑے نام والے۔ برطانیہ کی آمد سے پہلے ہمارے صوبے میں بھی اسی قسم کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو اُن سے بہت زیادہ مشابہ تھا خاص کر اودھ میں چونکہ بادشاہ نہایت کمزور اور ناکارہ تھے اس لئے انھوں نے لگان جمع کرنے کے لئے گماشتے مقرر کر دیئے تھے۔ یہ لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی فوجیں بھی رکھتے تھے تاکہ جبراً روپیہ وصول کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ اس میں سے زیادہ رقم یہ لوگ خود رکھ لیتے تھے ان میں کے بعض گماشتے بعد میں بڑے بڑے تعلقدار بن گئے۔

بہر حال یہ ڈالمیو اپنی فوج اور ملازموں کی وجہ سے بہت طاقتور ہوگئے۔ چنانچہ یہ آپس میں لڑا کرتے تھے اور کیوٹو کی مرکزی حکومت کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے۔ ان میں دو خاندان بہت مشہور گزرے ہیں یعنی تایرا اور مینا موٹو ۱۱۵۶ء میں ان دونوں نے مل کر فوجی دارہ خاندان

کا قلع قمع کرنے میں بادشاہ کی مدد کی تھی لیکن پھر یہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے اور سخت مقابلہ ہوا جس میں تائرا خاندان کو فتح ہوئی۔ شاید اس خیال سے کہ مخالف خاندان پھر کوئی شرارت نہ کرے انھوں نے اس کا قتل کر دیا اور میناموٹو خاندان کے تمام سربرآوردہ افراد کا خاتمہ کر دیا ان میں کے صرف چار بچے باقی رہ گئے تھے جن میں ایک بارہ سالہ لڑکا یوری ٹوموٹو تھا تائرا خاندان نے انتہائی کوشش کے باوجود اپنے دشمن کو بالکل نیست و نابود نہیں کیا تھا۔ یہ لڑکا یوری ٹوموجو بے ضرر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا بڑا ہو کر تائرا خاندان کا جانی دشمن بن گیا اور اپنے خاندان کا بدلہ لینے پر تل گیا۔ بالآخر وہ کامیاب ہوا۔ پہلے اس نے انھیں دارالسلطنت سے نکالا پھر ایک بحری جنگ میں ان کا بالکل قلع قمع کر دیا۔

اب یوری ٹوموکا طوطی بولنے لگا اور بادشاہ نے اسے "سے تائی شوگن" کا بلند آہنگ خطاب عطا کیا۔ اس کے معنی ہیں" وحشیوں کو مطیع کرنے والا زبردست سپہ سالار"۔ یہ ۱۱۹۲ء کا واقعہ ہے۔ یہ خطاب موروثی تھا اور اس کے ساتھ حکمرانی کے پورے اختیارات بھی تھے۔ گویا شوگن اصلی بادشاہ تھا۔ اس طرح جاپان میں شوگنی دور شروع ہوا۔ یہ بہت عرصہ تک یعنی کوئی سات سو برس تک جاری رہا اور ابھی حال میں جب کہ جدید جاپان جاگیرداری کی قید سے آزاد ہوا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یوری ٹوموکی اولاد ہی سات سو برس تک شوگن (وزیر اعظم) کی حیثیت سے حکومت کرتی رہی بلکہ شوگنوں کے بہت سے خاندان بدلتے رہے۔ بار بار خانہ جنگیاں ہوئیں۔ لیکن یہ صورت عرصہ تک جاری رہی۔ شوگن اصلی حکمراں ہوتا تھا اور بادشاہ کے نام سے جسے

خود کوئی اختیارات نہیں تھے حکومت کرتا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ شوگن مٹی کی مورت ہو کر رہ جاتا تھا اور سارے اختیارات چند عہدہ داروں کو ہوتے تھے۔

یوری ٹومو، پایۂ تخت کیوٹو کے تعیشات میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ آرام دہ زندگی سے وہ اور اس کے ساتھی ناکارہ ہو جائیں گے۔ اس لئے اس نے کاماکورا میں اپنا فوجی صدر مقام بنایا۔ چنانچہ یہ پہلی وزارت کاماکورا کی وزارت کے نام سے مشہور ہے یہ ۱۳۳۳ء تک یعنی کوئی ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی۔ اس عرصہ میں جاپان میں کافی امن رہا۔ عرصہ کی خانہ جنگیوں کے بعد یہ امن بھی غنیمت تھا۔ چنانچہ اب خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں جاپان کی حالت بہت بہتر تھی اور اس کا نظام حکومت اتنا باضابطہ تھا جتنا اس زمانہ کے یورپ میں کسی ملک کا نہ تھا۔ جاپان چین کا بڑا سعادت مند شاگرد تھا حالانکہ دونوں کے نظریے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ تو میں تمہیں بتلا چکا ہوں کہ چین پر امن اور سکون پسند ملک تھا۔ بخلاف اس کے جاپان جنگجو فوجی ملک تھا۔ چین میں سپاہی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور لڑائی کے پیشے کی کوئی عزت نہیں تھی۔ لیکن جاپان میں بڑے بڑے آدمی سپاہی تھے اور ڈائمیو یعنی نبرد آزما کا تخیل عام طور پر کارفرما تھا۔ شاید ہندوستان کی طرح چین بھی اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ جنگ کی پریشانی میں کہاں پڑتا۔ عموماً بڑھاپے میں آرام و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔

غرض جاپان نے چین سے بہت کچھ لیا۔ لیکن اپنے طریقہ پر لیا۔ اور اور اپنی قومی ضروریات کی مناسبت سے اسے اپنے سانچے میں ڈھال

لیا۔ بہر حال چین سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اور چینی جہازوں پر تجارت بھی جاری تھی۔ لیکن تیرہویں صدی کے آخر میں جب مغلوں نے چین اور کوریا پر قبضہ کیا تو یکایک یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ ان مغلوں نے جاپان کو بھی فتح کرنا چاہا۔ لیکن انھیں پسپا کردیا گیا۔ گویا ان مغلوں کا جنھوں نے ایشیا کا نقشہ بدل دیا اور یورپ کو ہلا ڈالا۔ جاپان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ اپنے پرانے راستے ہی پر چلتا رہا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ بیرونی اثرات سے بے تعلق ہوگیا۔

جاپان کے پرانے سرکاری کاغذوں سے اس واقعہ کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جاپان میں روئی کا پودا پہلے پہل کیسے پہنچا۔ ان میں لکھا ہے کہ ۷۹۹ء میں چند ہندوستانی جن کا جہاز جاپان کے ساحل پر ٹوٹ گیا تھا، کپاس کا بیج اپنے ساتھ لائے تھے۔

چائے کا پودا اس کے بعد آیا۔ پہلے پہل نویں صدی میں اس کی کاشت کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی پھر ۱۱۹۱ء میں ایک بودھ بھکشو چین سے اس کے بیج لے کر آیا اور چائے پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد بہت جلد چائے کا رواج عام ہوگیا اور چائے نوشی کے لئے اچھے اچھے برتنوں کی ضرورت پڑنے لگی۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے آخر میں ایک جاپانی کمھار چین گیا تاکہ چینی کے برتن بنانے کا فن سیکھ کر آئے۔ وہ چھ برس تک وہاں رہا۔ اور واپس آکر خوبصورت جاپانی برتن بنانے شروع کئے اب تو جاپان میں چائے نوشی ایک خاص مجلسی فن ہے اور اس کے بہت مفصل آداب مقرر ہیں۔ تمہیں اگر جاپان جانے کا اتفاق ہو تو صحیح طریقہ پر چائے پینا ورنہ تم بدتہذیب سمجھی جاؤ گی۔

(۵۶)

انسان کی جستجو

۱۰ رجون ۱۹۳۲ء

چار دن ہوئے کہ میں نے بریلی جیل سے تمہیں خط لکھا تھا۔ اسی دن شام کو مجھے حکم ملا کہ اپنا اسباب باندھ کر جیل خالی کرو۔ رہائی کے سلسلہ میں نہیں بلکہ دوسری جیل میں جانے کے لئے۔ چنانچہ میں نے اپنے بارک کے ان ساتھیوں کو خدا حافظ کہا جن کے ساتھ میں کوئی چار مہینے رہا تھا اور اس چوبیس فٹ اونچی دیوار پر ایک آخری نظر ڈالی جس کے سایۂ عاطفت میں میں نے اتنے دن گذارے تھے اور ایک بار پھر باہر کی دنیا دیکھنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب کا بھی تبادلہ ہوا تھا۔ اس اندیشے سے کہ لوگ ہمیں دیکھ نہ لیں جیل کے حکام ہمیں بریلی اسٹیشن نہیں لے گئے۔ کیونکہ تم جانو اب تو ہم پردہ نشین ہیں اور دوسروں کی ہم پر نظر نہ پڑنا چاہیے! غرض وہ لوگ ہمیں موٹر پر بٹھا کر پچاس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے سنسان اسٹیشن پر لے گئے میں اس تفریح کے لئے ان کا بہت ممنون ہوں۔ مہینوں کی تنہائی کے بعد رات کی خنک ہوا کا لطف اور درختوں۔ انسانوں اور حیوانوں کی پرچھائیوں کا دھندلکے میں جلدی جلدی گذرنا بڑا بھلا معلوم ہوا۔

ہم دہرہ دون جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی منزل تک پہنچیں۔ صبح تڑکے اتارے گئے اور موٹر سے دہرہ دون پہنچے تاکہ تجسس

نگاہیں ہمیں دیکھ نہ لیں۔

چنانچہ اس وقت میں دہرہ دون کے چھوٹے سے جیل میں بیٹھا ہوں۔ یہ بریلی سے کہیں اچھی ہے۔ یہاں زیادہ گرمی نہیں ہے۔ اور بریلی کی طرح یہاں کا درجۂ حرارت ۱۱۲ ڈگری تک نہیں پہنچتا اس کے علاوہ اس جیل کی دیواریں بھی ذرا نیچی ہیں اور باہر کے جو درخت نظر آتے ہیں وہ زیادہ سرسبز ہیں دور فاصلہ پر ہماری دیوار کے اوپر ایک کھجور کے درخت کی چوٹی نظر آتی ہے یہ منظر مجھے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور اسے دیکھ کر لنکا اور ملابار کی یاد آ جاتی ہے۔ درختوں کے پرے چند میل فاصلے پر پہاڑ ہیں اور ان کی چوٹی پر مسوری جلوہ افروز ہے۔ مجھے پہاڑ دکھائی نہیں دیتے۔ کیونکہ درختوں سے چھپ گئے ہیں لیکن یہ خیال ہی کیا کم ہے کہ میں ان سے بالکل قریب ہوں اور رات کو یہ تصور کیا کرتا ہوں کہ وہ سامنے مسوری کی روشنیاں تاروں کی طرح جگمگا رہی ہیں۔

کوئی تین چار سال ہوئے جب میں نے خطوں کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس وقت تم مسوری ہی میں تھیں۔ ان تین چار برس میں کیا کچھ ہو گیا ہے اور تم کتنی بڑی ہو گئی ہو! کبھی بڑے جوش و خروش سے میں نے یہ خط لکھنے شروع کئے اور کبھی بیچ بیچ میں کافی عرصے کے لئے چھوٹ گئے پھر بھی کسی نہ کسی طرح اب تک جاری ہیں اور زیادہ تر جیل ہی سے لکھے گئے ہیں۔ لیکن جتنا زیادہ میں لکھتا جاتا ہوں اتنے ہی یہ مجھے ناپسند ہوتے جاتے ہیں اور یہ اندیشہ بڑھتا جاتا ہے کہ شاید یہ تمہاری دلچسپی کا باعث نہ ہوں اور خوامخواہ کا بار ثابت ہوں پھر ان کے جاری رکھنے سے کیا فائدہ؟ میں چاہتا تو یہ تھا کہ ماضی کی تصویریں یکے بعد دیگرے تمہارے

سامنے پیش کر دوں۔ تاکہ تم یہ سمجھ سکو کہ ہماری دنیا رفتہ رفتہ کس طرح بدلتی اور ترقی کرتی رہی یا کبھی کبھی بظاہر پیچھے بھی ہٹی تاکہ تم قدیم تہذیب کا مشاہدہ کر سکو اور یہ دیکھ سکو کہ اس کی موجیں کس طرح طوفان کی طرح چڑھیں اور پھر اتر گئیں۔ تاکہ تم یہ محسوس کر سکو کہ تاریخ کی ندی مخالف ہوا بھنور اور رکھاڑیوں کے باوجود قرن ہا قرن سے مسلسل اور متواتر بہتی چلی جاتی ہے اور اب بھی نامعلوم سمندر کی طرف زور شور سے بڑھتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا یہ تھا کہ تم انسان کے نقش قدم کے پیچھے پیچھے چلو ابتدائے آفرینش سے لے کر جب کہ اسے انسان کہنا بھی زیب نہیں دیتا تھا موجودہ زمانے تک جب کہ وہ اپنی عظیم الشان تہذیب پر بیجا ناز کر کے اپنی حماقت کا ثبوت دے رہا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب تم مسوری میں تھیں تو ہم نے یہ سلسلہ اسی طرح شروع کیا تھا یعنی ہم نے یہ بتایا تھا کہ انسان نے کس طرح آگ اور فن زراعت دریافت کیا اور کس طرح بستیاں بسائیں اور تقسیم کار کی۔ لیکن جیسے جیسے ہم بڑھتے گئے سلطنتوں اور اسی قسم کی دوسری چیزوں میں الجھ گئے حتیٰ کہ اکثر نقش قدم کا وہ سلسلہ بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گویا ہم تاریخ کی سطح پر سے پھسلتے گذر گئے۔ میں نے قدیم واقعات کا ایک خاکہ تمہارے سامنے رکھا تھا اور چاہتا تھا کہ اس میں اب رنگ بھر دوں۔ تاکہ وہ تمہارے لئے ایک زندہ جاوید چیز ہو جائے۔

لیکن افسوس کہ میں ایسا کرنے سے قاصر رہا اور تمہیں اس کارنامہ کی تکمیل کے لئے اپنی ہی قوت متخیلہ سے کام لینا ہو گا۔ پھر جب تم بہت سی اچھی اچھی کتابوں میں خود پرانی تاریخ پڑھ سکتی ہو تو میرے لکھنے

سے کیا فائدہ ؟ تاہم اس پس و پیش کے باوجود میں نے یہ خط جاری رکھے اور شاید برابر جاری رکھوں۔ کیونکہ مجھے اپنا وہ وعدہ یاد ہے جو میں نے تم سے کیا تھا اور میں اسے پورا کرنے کی انتہائی کوشش کروں گا لیکن اس وعدہ سے زیادہ مجھے تمہارے اس تصور سے مسرت ہوتی ہے جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں اور یہ خیال کرتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھی ہو اور ہم دونوں باتیں کر رہے ہیں۔

انسان کے نقش قدم کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ وہ گرتا پڑتا جنگل سے برآمد ہوا تھا۔ یہ بہت لمبا سلسلہ ہے جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلا آتا ہے لیکن اگر کرۂ ارض کی تاریخ اور انسان کے وجود سے پہلے کی جگوں اور قرنوں سے مقابلہ کیا جائے تو بہت مختصر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام حیوانوں کے مقابلہ میں جو انسان سے پہلے گذرے ہیں ہمارے لئے فطرتاً انسان زیادہ دلچسپی کا باعث ہے کیونکہ وہ اپنے ساتھ ایک ایسی نعمت لایا جس سے دوسرے محروم تھے۔ یہ دماغ تھا۔ ذوق جستجو تھا۔ دریافت کرنے اور سیکھنے کا شوق تھا۔ گویا آغاز ہی سے انسان کی جستجو شروع ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی چھوٹے بچے کو دیکھو۔ وہ نئی نئی چیزوں کو اور اپنے چاروں طرف کی حیرت انگیز دنیا کو کس نظر سے دیکھتا ہے کیسے مختلف چیزوں اور مختلف انسانوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور کیسے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ یا مثلاً کسی چھوٹی سی لڑکی کو دیکھو اگر وہ تندرست اور ذرا ہوشیار ہے تو وہ سینکڑوں چیزوں کے متعلق ہزاروں سوال کر ڈالے گی۔ یہی صورت تاریخ عالم کے آغاز میں ہوئی جب انسان

نو وارد تھا اور دنیا اس کے لئے بالکل نئی اور حیرت انگیز بلکہ ڈراؤنی تھی۔ اس وقت اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا ہوگا اور گھور گھور کر دیکھا ہوگا۔ پھر طرح طرح کے سوال کئے ہوں گے لیکن بجز اپنی ذات کے وہ یہ سوال کرتا کس سے؟ ان کا جواب دینے والا کون تھا؟ البتہ اس کے پاس ایک نہایت ہی عجیب چیز تھی یعنی اس کا دماغ۔ اس کی مدد سے اس نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر رفتہ رفتہ تجربے کا خزانہ بھرنا اور اس سے استفادہ کرنا شروع کیا۔ گویا ابتدائی زمانے سے لیکر اب تک انسان کی جستجو جاری ہے۔ اس نے بہت سے حقایق معلوم کر لئے ہیں اور بہت سے ابھی باقی ہیں۔ جیسے جیسے وہ اپنے راستے پر قدم بڑھاتا جاتا ہے۔ اُسے نظر آتا ہے کہ سامنے ابھی بہت سے لق و دق میدان طے کرنے کو پڑے ہیں جو بزبان حال بتا رہے ہیں کہ اس کی جستجو کی منزل کتنی دور ہے۔ حالانکہ مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ ایسی کوئی منزل ہے بھی یا نہیں۔

انسان کی اس جستجو کا کیا مقصد ہے اور وہ کدھر جا رہا ہے؟ ہزاروں برس سے انسان ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مذہب، فلسفہ اور سائنس سب نے ان مسائل پر غور کیا اور طرح طرح کے جوابات دیئے۔ میں ان کی تفصیل بیان کر کے تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میں ان سے اچھی طرح واقف ہی نہیں ہوں۔ لیکن ان کا لب لباب یہ ہے کہ مذہب نے ایک مکمل اور اذعانی جواب دینے کی کوشش کی۔ اس نے دماغ کی ذرا پروا نہیں کی بلکہ مختلف طریقوں سے اپنے فیصلے کو بجبر منوانے کی کوشش کی۔ بخلاف اس کے سائنس نے مشکوک اور مبہم جواب دیا

کیونکہ اس کی فطرت میں داخل ہے کہ کوئی اذعانی دعوی نہیں کرنا چاہیے بلکہ تجربے اور بحث مباحثے کرتے رہنا چاہیے اور محض انسان کے دماغ پر اعتماد کرنا چاہیے. مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ذاتی طور پر میں سائنس اور سائنس کے طریقۂ کار کو ترجیح دیتا ہوں۔

ممکن ہے کہ ہم انسان کی اس جستجو کے متعلق مختلف سوالوں کا یقین کے ساتھ کوئی جواب نہ دے سکیں لیکن یہ ہمیں ضرور نظر آتا ہے کہ خود اس جستجو نے دو راستے اختیار کئے یعنی انسان نے اپنے باہر بھی نظر ڈالی اور اندر بھی نظر کی۔ جہاں اس نے فطرت کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی وہاں خود اپنی ذات کو بھی سمجھنا چاہا۔ لیکن یہ دونوں جستجوئیں بالکل ایک ہیں کیونکہ خود انسان بھی تو فطرت کا ایک جزو ہے۔ ہندوستان اور یونان کے قدیم فلسفیوں کا قول ہے کہ "اپنے کو پہچان" اور اپنشد میں بھی اسی کا تذکرہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم آریوں نے اپنی ذات کا علم حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہ کئے. دوسری چیز یعنی فطرت کا کھوج لگانا سائنس کا کام ہے چنانچہ ہماری جدید دنیا اس کا ثبوت ہے کہ اس ذیل میں کتنی عظیم الشان ترقی ہوئی ہے سائنس کی پرواز اب اور بڑھ رہی ہے اور وہ دونوں راستوں پر حاوی ہوکر انھیں ملا دینا چاہتی ہے۔ اب اس کی نظر نہایت اعتماد کے ساتھ دور پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی طرف بھی اٹھنے لگی ہے اور وہ ہمیں اس حیرت انگیز ننھی ننھی چیزوں کا حال بھی بتاتی ہے جو پیہم گردش میں رہتی ہیں یعنی منفی اور مثبت برق پاروں کا حال جن سے ہر مادہ مرکب ہے۔

غرض انسان کا دماغ تلاش و تجسس کے میدان میں اس کو بہت دور لے گیا ہے۔ جتنا اس نے فطرت کو زیادہ سمجھا اتنا ہی اُسے اپنی گرفت میں لے کر اپنے مقاصد کے لئے زیادہ استعمال کیا اور اتنا ہی وہ زیادہ طاقتور ہوتا گیا لیکن افسوس کہ اس نے یہ نہ جانا کہ اس نئی قوت کا کس طرح صحیح استعمال کرنا چاہئے اس لئے وہ اکثر غلط استعمال ہی کرتا رہا۔ چنانچہ سائنس سے خاص طور پر اس نے یہی کام لیا کہ ایسے خوفناک آلات حرب تیار کرے جن سے اپنے بھائیوں کو ہلاک کر سکے اور اس تہذیب کو فنا کر ڈالے جسے بڑی بڑی مصیبتوں سے اپنے ہاتھوں پروان چڑھایا ہے۔

(۵۷)

سن عیسوی کے پہلے ہزار سال کا اختتام

۱۱ رجون سنہ ۳۲ء

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے اس سفر میں جہاں تک پہنچ گئے وہیں ذرا دم لے لیں اور ایک نظر ادھر اُدھر ڈال لیں۔ آخر ہم کہاں تک پہنچ گئے ہیں؟ اب کس جگہ پر ہیں؟ اور اس وقت دنیا کس رنگ میں ہے؟ اچھا آؤ ذرا اڑن کھٹولہ پر بیٹھ کر اُس زمانہ کی دنیا کے مختلف ملکوں کی سیر کر آئیں۔

ہم عیسوی سنہ کے ایک ہزار برس طے کر چکے ہیں۔ بعض ملکوں میں تھوڑا سا آگے نکل گئے ہیں اور بعض میں کچھ پیچھے ہیں

ایشیا میں ہم نے دیکھا کہ چین میں سنگ خاندان برسرِ حکومت ہے۔ تانگ خاندان ختم ہو چکا ہے۔ اور سنگ خاندان دونوں طرح کی مصیبتوں سے دوچار ہے۔ یعنی ایک طرف تو اندرونی مشکلات ہیں اور دوسری طرف شمال کی وحشی قوم ختن حملے کر رہی ہے۔ کوئی ڈیڑھ سو برس تک تو وہ مقابلہ کرتے رہے لیکن پھر اتنے کمزور ہو گئے کہ انھیں ایک دوسری وحشی قوم کین سے مدد لینی پڑی۔ کین آئے تو سہی لیکن پھر انھوں نے ٹلنے کا نام نہیں لیا۔ اور بیچارے سنگ بادشاہوں کو جنوب کی طرف کھسکنا پڑا۔ یہاں وہ جنوبی سنگ کی حیثیت سے کوئی ڈیڑھ سو برس تک اور حکومت کرتے رہے اس عرصہ میں فنونِ لطیفہ۔ مصوری اور چینی کے برتن بنانے کی صنعت نے بہت ترقی کی۔

کوریا میں تقسیم و تصادم کے دور کے بعد سنہ ۹۳۵ء میں ایک مشترکہ سلطنت

قائم ہوئی۔ یہ مدت تک جاری رہی یعنی کوئی ساڑھے چار سو برس تک۔ کوریا نے تہذیب و تمدن فنون لطیفہ اور نظام حکومت کے معاملہ میں چین سے بہت کچھ سیکھا۔ مذہب اور بعض فنون لطیفہ کوریا اور جاپان دونوں نے چین کی معرفت ہندوستان سے حاصل کئے۔

جاپان جو مشرق میں ایشیا کا سنتری معلوم ہوتا ہے باقی دُنیا سے بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کر رہا ہے۔ پہلے فوجی دارہ خاندان کا طوطی بولتا رہا اور بادشاہ جس کی حیثیت اب قبیلے کے سردار سے کچھ بہتر ہو گئی تھی شاہ شطرنج بنا رہا۔ اس کے بعد شوگنوں کا دور شروع ہوا۔

ملا ایشیا میں ہندوستانی نوآبادیاں خوب پھل پھول رہی ہیں۔ کمبوڈیہ اور اس کی راجدھانی (عظیم الشان رنگ کور) طاقت اور ترقی کے معراج کمال پر ہیں۔ سماترا میں زبردست بودھ سلطنت کی راجدھانی شری وجے ہے۔ تمام مشرقی جزائر اس کے زیرنگیں ہیں اور ان کے درمیان وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی ہے۔ مشرقی جاوا میں ایک خود مختار ہندو ریاست ہے جس کے عروج کا زمانہ بہت قریب ہے۔ یہ تجارت اور دولت کے معاملہ میں جو تجارت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے شری وجے کی مد مقابل ہے اور جیسے آج کل کی یورپی اقوام تجارت کے لئے لڑا کرتی ہیں۔ اسی طرح ان دونوں میں بھی زبردست جنگ چھڑنے والی ہے۔ جس کا نتیجہ ہندو ریاست کو فتح اور شری وجے کی تباہی کی صورت میں برآمد ہونے والا ہے۔

ہندوستان میں شمال و جنوب ایک دوسرے سے ایسے جدا ہو گئے ہیں جیسے کچھ زمانے سے کبھی نہ ہوئے تھے۔ شمال پر محمود غزنوی بار بار چھپٹتا ہے۔ غارتگری کا بازار گرم کرتا ہے اور خوب لوٹتا ہے۔ وہ بے شمار دولت

ہندوستان سے لے جاتا ہے اور پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیتا ہے۔ جنوب میں چولا سلطنت رج راج اور اس کے بیٹے راجیندر کے زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے اور اسے کافی اقتدار حاصل ہو گیا ہے۔ سارے جنوبی ہند میں اس کا سکہ چل رہا ہے۔ اس کے بیڑے بحر عرب اور خلیج بنگال کو چھانے ڈال رہے ہیں اور لنکا۔ جنوبی برما اور بنگال کے خلاف زور شور سے بحری حملے ہو رہے ہیں۔

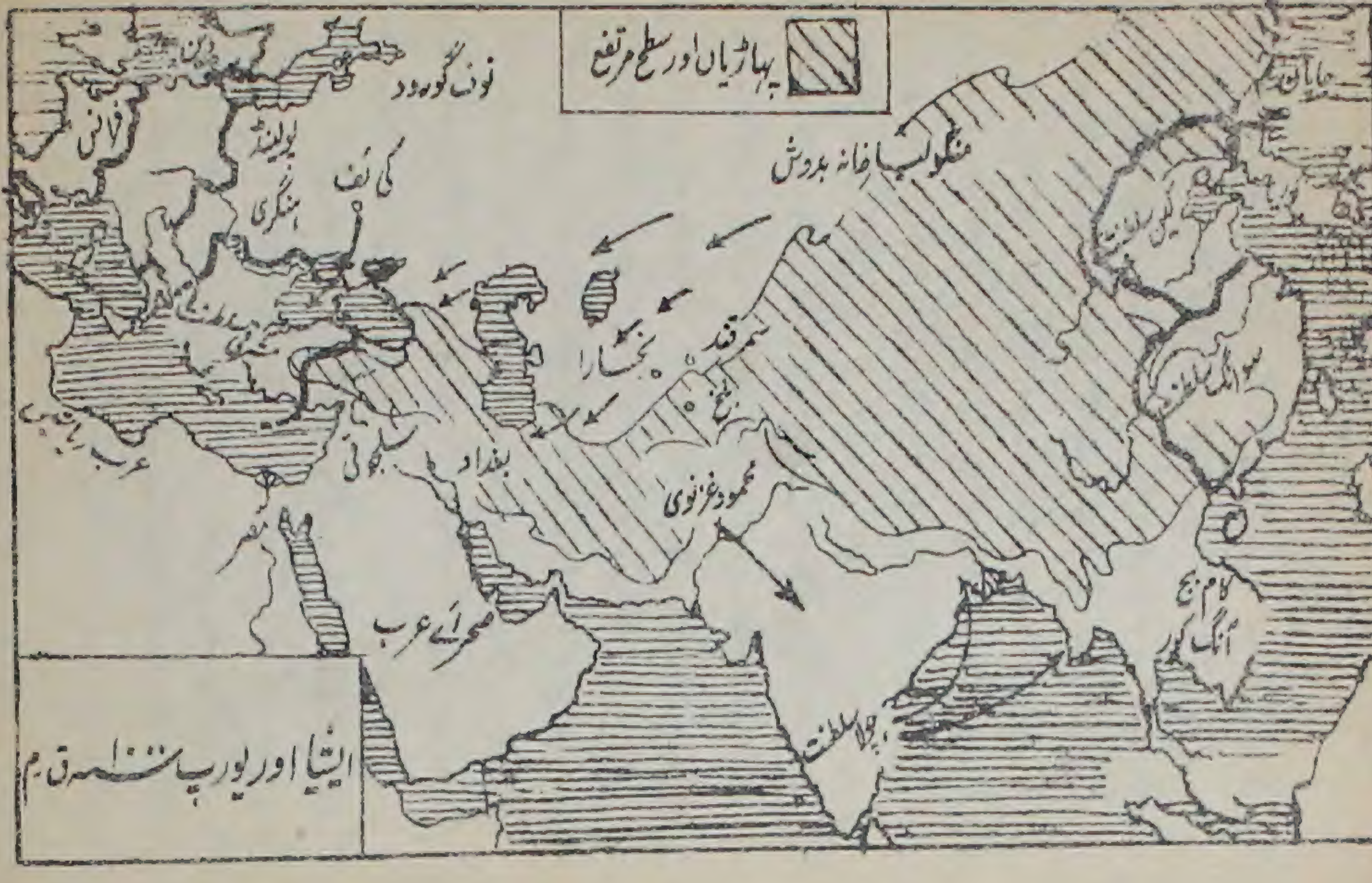
وسطی اور مغربی ایشیا میں بغداد کی عباسی سلطنت دم توڑ رہی ہے شہر بغداد اب بھی عروج پر ہے بلکہ اپنے نئے حکمرانوں یعنی سلجوقی ترکوں کے ماتحت اس کا اقتدار بڑھ رہا ہے۔ لیکن قدیم سلطنت چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئی ہے۔ اسلام کی حیثیت اب ایک متحدہ سلطنت کی نہیں رہی بلکہ وہ محض متفرق ملکوں اور قوموں کا ایک مذہب ہو کر رہ گیا۔ عباسی سلطنت کے کھنڈر پر غزنی کی بادشاہت تعمیر ہوئی ہے جہاں محمود برسر حکومت ہے اور ہندوستان پر بار بار حملے کرتا ہے۔ اگرچہ بغداد کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی لیکن شہر بغداد کی عظمت و شان بدستور ہے اور اب بھی اہل علم اور اہل فن دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ وسطی ایشیا میں بہت سے بڑے بڑے اور مشہور شہر بھی موجود ہیں۔ مثلاً بخارا۔ سمرقند۔ بلخ وغیرہ۔ ان کے درمیان بہت وسیع پیمانے پر تجارت جاری ہے اور بڑے بڑے قافلے ایک جگہ سے دوسری جگہ مال لے کر آتے جاتے ہیں۔

منگولیا اور اس کے قرب و جوار میں نئی نئی خانہ بدوش قومیں پیدا ہو رہی ہیں اور ان کی تعداد اور قوت برابر بڑھ رہی ہے۔ دو سو برس بعد تو وہ سارے ایشیا پر چھا گئیں لیکن اب بھی وسطی اور مغربی ایشیا میں جتنی سربرآوردہ قومیں موجود ہیں وہ سب خانہ بدوشوں کی اسی

جنم بھومی سے آئی تھیں۔ چینیوں نے انھیں مغرب کی جانب ڈھکیل دیا تھا۔ اور ان میں سے بعض ہندوستان میں اور بعض یورپ میں پھیل گئی تھیں۔ اس وقت سلجوقی ترک جو اسی طرح آئے ہیں سلطنت بغداد کی قسمت کو جگا رہے ہیں اور قسطنطنیہ کی مشرقی رومی سلطنت پر پے درپے حملے کر رہے ہیں۔

یہ تو ہوا ایشیا کا قصّہ۔ اب سنو۔ بحر قلزم کے دوسری طرف مصر ہے جو بغداد سے آزاد ہو گیا ہے۔ وہاں کے مسلمان بادشاہ نے خود خلافت کا دعویٰ کیا ہے۔ شمالی افریقہ میں خود مختار اسلامی سلطنت ہے۔ اور آبنائے جبرالٹر کے پار اسپین میں خود مختار اسلامی حکومت ہے جو امارت قرطبہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا حال میں تمہیں بعد میں سناؤنگا لیکن اتنا تو تمہیں معلوم ہے کہ جب عباسیوں کی خلافت شروع ہوئی تو اسپین نے ان کی اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔ اسی وقت سے وہ خود مختار رہے۔ فرانس کو فتح کرنے کی کوششوں پر تو چارلس مارٹل پہلے پانی پھیر چکا تھا۔ اب شمالی اسپین کی عیسائی حکومتوں کی باری تھی کہ وہ مسلمانوں سے بدلہ لیں۔ چنانچہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا وہ زیادہ دلیری کے ساتھ حملے کرنے لگے۔ لیکن جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں امارت قرطبہ نہایت زبردست اور ترقی یافتہ تھی۔ یعنی تہذیب اور سائنس کے معاملہ میں یورپ کے تمام ملکوں سے آگے تھی۔

اسپین کے علاوہ باقی تمام یورپ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ اس عرصہ میں عیسائیت تمام براعظم میں پھیل گئی تھی۔ اور دیوی دیوتاؤں اور سورماؤں والے قدیم مذہب یورپ سے تقریباً معدوم ہو چکے تھے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کے موجودہ ملک بھی اب عالم وجود میں آرہے ہیں۔ فرانس ۹۸۷ء میں ہیوکاپے کی سرکردگی میں رونما ہوا۔ انگلستان


پہاڑیاں اور سطح مرتفع
نوف گورود
فرانس
پولینڈ
کی اف
ہنگری
منگول خانہ بدوش
سمرقند
بخارا
بغداد
سلجوقی
محمود غزنوی
صحرائے عرب
مصر

یں ۱۰۱۶ء میں ڈنمارک کے کینوٹ کی حکومت تھی۔ اس کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جب وہ سمندر کی لہروں کو واپس جانے کا حکم دیتا تھا تو وہ اس کی تعمیل کرتی تھیں۔ اس کے پچاس سال بعد نارمنڈی سے ولیم فاتح آیا اگرچہ جرمنی مقدس رومی سلطنت کا ایک جزو تھا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا لیکن اس کی جداگانہ حیثیت قائم ہوتی جارہی تھی۔ روس یورپ کے مشرق میں پھیل رہا تھا اور اپنے جہازوں کے ذریعہ قسطنطنیہ پر برابر یورش کرتا رہتا تھا۔ یہاں سے وہ دلچسپی شروع ہوتی ہے۔ جو روس کو قسطنطنیہ سے ہمیشہ رہی ہے وہ ہزاروں برس سے اس اعظم الشان شہر کو للچائی نظروں سے دیکھتا رہا ہے۔ اور اسے امید تھی کہ جنگ عظیم کے نتیجہ میں جسے ختم ہوئے ابھی چودہ برس گذرے ہیں یہ شہر اس کے ہاتھ آجائے گا لیکن یکایک وہاں انقلاب ہوگیا اور سابقہ روس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں

یورپ کے نوسو برس پہلے کے نقشے میں پولینڈ اور ہنگری بھی موجود تھے جہاں مگیار رہتے تھے اور بلغاریہ اور سرویہ والوں کی بادشاہیں قائم تھیں۔ تم یہ بھی دیکھ رہی ہو کہ مشرقی رومی سلطنت دشمنوں کے نرغے میں ہے۔ پھر بھی سخت جانی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ روسیوں نے اس پر حملے کئے۔ بلغاریوں نے اسے ستایا۔ نارمنوں نے سمندر کے راستے سے برابر اس کا ناک میں دم رکھا۔ اور اب ان سب سے خطرناک سلجوقی ترک اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ لیکن ان تمام دشمنوں اور آفتوں کے باوجود وہ ابھی چار سو برس تک ختم ہونے والی نہیں تھی اس حیرت ناک سخت جانی کی ایک وجہ تو یہ تھی قسطنطنیہ کا محل وقوع نہایت مستحکم تھا۔ وہ کچھ ایسی جگہ پر واقع تھا کہ دشمن کے لئے اس کا فتح کرنا

سخت مشکل تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یونانیوں نے مدافعت کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔ اسے یونانی آگ کہتے تھے۔ یہ ایک قسم کا مسالہ ہوتا تھا جو پانی میں گرتے ہی جلنے لگتا تھا اس یونانی آگ کے ذریعے سے قسطنطیہ والے ان حملہ آور فوجوں کا جو باسفورس کو عبور کرنے کی کوشش کرتی تھیں ستیاناس کر دیتے تھے۔ اور ان کے جہازوں کو آگ لگا دیتے تھے۔

یہ تھا یورپ کا نقشہ ۱۰۰۰ء میں تم نے یہ بھی دیکھا کہ نارتھمین یا نارمن جہازوں میں بیٹھ بیٹھ کر آتے تھے اور بحر روم کے ساحل کے شہروں کو راستہ چلتے جہازوں کو ستاتے اور لوٹتے تھے۔ لیکن اپنی کامیابیوں کی بدولت وہ ڈاکوؤں سے بھلے آدمی بنتے جا رہے تھے۔ فرانس میں وہ مغرب کی جانب نارمنڈی میں آباد ہو گئے تھے۔ انگلستان کو انھوں نے اپنے اسی مرکز سے فتح کیا تھا اس کے علاوہ انھوں نے مسلمانوں سے صقلیہ فتح کرکے اور اسے جنوبی اٹلی کے ساتھ شامل کرکے سلطنت صقلیہ کے نام سے اپنی ایک بادشاہت بھی قائم کر لی تھی۔

یورپ کے وسط میں بحر شمالی سے روم تک مقدس رومی سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بہت سی ریاستوں پر مشتمل تھی اور سب کے اوپر شہنشاہ تھا۔ اس جرمن شہنشاہ اور پاپائے روم کے درمیان برتری کے لئے برابر رسہ کشی ہوتی رہتی تھی۔ کبھی شہنشاہ کا پلہ بھاری رہتا تھا اور کبھی پوپ کا لیکن رفتہ رفتہ پوپ کی طاقت بڑھ گئی ان کے ہاتھ میں برادری باہر کرنے اور سماج کا غدار قرار دینے کا بڑا خوفناک ہتھیار تھا۔ ایک مغرور شہنشاہ کو تو اس زمانہ کے پوپ نے اتنا ذلیل کیا تھا کہ اسے معافی مانگنے کے لئے پوپ کی خدمت میں برف پر ننگے پیر جانا پڑا تھا اور کنوسا میں اس کی فرودگاہ کے

باہر اس وقت تک کھڑا رہنا پڑا تھا جب تک اس نے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔

ہم نے یورپ کے مختلف ملکوں کو عالم وجود میں آتے دیکھا۔ لیکن غالباً وہ اپنی موجودہ حالت سے بالکل مختلف ہوں گے اور خاص کران کے باشندے تو بہت ہی مختلف ہوں گے۔ یعنی وہ اپنے آپکو فرانسیسی انگریز یا جرمن نہ کہتے ہوں گے۔ غریب کسانوں کی حالت بہت ردّی تھی۔ وہ نہ ملک کا مفہوم سمجھتے تھے اور نہ جغرافیہ سے واقف تھے وہ تو بس اتنا جانتے تھے کہ اپنے آقا کی رعیت ہیں اور آقا کا حکم بجالانا فرض ہے اسی طرح اگر رئیسوں سے پوچھا جاتا کہ آپ کون ہیں تو وہ بھی کہتے کہ ہم فلاں جگہ کے رئیس ہیں اور فلاں بڑے رئیس یا بادشاہ کے باج گزار ہیں۔ اسی کو ریاست یا جاگیرداری نظام کہتے ہیں جو اس وقت تمام یورپ میں رائج تھا۔

رفتہ رفتہ جرمنی اور شمالی اٹلی میں خاص کر بڑے بڑے شہر نمودار ہونا شروع ہوئے۔ پیرس اس وقت بھی بہت نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ یہ شہر تجارت اور کاروبار کے مرکز بن گئے اور وہاں ہن برسنے لگا۔ عموماً شہروں کی ان رئیسوں سے نہیں بنی اور ان دونوں میں ہمیشہ رسہ کشی ہوتی رہی حتیٰ کہ روپیے کی جیت ہوئی اس روپیے سے جو یہ تاجران رئیسوں کو قرض دیتے تھے انھوں نے چند رعاتیں اور اختیارات خرید لئے۔ اس طرح شہروں میں ایک نیا طبقہ پیدا ہوگیا جو جاگیرداری نظام سے کسی طرح میل نہیں کھاتا تھا۔

گویا ہم نے دیکھا کہ یورپ کی سماج جاگیری نظام کے نمونے پر طبقات پر مشتمل ہے اور کلیسا بھی اس نظام پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرتا تھا۔ وطنیت

کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے۔ اس کے بجائے سارے یورپ میں اور خاصکر اعلیٰ طبقہ میں ایک دوسرا خیال پایا جاتا تھا یعنی مسیحی دنیا کا تخیل جس میں یورپ کی ساری عیسائی قومیں شامل تھیں۔ کلیسا نے اس خیال کو اور تقویت پہنچائی کیونکہ اس سے خود اسے تقویت پہنچتی تھی اور پاپائے روم کی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔ جو مغربی یورپ میں اب کلیسا کا مسلمہ پیشوا تھا۔ تمہیں خیال ہوگا کہ روم نے قسطنطنیہ اور مشرقی رومی سلطنت سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا وہاں اب بھی پرانا کٹر مذہب رائج تھا اور روس بھی اسی کا پیرو تھا چنانچہ قسطنطنیہ کے یونانی پاپائے روم کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

لیکن جب قسطنطنیہ پر وقت پڑا اور دشمنوں نے زغہ کیا، بالخصوص جب سلجوقی ترکوں کا خطرہ لاحق ہوا تو اس کا سارا غرور اور روم سے نفرت کا جذبہ ختم ہو گیا چنانچہ اس نے مسلمان منکرین کے خلاف پوپ سے مدد کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں روم میں ایک زبردست پوپ ہلڈے برانڈ کا دور دورہ تھا جو پوپ گریگوری ہفتم کے نام سے مشہور ہے۔ یہی وہ پوپ تھا جس کی خدمت میں مغرور جرمن شہنشاہ کنوسا کے مقام پر برف میں ننگے پیر حاضر ہوا تھا۔

ایک واقعہ اور بھی ہوا جس سے یورپ کے تمام عیسائی مشتعل ہو گئے۔ اکثر پکے عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسٰی کے ٹھیک ایک ہزار برس بعد دنیا کا یکایک خاتمہ ہو جائے گا۔ اس خاتمہ کا یہ مفہوم لیا جانے لگا کہ اس سے بہتر عالم کا ظہور ہوگا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس وقت یورپ کی حالت بہت ردی تھی اور وہ سخت مصیبت میں مبتلا تھا چنانچہ اس خوش آئند امید پر بہت سے پریشان حال لوگوں کی ڈھارس بندھ گئی

انھوں نے اپنی جائدادیں بیچ ڈالیں اور فلسطین کو ہجرت کر گئے تاکہ جب دنیا کا خاتمہ ہو وہ بیت المقدس میں موجود ہوں۔

دنیا کا خاتمہ تو نہیں ہوا۔ مگر ان ہزاروں زائرین کے ساتھ جو بیت المقدس گئے تھے ترکوں نے بُرا سلوک کیا اور انھیں بہت ستایا وہ اپنی ذلت و خواری پر غصے میں بھرے ہوئے یورپ واپس آئے اور وہ بیت المقدس کی اپنی درد بھری داستان تمام مسیحی دنیا کو سناتے پھرے ان میں کا ایک مشہور شخص پیٹر راہب تو خاص طور پر عصا ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور یہ تلقین کرنا شروع کی کہ اپنے مقدس شہر کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچالو۔ چنانچہ تمام مسیحی دنیا میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس کا اندازہ کر کے پوپ نے یہ طے کیا کہ اسے خود اس تحریک کی رہبری کرنی چاہیے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب قسطنطنیہ نے منکروں کے خلاف مدد کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ ساری مسیحی دنیا (یعنی رومی اور یونانی دونوں) بڑھتے ہوئے ترکوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئی اور ۱۰۹۵ء میں عیسائیوں کی ایک بہت بڑی مجلس نے یہ اعلان کر دیا کہ بیت المقدس کی واپسی کے لئے مسلمانوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ صلیبی جنگوں کی یہ بنا تھی اور عیسائیت و اسلام یا صلیب و ہلال اس طرح ٹکرائے۔

ایشیاء اور یورپ پر ایک نظر

۱۲ر جون ۳۲ء

سرسری طور پر ہم دنیا کا یعنی ایشیاء۔ یورپ اور افریقہ کے ایک حصّے کا معائنہ کر چکے اور یہ دیکھ چکے کہ مسیح کے ایک ہزار برس بعد اُن کی کیا حالت تھی لیکن ذرا ایک نظر پھر ڈالو۔

پہلے ایشیاء کو لے لو۔ ہندوستان اور چین کی قدیم تہذیبیں اب بھی باقی ہیں اور رفروغ پر ہیں۔ ہندوستانی تہذیب ملا ایشیاء اور کمبودیہ تک پہنچی اور خوب پھلی پھولی۔ چینی تہذیب نے کوریا۔ جاپان اور کسی حد تک ملا ایشیاء پر اپنا رنگ جما لیا۔ مغربی ایشیاء میں عربی تہذیب۔ عرب فلسطین۔ شام اور عراق میں پھیلی ہوئی ہے اور ایران میں قدیم ایرانی اور جدید عربی تہذیبوں کا ایک مخلوط نمونہ پایا جاتا ہے۔ وسطی ایشیاء کے بعض ملکوں نے بھی اس مخلوط تہذیب کو اختیار کر لیا۔ اس کے علاوہ وہ تھوڑے بہت ہندوستان اور چین سے بھی متاثر ہوئے۔ غرض کہ ان تمام ملکوں میں تہذیب اعلیٰ درجہ پر ہے۔ تجارت اور علم وفن کو خوب فروغ ہے بڑے بڑے شہر موجود ہیں اور مشہور و معروف یونیورسٹیوں میں دور دور سے طالب علم آتے ہیں۔ صرف منگولیا میں۔ وسطی ایشیاء کے بعض حصّوں میں اور شمال میں سائبیریا میں تہذیب کا معیار گرا ہوا ہے

اب ذرا یورپ کو دیکھو۔ ایشیاء کے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ

میں یہ بہت پس ماندہ اور نیم وحشی ہے۔ قدیم یونانی رومی تہذیب کی اب صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔ علم کسی گنتی میں نہیں ہے۔ فن کا کہیں پتہ نہیں ہے اور تجارت ایشیا کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس تاریکی میں دو مقاموں پر روشنی نظر آتی ہے۔ ایک تو اسپین ہے جو عربوں کے زیر نگیں ہے اور ان کے عروج کے زمانے کی روایات کا علم بردار ہے۔ دوسرے قسطنطنیہ ہے جو ایشیا اور یورپ کے اتصال پر واقع ہے اور اگرچہ روبہ تنزل ہے پھر بھی بہت بڑا شہر ہے اور کافی آباد ہے۔ یورپ کے باقی ملکوں میں سخت بدنظمی ہے اور جاگیرداری نظام کے ماتحت ہر رئیس اور نائٹ بنی جاگیر میں ایک چھوٹا موٹا بادشاہ بنا ہوا ہے۔ روم پر جو کبھی پایہ تخت تھا ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک معمولی گاؤں سے زیادہ اس کی حیثیت نہ رہی اور جنگلی جانوروں نے اس کے پرانے عظیم الشان محلات کو اپنا مسکن بنا لیا لیکن اب وہ رفتہ رفتہ ترقی کر رہا تھا۔

اگر تم مسیح کے ایک ہزار برس بعد کے زمانے میں ایشیا اور یورپ دونوں کا مقابلہ کرو تو ایشیا ہی کا پلّہ بھاری رہے گا۔

اچھا اب ذرا ایک اور نظر ڈالو۔ لیکن اب کی بارتہ کی چیزیں دیکھنے کی کوشش کرو۔ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ایشیا کی اتنی اچھی حالت نہیں ہے جتنی بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان اور چین جو قدیم تہذیب کے دو گہوارے ہیں۔ مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ ان کی مشکل محض یہ نہیں ہے کہ باہر سے حملے ہو رہے ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم اور اندرونی ہے جو ان کی قوت وحیات کا خون چوس رہی ہے۔ مغرب میں عربوں کے عروج کا آفتاب ڈھل چکا ہے مانا کہ سلجوقیوں کا اقتدار بڑھ رہا

ہے لیکن یہ محض ان کے سپاہیانہ اوصاف کا نتیجہ ہے۔ وہ ہندوستانیوں چینیوں ایرانیوں، عربوں کی طرح ایشیار کی تہذیب کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ اس کی جنگی خصوصیات کے مظہر ہیں۔ گویا اب ایشیار میں ہر جگہ پرانی مہذب قومیں انحطاط پذیر نظر آرہی ہیں۔ انھیں اب اپنی ذات پر اعتماد باقی نہیں رہا ہے اس لئے انھیں مدافعت کی سوجھ رہی ہے۔ نئی نئی قومیں پیدا ہو رہی ہیں جو بہت قوی اور جوش عمل سے سرشار ہیں وہ ایشیار کی ان پرانی قوموں کو زیر کر رہی ہیں حتیٰ کہ یورپ کی طرف بھی ہاتھ بڑھا رہی ہے لیکن نہ تو ان کے ساتھ تہذیب کی کوئی نئی لہر اٹھتی ہے اور نہ پرانے تمدن کو کچھ تقویت پہنچتی ہے البتہ پرانی قومیں رفتہ رفتہ انھیں مہذب بنا کر اپنے میں جذب کر لیتی ہیں

گویا ایشیا میں ہمیں ایک عجیب انقلاب نظر آرہا ہے اگرچہ قدیم تہذیبیں باقی ہیں۔ فنون لطیفہ کو فروغ ہے۔ اور عیش و عشرت کے سامان میں نئے نئے تکلفات نظر آتے ہیں لیکن تہذیب کی نبض کمزور چل رہی ہے اور اس کی سانس آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی ہے۔ اسی طرح وہ عرصہ تک باقی رہی اور مغلوں کی آمد پر عرب اور وسطی ایشیار کے سوا نہ کہیں اس کا سلسلہ منقطع ہوا اور نہ بالکل خاتمہ ہوا۔ چین اور ہندوستان میں اس کا نقش دھندلا ہوتا گیا حتیٰ کہ وہ محض نقش دیوار بن کر رہ گئی جو دور سے اچھی تو معلوم ہوتی ہے لیکن بے جان ہوتی ہے اور قریب جانے پر پتہ چلتا ہے کہ دیمک اسے چاٹ گئی ہے۔

تہذیبیں بھی سلطنتوں کی طرح بیرونی دشمن کے حملے سے اتنی تباہ نہیں ہوتیں جتنی اندرونی کمزوری اور بوسیدگی سے۔ روم کو "وحشی"

قوموں نے تباہ نہیں کیا۔ انھوں نے تو صرف جو چیز کھوکھلی ہو چکی تھی اُسے گرا دیا۔ سچ پوچھو تو جب روم کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے اس کے قلب کا دھڑکنا تو اسی وقت بند ہو گیا یہی صورت ہندوستان اور چین میں اور عربوں کے معاملہ میں ہوئی۔ عربی تہذیب اتنی ہی جلدی تباہ بھی ہوئی جتنی جلد اس نے ترقی کی تھی۔ لیکن ہندوستان اور چین میں اس انقلاب نے بہت وقت لیا اس کے زمانہ کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔

محمود غزنوی کے حملے سے بہت پہلے یہ زوال شروع ہو چکا تھا لوگوں کی ذہنیت میں یہ تبدیلی صاف نظر آ رہی ہے۔ نئے خیالات اور اور نئی چیزیں تخلیق کرنے کے بجائے اب وہ پچھلی چیزوں کی نقل اتارنے میں مصروف ہیں ان کا ذہن اب بھی کافی رسا ہے لیکن جو کچھ ہزاروں برس پہلے کہا یا لکھا جا چکا ہے اب وہ اس کی تشریح یا تاویل کرنے میں لگے ہیں۔ اب بھی وہ سنگ تراشی اور نقاشی کے حیرت انگیز نمونے پیش کرتے ہیں لیکن اب ان میں سجاوٹ اور باریکیاں زیادہ پیدا ہو گئی ہیں جو کبھی کبھی مضحک ہو جاتے ہیں۔ جدت کا اب پتہ نہیں اور تخیل میں وہ وقار اور شان بھی باقی نہیں۔ امیروں اور رئیسوں میں تکلفات۔ فنون لطیفہ اور تعیشات کی کمی نہیں ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ساری قوم کی تکلیف اور مصیبت دور کرنے یا پیداوار کے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی

یہ سب چیزیں پتہ دیتی ہیں کہ تہذیب کی شام قریب ہے۔ جب کبھی ایسی صورت تمہیں نظر آئے تو سمجھ لینا کہ تہذیب بس چند روز کی مہمان ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی نقل اتارنا یا اس کی تکرار کرتے رہنا حیات کی نشانی

نہیں ہے بلکہ اس کی نشانی تو تخلیق اور تنوع ہے۔

غرض اس وقت ہندوستان اور چین میں اسی قسم کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لیکن کہیں تمہیں میرے مفہوم کے متعلق کچھ غلط فہمی نہ ہو جائے اس لئے میں اسے واضح کردوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر ہندوستان اور چین کی تہذیبیں فنا ہو گئی تھیں یا یہ لوگ بالکل جاہل اور وحشی ہو گئے تھے۔ کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان اور چین میں تخلیق کا جو مادّہ موجود تھا اس کی قوت ختم ہوتی جا رہی تھی اور تجدید و تقویت کی کوئی نئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی وہ تبدیل شدہ حالات کے سانچے میں نہیں ڈھل رہا تھا بلکہ محض لکیر کا فقیر بنا ہوا تھا ہر ملک اور ہر تہذیب کو یہ صورت پیش آتی ہے کبھی تو تخلیقی کارناموں اور ترقیوں کا دور آتا ہے اور کبھی افسردگی اور اضمحلال کا۔ مجھے تو اس پر تعجب ہے کہ چین اور ہندوستان پر یہ اضمحلال بہت دیر بعد طاری ہوا اور ان پر پوری طرح اپنا اثر بھی نہ جما سکا۔

اسلام ہندوستان میں انسانی ترقی کا ایک نیا پیغام لایا کسی حد تک اس نے اکسیر کا کام دیا۔ اس نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہندوستان کو بیدار کر دیا لیکن اس سے جتنا فائدہ پہنچنا چاہئے تھا اتنا نہیں پہنچا۔ اس کی دو وجہ تھیں یعنی ایک تو یہ دیر سے آیا اور جب آیا تو غلط طریقے سے آیا۔ محمود غزنوی کے حملے سے چار سو برس پہلے مسلمان مبلغ سارے ہندوستان میں پھرتے تھے اور ہر جگہ ان کا خیر مقدم ہوتا تھا۔ وہ صلح و آشتی کا جھنڈا لے کر آئے تھے۔ اس لئے انھیں کامیابی ہوئی۔ اس وقت اگر اسلام کے خلاف کوئی بدظنی تھی بھی تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے

بعد محمود آگ اور تلوار لے کر آیا اس کے آنے سے اسلام کی مقبولیت کو جتنا صدمہ پہنچا۔ اتنا شاید کسی چیز سے نہ پہنچا ہوگا۔ یوں تو وہ بھی عام فاتحین کی طرح تھا جسے قتل وغارتگری سے کام تھا مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ لیکن ایک مدت تک ہندوستان میں اس کے حملوں کی وجہ سے اسلام کی حقیقت پر پردہ پڑا رہا۔ اور ہندوستان والے اسلام پر اس طرح خالی الذہن ہو کر غور نہ کر سکے جیسے ان حملوں کی عدم موجودگی میں کرتے تھے۔

یہ تو ایک وجہ تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بہت دیر سے یعنی اپنے ظہور کے کوئی چار سو برس بعد آیا اس طویل عرصہ میں وہ کسی حد تک مضمحل ہو چکا تھا اور اس کی تخلیقی قوت بڑی حد تک کم ہو چکی تھی اگر ابتدائی زمانہ میں عرب والے اسلام لے کر ہندوستان آئے ہوتے تو نئی عربی تہذیب پرانی ہندوستانی تہذیب سے مل جل جاتی اور ان کا ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل ہوتا جس کے بہت اچھے نتائج نکلتے۔ گویا دو مہذب قومیں آپس میں ملتیں۔ عرب اپنی رواداری اور معقول پسندی کے لئے بہت مشہور تھے۔ ایک زمانہ میں تو بغداد میں خلیفہ کی سرپرستی میں ایک ایسی انجمن قائم تھی جس میں تمام مذہبوں کے ماننے والے اور لامذہب سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور تمام معاملات پر محض معقول پسندی کے نقطۂ نظر سے تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔

لیکن عرب تو خاص ہندوستان میں آئے ہی نہیں۔ وہ سندھ ہی میں رہ گئے اور ہندوستان پر ان کا کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ ہندوستان میں تو اسلام ترکوں وغیرہ کے واسطہ سے آیا اور ان میں نہ عربوں کی سی

رواداری تھی اور نہ وہ اعلیٰ تہذیب و تمدن۔ وہ تو محض سپاہی تھے۔

اس کے باوجود اسلام کی وجہ سے ہندوستان میں ترقی اور تخلیقی قوت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اس کا ہم آگے چل کر تذکرہ کریں گے کہ اس نے کس طرح یہ نئی زندگی پیدا کر دی اور پھر کس طرح اس کی تکمیل کی۔

ہندوستانی تہذیب کی کمزوری کا ایک اور ثبوت بھی اب نظر آ رہا ہے۔ چونکہ باہر سے اس پر حملہ ہو رہا تھا اس لئے اس نے بڑھتے ہوئے طوفان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے آس پاس چہار دیواری اٹھا لی اور اس میں قید ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ حرکت خود کمزوری اور خوف کی نشانی تھی۔ چنانچہ اس علاج سے مرض اور بڑھ گیا۔ اصلی مرض بیرونی حملہ نہیں بلکہ اندرونی انحطاط تھا اس گوشہ نشینی سے انحطاط میں اور اضافہ ہو گیا اور ترقی کے سارے راستے بند ہو گئے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ چین اور جاپان نے بھی اپنے طور پر یہی صورت اختیار کی تھی ایسی سماج میں رہنا جو چاروں طرف سے گھونگھے کی طرح بند ہو خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ہم وہاں بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں اور تازہ ہوا اور نئے خیالات کے عادی نہیں رہتے ہیں۔ سماج کے لئے بھی تازہ ہوا اتنی ہی ضروری ہے جتنی افراد کے لئے۔

یہ تو ہوا ایشیا کا حال۔ یورپ کو ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ بہت پس ماندہ تھا اور آپس میں ہمیشہ دست و گریباں رہتا تھا۔ لیکن اگر اس جہالت اور بدنظمی کے ذرا پیچھے دیکھو تو تمہیں کم از کم جوش عمل اور حیات ضرور نظر آئے گی۔ ایشیا ایک عرصہ تک سربلند رہنے کے بعد اب جھک رہا تھا اور یورپ سر اٹھا رہا تھا لیکن ابھی ایشیا کے لگ بھگ پہنچنے کے

لئے اسے کافی منزلیں طے کرنی تھیں اور بہت زمانہ درکار تھا۔
آج یورپ حاوی ہے اور ایشیا اپنی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے لیکن ذرا پردہ ہٹا کر تو دیکھو۔ تمہیں ایشیا میں ایک نیا جوش عمل نئی قوت تخلیق اور ایک نئی زندگی نظر آئے گی۔ ایشیا پھر بیدار ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور یورپ میں بلکہ یوں کہو۔ کہ مغربی یورپ میں اس عظمت کے باوجود تنزل کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت وہ "وحشی" قومیں موجود نہیں ہیں جو اس یورپی تہذیب کو تباہ کر ڈالیں لیکن بعض اوقات مہذب لوگ خود وحشیانہ حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت تہذیب اپنے ہاتھوں خود برباد ہو جاتی ہے۔
میں نے ایشیا اور یورپ کا ذکر کیا لیکن یہ تو محض جغرافیہ کی اصطلاحیں ہیں۔ اور وہ مسائل جو ہمارے سامنے در پیش ہیں محض ایشیائی یا یورپی مسائل نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق ساری دنیا اور کل نوع انسانی سے ہے۔ تاوقتیکہ ہم ساری دنیا کے لئے ان کا حل پیش نہ کریں ہماری مشکلات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہر جگہ افلاس اور زبوں حالی کا قطعی تدارک ہو جائے۔ ممکن ہے کہ اس کام کی تکمیل میں کافی عرصہ لگے۔ لیکن ہمارے پیش نظر یہی چیز ہونا چاہئے۔ اس سے کم کا خیال کرنا بالکل بیکار ہو۔ حقیقی تہذیب و تمدن جس کی بنیاد مساوات پر قائم ہو۔ اور جس میں کسی ملک یا طبقہ کو لوٹنے کا تخیل موجود نہ ہو اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سماج میں تخلیقی قوتیں بھی ہوں گی اور وہ ترقی پذیر بھی ہوگی۔ وہ بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کر سکے گی اور اسکی بنیاد اپنے ارکان کے اشتراک عمل پر ہوگی۔ بالآخر وہ ساری دُنیا پر چھا جائے گی پرانی تہذیبوں کی طرح اس تہذیب کے نہ تو فنا ہونے

کا اندیشہ ہو گا اور نہ بوسیدہ ہونے کا۔

چنانچہ ہم کو ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے وقت اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اس سے زیادہ عظیم الشان مقصد انسانی آزادی ہے جس میں ہماری اور دوسروں کی سب کی آزادی شامل ہے۔

(۵۹)

امریکہ کی مایا تہذیب

۱۴ر جون ۳۲ء

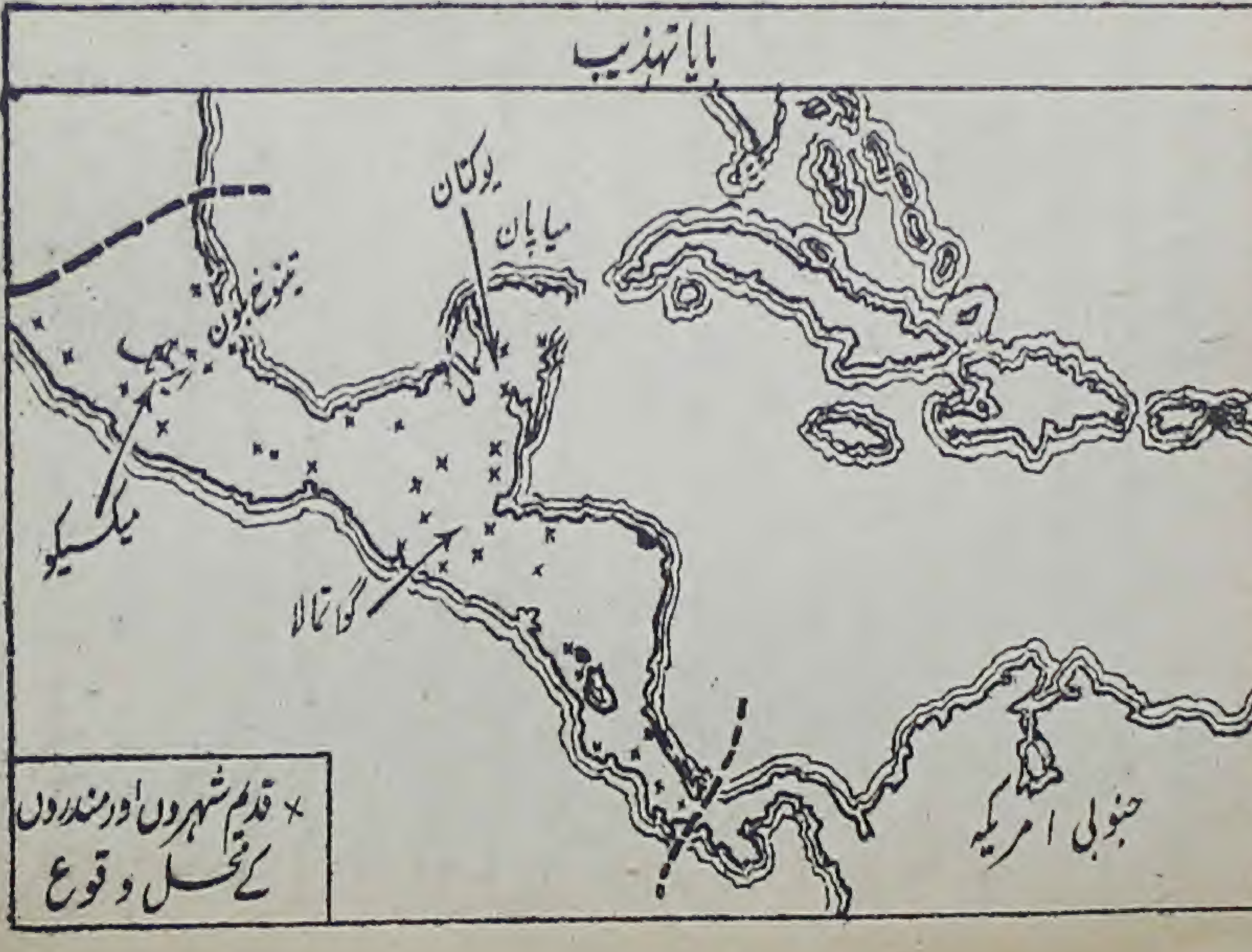
میں نے تم سے کہا تھا کہ میں ان خطوں میں ساری دنیا کی تاریخ بیان کروں گا لیکن حقیقت میں میں نے اب تک صرف ایشیا، یورپ اور شمالی افریقہ کی تاریخ بیان کی اور امریکہ اور آسٹریلیا کے بارے میں اب تک کچھ بھی نہیں لکھا۔ البتہ اتنا اشارہ کردیا تھا کہ ابتدائی زمانہ میں بھی امریکہ میں تہذیب کا وجود تھا۔ اس تہذیب کی کچھ زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تو بہت ہی کم معلوم ہے۔ پھر بھی میرا جی چاہتا ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ حال ضرور لکھوں تاکہ تم اس عام غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ کولمبس یا دوسرے یورپیوں کے امریکہ پہنچنے سے پہلے وہ بالکل وحشی ملک تھا۔

اس سے پہلے کہ انسان کہیں بستی بسائے یعنی اس پتھر کے دور میں جب وہ جگہ جگہ شکار کھیلتا پھرتا تھا۔ غالباً ایشیا، اور شمالی امریکہ کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہوگا اور مختلف قبیلے اور گروہ الاسکا ہو کر ادھر ادھر سے آتے جاتے ہوں گے بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور امریکہ والوں نے رفتہ رفتہ اپنی جداگانہ تہذیب قائم کرلی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے امریکہ کو ایشیا، یا یورپ سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس چینی بھکشو کا قصہ تو میں نے تمہیں بتایا تھا جس نے پانچویں صدی عیسوی میں یہ بیان کیا تھا کہ میں نے چین کے مشرق میں بہت دور پر ایک ملک

دیکھا ہے۔ ممکن ہے یہ میکسیکو ہو۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی تک جب کہ نئی دنیا "دریافت" ہوئی اس ایک واقعہ کے علاوہ اور کسی باضابطہ تعلقات کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ گویا امریکہ کی دنیا بہت، دور اور بالکل مختلف دنیا تھی جس پر ایشیا یا یورپ کے واقعات کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

بہرحال یہ پتہ چلتا ہے کہ وہاں تہذیب کے تین مرکز تھے۔ ایک میکسیکو میں۔ دوسرا وسطی امریکہ میں اور تیسرا پیرو میں یہ تو معلوم نہیں کہ ان کی ابتداء کب سے ہوئی البتہ میکسیکو کا سنہ ۶۱۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ عیسوی سنہ کے اوائل میں یعنی دوسری صدی کے بعد وہاں بہت سے شہر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں پتھر کا کام برتن سازی پارچہ بافی اور کپڑے رنگنے کا نہایت خوشنما کام بھی ہوتا تھا۔ تانبا اور سونا افراط سے موجود تھا لیکن لوہا نہیں تھا فن تعمیر کی ابتداء ہوئی تھی اور مختلف شہروں میں ایک سے ایک بڑھ کر عمارتیں موجود تھیں ایک خاص قسم کی نہایت پیچیدہ تحریر بھی رائج تھی۔ فنون لطیفہ اور بالخصوص سنگ تراشی کا بہت کافی چرچا تھا اور خوبصورت سے خوبصورت چیزیں تیار ہوتی تھیں۔

تہذیب کے ان حلقوں میں بہت سی ریاستیں قائم تھیں بہت سی زبانیں رائج تھیں اور ان میں ادب کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ نظام حکومت، نہایت منظم اور مضبوط تھا اور شہروں میں لوگ شائستہ اور تعلیم یافتہ تھے اور ریاستوں کا آئینی اور مالی نظام بہت ترقی کر چکا تھا۔ سنہ ۹۶۰ء میں شہر اکسمال آباد ہوا کہتے ہیں کہ بہت جلد اس نے اتنی ترقی کر لی کہ ایشیا کے اس زمانے کے بڑے بڑے شہروں کا مقابلہ


مایا تہذیب
یوکتان
مایاپان
میکسیکو
گواتمالا
جنوبی امریکہ
× قدیم شہروں اور مندروں
کے محل وقوع

کرنے لگا۔ دوسرے بڑے شہر لالوا۔ مایاپان اور کاؤملتن تھے۔

وسطی ایشیار کی تین سرکردہ ریاستوں نے اتحاد ثلاثہ قائم کرلیا جو جمیعتہ مایاپان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ کے ایک ہزار برس بعد کا ذکر ہے یعنی اس زمانہ کا جہاں تک ہم ایشیا، اور یورپ کا حال بیان کرچکے ہیں۔ گویا سنہ ۱۰۰۰ء کے قریب وسطی امریکہ کی مہذب قوموں کا ایک زبردست اتحاد قائم ہوا۔ لیکن ان تمام ریاستوں اور مایا تہذیب پر مذہبی پیشوا چھائے ہوئے تھے۔ نجوم کی ان کے یہاں سب سے زیادہ قدر تھی اور چونکہ یہ پیشوا نجوم سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے اس لئے عوام کی جہالت اور ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسی طرح جیسے ہندوستان میں لاکھوں آدمیوں کے یہ ذہن نشین کردیا گیا ہے کہ سورج گہن اور چاند گہن کے وقت اشنان کرنا اور برت رکھنا ضروری ہے۔

یہ جمیعتہ مایاپان کوئی سو برس تک قائم رہی اس کے بعد وہاں کوئی سماجی انقلاب ہوا۔ اور سرحد کی کوئی بیرونی طاقت آکودی۔ چنانچہ سنہ ۱۱۹۰ء میں مایاپان بالکل تباہ ہوگیا لیکن دوسرے بڑے شہر بدستور باقی رہے اگلی صدی میں ایک دوسری قوم منظر عام پر آئی۔ یہ مکسیکو کی ازتک قوم تھی۔ چودھویں صدی کے اوائل میں اس نے مایا کے علاقہ کو فتح کرلیا اور سنہ ۱۳۲۵ء میں شہر تنوک تتلان کی بنیاد ڈالی۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی یہ مکسیکو کی پوری دنیا کا صدر مقام اور ازتکون کی سلطنت کا پایۂ تخت ہوگیا اور اس کی آبادی بہت بڑھ گئی۔

ازتک ایک سپاہی قوم تھی اس لئے انھوں نے فوجی نوآبادیوں چھاونیوں اور فوجی سڑکوں کا ایک جال بچھا رکھا تھا یہ بھی معلوم ہوا

ہے کہ وہ بڑی ہوشیاری سے اپنی ماتحت ریاستوں کو برابر ایک دوسرے سے لڑاتے رہتے تھے۔ کیونکہ ان میں آپس میں پھوٹ ڈال کر ان پر حکومت کرنا زیادہ آسان تھا۔ تمام سلطنتوں کی یہی حکمت عملی رہی ہے۔ روم اسے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول سے تعبیر کرتا تھا۔

ازتک قوم دوسرے معاملات میں نہایت ہوشیار ہونے کے باوجود اپنے مذہبی پیشواؤں کے قبضے میں بھی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے مذہب میں انسانی قربانی پر بہت زور تھا۔ چنانچہ ہر سال ہزاروں بے گناہ انسانوں کی نہایت ہولناک طریقے سے قربانی کی جاتی تھی۔

کوئی دو سو برس تک ازتک لوگ اپنی سلطنت پر ڈنڈے کے زور سے حکومت کرتے رہے۔ بظاہر تمام سلطنت میں امن و امان تھا۔ لیکن در اصل رعایا کو بری طرح لوٹا جاتا تھا اور وہ روز بروز غریب ہوتی جاتی تھی۔ کوئی حکومت جو اس طرح قائم ہو اور ایسے چلائی جائے زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتی۔ چنانچہ یہی ہوا ۱۵۱۹ء میں جب ازتک بظاہر معراج کمال پر تھے۔ مٹھی بھر بیرونی لٹیروں کے ہاتھوں پوری سلطنت ایک دم سے بیٹھ گئی۔ کسی سلطنت کی آناً فاناً تباہی کی یہ حیرت انگیز مثال ہے اور یہ سب کچھ ہرنان کورٹس نامی ایک اسپینی نے فوج کے ایک چھوٹے سے دستے کے ذریعہ کر دکھایا۔ وہ بڑا بہادر اور جری شخص تھا۔ اس کے علاوہ دو چیزوں سے اسے بہت مدد ملی یعنی بندوقوں اور گھوڑوں سے شاید سلطنت میکسیکو کے پاس گھوڑے نہیں تھے اور بندوقیں تو یقیناً نہ تھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ نہ تو کارٹس کی ہمت وجرات کام آتی اور نہ گھوڑے اور بندوقیں یہ مہم سر انجام کر سکتی تھیں اگر ازتک کی سلطنت میں گھن نہ

لگ چکا ہوتا۔ وہ اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔ صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ باقی تھی اس کے واسطے ایک معمولی سا دھکا کافی تھا۔ چونکہ سلطنت کی بنیاد سراسر غریبوں کو لوٹنے پر قائم تھی اس لئے لوگ اس سے سخت دل برداشتہ تھے۔ چنانچہ جب حملہ ہوا تو وہ ان سامراجیوں کی ذلت اور ہار سے بہت خوش ہوئے۔ جب کبھی ایسی صورت پیش آتی ہے تو اس کے ساتھ سماجی انقلاب بھی ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔

یک بار تو کورٹس کو پسپا ہونا پڑا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔ لیکن پھر وہ واپس آیا اور وہیں کے بعض باشندوں کی مدد سے اس نے فتح حاصل کر لی۔ اس طرح نہ صرف ازتک حکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ میکسیکو کی ساری تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا اور عظیم الشان شاہی شہر تنوک تتلان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اب اس کا نشان تک باقی نہیں ہے۔ مگر اسپینیوں نے اسی مقام پر ایک گرجا بنا دیا ہے۔ دوسرے مایا شہر بھی تباہ ہو گئے اور یوکاٹن کے جنگلوں نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے نام بھی بھول گئے اور اب وہ اپنے آس پاس کے گانوؤں کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے ادب کا سارا ذخیرہ بھی برباد ہو گیا۔ بس صرف تین کتابیں باقی ہیں لیکن انھیں بھی اب تک کوئی پڑھ نہیں سکا ہے۔

یہ بتا دینا بہت ہی مشکل ہے کہ ایک قدیم قوم اور قدیم تہذیب جو کوئی پندرہ سو برس سے قائم تھی یورپ کی ایک نئی قوم سے سابقہ پڑتے ہی کیونکر یکایک تباہ ہو گئی گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی بیماری یا نئی قسم کی وبا تھی جس نے اس کا صفایا کر دیا۔ اس تہذیب کے بعض رُخ

تو بہت درخشاں تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض رخ تو بہت تاریک بھی تھے۔ وہ گویا تاریخ کے مختلف ادوار کا ایک عجیب و غریب معجون مرکب تھی۔

جنوبی امریکہ میں تہذیب کا ایک اور مرکز پیرو میں تھا جہاں انکہ کی حکومت تھی جو ایک دیوتا اور بادشاہ مانا جاتا تھا۔ تعجب ہے کہ بعد میں پیرو کی اس تہذیب کا میکسیکو کی تہذیب سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ ان میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ مگر انھیں ایک دوسرے کا قطعی علم نہ تھا۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض معاملات میں وہ کتنی پس ماندہ تھیں۔ کارٹس نے جب میکسیکو فتح کیا اس کے کچھ عرصہ بعد ہی ایک اسپینی نے پیرو کی اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کا نام پیزارو تھا وہ ۱۵۳۰ء یہاں آیا اور اس نے فریب سے انکہ کو گرفتار کر لیا چنانچہ لوگ خوفزدہ ہو گئے کہ یہ کون شخص ہے جس نے ہمارے دیوتا اور بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ کچھ مدت تک تو پیزارو انکہ کے نام سے حکومت کرتا رہا اور اس نے خوب دولت جمع کر لی۔ پھر یہ پردہ بھی اُٹھ گیا اور اسپینیوں نے پیرو کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جب کارٹس نے پہلے پہل شہر تنوک تنلان پر نظر ڈالی تو اس کی شان و شوکت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یورپ میں ایسا شہر کبھی کا ہے کو دیکھا تھا۔

مایا اور پیرو کے آرٹ کی اب بہت سی یادگاریں برآمد ہوئی ہیں اور امریکہ کے عجائب خانوں میں خاص کر میکسیکو میں آئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں فنونِ لطیفہ کا بہت اچھا مذاق تھا۔ پیرو کے سناروں کی کاریگری تو بے مثل ہے۔ اس زمانہ کی سنگ تراشی کے چند نمونے بھی ملے ہیں۔ بالخصوص پتھر کے چند سانپ جو بے انتہا نازک اور خوبصورت ہیں بعض چیزیں عمداً مہیب بنائی گئی ہیں اور واقعی انھیں دیکھ کر ڈر معلوم ہوتا ہے۔

(۶۰)

مہنجودارو

۱۴ر جون ۳۲ء

میں ابھی ہندوستان کی وادی سندھ کی قدیم تہذیب اور مہنجودارو کا حال پڑھ رہا تھا ایک بہت بڑی نئی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں اس کی وہ ساری تفصیل درج ہے جو اب تک معلوم ہو سکی ہے یہ ان لوگوں کی ترتیب دی ہوئی ہے جن کے سپرد وہاں کی کھدائی کا کام تھا اور جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دھرتی ماتا سے ایک پورا شہر برآمد ہوتے ہوئے دیکھا ہے ابھی تک یہ کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ کاش یہاں دیکھنے کو مل جاتی۔ بہر حال میں نے اس کا ایک تبصرہ پڑھا ہے اور اس میں اس کتاب کے جو اقتباسات دیئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ تم بھی ان سے لطف اٹھاؤ۔ وادیٔ سندھ کی یہ تہذیب نہایت حیرت انگیز تھی۔ اور جتنا زیادہ کوئی شخص اس کے متعلق پڑھے اتنی ہی حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اگر ہم گذشتہ تاریخ کے فسانے کو تھوڑی دیر کے لئے یہیں چھوڑ دیں اور اس خط میں ذرا پانچ ہزار برس پہلے کے زمانے کی سیر کر لیں تو تمہیں ناگوار نہ ہوگا۔

مہنجودارو کی تہذیب کے متعلق یہی اندازہ ہے کہ یہ اب سے کم از کم پانچ ہزار برس پہلے گذری ہے۔ اس زمانہ میں یہ جگہ ایک نہایت خوبصورت شہر اور ایک مہذب اور متمدن قوم کا گھر تھا اور ظاہر ہے

کہ وہ مدتوں سے رفتہ رفتہ ترقی کر رہی ہوگی۔ تب اس عروج پر پہنچی ہوگی
یہی خیال اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے۔ چنانچہ سر جان مارشل جو اس کھدائی
کے نگراں تھے لکھتے ہیں :-

مہنجو دارو اور ہڑپا کے متعلق ایک چیز بہت واضح ہے اور وہ
یہ کہ جس تہذیب کے آثار ان دونوں مقامات سے برآمد ہوئے ہیں وہ
کوئی نو وارد تہذیب نہ تھی بلکہ بہت پرانی تھی اور ہندوستان کی زمین
میں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی تھی اور لاکھوں انسانوں کی کوششوں کا
نتیجہ تھی اس لئے ہندوستان کا شمار بھی۔ ایران، عراق اور مصر کے ساتھ
ان اہم ملکوں میں ہونا چاہئے جہاں انسانی تہذیب کی ابتدا اور نشوونما ہوئی۔
غالباً میں نے ہڑپا کا اب تک تم سے کوئی ذکر نہیں کیا یہ پنجاب کے
مغرب میں ایک دوسرا اہم مقام ہے جہاں مہنجو دارو کی طرح پرانے آثار
کھود کر نکالے گئے ہیں۔

غرض وادیٔ سندھ کی سیر کرتے ہوئے ہم نہ صرف پانچ ہزار بلکہ
اس سے بھی زیادہ پیچھے پہنچ جاتے ہیں حتیٰ کہ ہم قدامت کے اس دھندلکے
میں گم ہو جاتے ہیں جب انسان نے پہلے پہل بستی بسانا سیکھا تھا جس زمانہ
میں مہنجو دارو کا عروج تھا، اس وقت تک آریہ ہندوستان نہیں پہنچے
تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ "اگر ہندوستان کے اور حصوں میں نہیں تو
کم از کم پنجاب اور سندھ میں ضرور ایک ترقی یافتہ اور بالکل یکساں قسم
کی تہذیب موجود تھی یہ تہذیب اس زمانہ کی عراق اور مصر کی تہذیب
سے بہت ملتی جلتی تھی بلکہ بعض باتوں میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی"

مہنجو دارو اور ہڑپا میں کھدائی کرنے پر بہت قدیم اور دلکش

تہذیب کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ نہ جانے ہندوستان کی سرزمین میں کتنی یادگاریں اور دفن ہوں گی۔ اس کا قوی امکان معلوم ہوتا ہے کہ یہ تہذیب سارے ملک میں پھیلی ہوگی اور محض موہنجوداڑو اور ہڑپا تک محدود نہ ہوگی اور خود یہ دونوں مقام بھی ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ "پتھر کے برتنوں اور ہتھیاروں کا استعمال جاری تھا اور ان کے ساتھ ساتھ تانبے اور کانسے کی چیزیں بھی شروع ہوگئی تھیں۔ سرجان مارشل نے اس کتاب میں وہ باتیں بھی لکھی ہیں جنھیں وادیٔ سندھ کی تہذیب مصر اور عراق کی ہمعصر تہذیبوں سے مختلف اور برتر تھی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "چند نمایاں خصوصیات یہ تھیں کہ کپڑا بننے کے لئے روئی کا استعمال اس زمانہ میں محض ہندوستان تک محدود تھا۔ اور مغربی دنیا میں اس کے کوئی دو تین ہزار برس بعد شروع ہوا اس کے علاوہ زمانہ قبل تاریخ میں مصر، عراق یا مغربی ایشیا کے کسی دوسرے ملک میں ایسے خوشنما حماموں اور عام باشندوں کے رہنے کے ایسے آرام دہ مکانوں کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے جیسے موہنجوداڑو میں برآمد ہوئے ہیں۔ مذکورہ بالا ملکوں میں دیوتاؤں کے عظیم الشان مندر اور بادشاہوں کے محل اور مقبروں کے بنانے پر تو محنت اور روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔ لیکن عام باشندے ادنیٰ قسم کی مٹی کی جھونپڑیوں میں زندگی گزارا کرتے تھے۔ وادیٔ سندھ میں صورت حالات بالکل برعکس تھی یہاں سب سے خوبصورت وہی عمارتیں ہیں جو عام باشندوں کی آسائش کے لئے بنائی گئی تھیں۔"

ایک جگہ اور لکھا ہے کہ "وادیٔ سندھ کا آرٹ اور مذہب بھی اپنی ایک خاص شان رکھتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اس زمانہ کی کوئی

ایسی چیزیں نہیں ملتی جو اپنی وضع کے لحاظ سے یہاں کی چیزوں کے لگ بھگ بھی پہنچتی ہو۔ مثلاً مینڈھوں۔ کتوں اور دوسرے جانوروں کے مٹی کے مجسمے یا مہروں کے نگینوں کے نقش ونگار وغیرہ ان میں سب سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے سینگوں والے کُب نکلے ہوئے بیلوں کی مورتیں ہیں۔ ان چیزوں کو آپ ایک نظر دیکھ کر پہچان سکتے ہیں اور ان کے اس سڈول پن اور صورت گری کے کمال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو کندہ کاری کے فن میں اپنی نظیر نہیں رکھتے اور نہ یونانیوں کے دورِ شائستگی تک ہڑپا کے دو انسانی مجسموں کی انتہائی نازک اور لطیف ساخت کی کوئی مثال ملتی ہے (ان دونوں مجسموں کی تصویریں کتاب مذکور میں نمبر ۱ اور ۱۱ پر شامل ہیں) رہا ان کا مذہب تو اس میں بیشک بہت سی ایسی چیزیں ملتی ہیں جو دوسرے ملکوں میں بھی موجود تھیں۔ یہ بات زمانۂ قبل تاریخ کے ہر مذہب پر اور بعد تاریخ کے بیشتر مذاہب پر صادق آتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کے مذہب میں ہندوستان کا خاص رنگ اس قدر گہرا ہے کہ موجودہ ہندو دھرم میں اور اس میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔

کاش میں، ہڑپا کے یہ مجسمے یا ان کی تصویریں ہی دیکھ سکتا۔ ممکن ہے کبھی ہم تم ہڑپا اور موہنجو دارو جائیں اور دل بھر کے اپنی آنکھوں سے یہ چیزیں دیکھیں مگر فی الحال تم تو اپنے پونا کے مدرسے میں پڑھتی رہو اور میں اپنے اس مدرسہ میں جسے لوگ دہرہ دون کی ڈسٹرکٹ جیل کہتے ہیں

(۱۶۱)

قرطبہ اور غرناطہ

۱۶ر جون ۱۹۳۲ء

ہم نے ایشیا، اور یورپ میں صدیوں کی منزلیں طے کیں، اور جب مسیح کے ایک ہزار برس بعد کی منزل پر پہنچے تو ذرا دم لیا اور پیچھے پلٹ کر ایک نظر ڈالی۔ لیکن اس تمام سفر میں اتفاق سے عربوں کے زمانہ کا اسپین ہمارے راستہ میں نہیں پڑا۔ اس لئے ذرا چلو واپس چلیں اور اس زمانہ کی دنیا کے نقشے میں اس کا رنگ بھی بھر لیں۔

شاید تمہیں خیال ہو۔ اسپین کے متعلق میں تمہیں کچھ بتا چکا ہوں۔ مثلاً ۷۱۱ء میں ایک عربی سپہ سالار افریقہ ہو کر اسپین پہنچا۔ اس کا نام طارق تھا جہاں وہ اُترا اُس مقام کا نام بھی اُسی کے نام پر جبل الطارق یا جبرالٹر پڑ گیا دو سال کے اندر اندر عربوں نے پورا اسپین فتح کر لیا اور کچھ عرصہ بعد پرتگال بھی ان کے قبضہ میں آگیا۔ وہ اسی طرح بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ فرانس پہنچے اور سارے جنوبی علاقے میں پھیل گئے۔ اس سے خوفزدہ ہو کر فرینک اور دوسری قومیں چارلس مارٹل کی سرکردگی میں متحد ہو گئیں اور انھوں نے عربوں کو روکنے کے لئے گھٹنے ٹیک دیئے۔ بالآخر وہ کامیاب ہو گئے اور فرانس میں پوائیتے کے قریب جنگ ٹور میں اُنھوں نے عربوں کو شکست دیدی۔ یہ بڑی زبردست شکست تھی اور اس سے عربوں کے پورے یورپ کے فتح کرنے کے خواب کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی بارہا عربوں

اور فرینک اور فرانس کی دوسری عیسائی قوموں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی عرب جیت جاتے تھے۔ اور کبھی وہ اسپین تک بھگا دیتے جاتے تھے۔ شارل مین نے تو اسپین پر بھی حملہ کیا تھا۔ لیکن اُسے شکست ہو گئی۔ بہر حال عرصہ تک میزان برابر رہی اور عرب اسپین پر حکومت کرتے رہے لیکن اور آگے نہ بڑھ سکے۔

گویا اب اسپین بھی عربوں کی عظیم الشان سلطنت میں شامل ہو گیا جو شمالی افریقہ سے ہے کر منگولیا کی سرحد تک پھیلی تھی لیکن یہ نقشہ زیادہ عرصہ تک نہیں رہا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ عرب کی قوموں میں آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا اور عباسیوں نے بنو اُمیہ سے خلافت چھین لی۔ چونکہ اسپین کا عرب صوبیدار خاندان بنو اُمیہ سے تھا اسلئے اُس نے عباسی خلیفہ کو سلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اسپین عربی سلطنت سے کٹ کر الگ ہو گیا خلیفہ بغداد اتنی دور تھا اور خود اپنی پریشانیوں میں ایسا مبتلا تھا کہ وہ اس کا کوئی تدارک نہ کر سکا لیکن اسپین اور بغداد میں باہم مخالفت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اگر ان میں سے ایک پر مصیبت آتی تھی۔ تو دوسرا بجائے اس کی مدد کرنے کے خوش ہوتا تھا۔

اسپین کے عربوں کی یہ کوتاہ اندیشی تھی کہ انھوں نے اپنے وطن سے یوں قطع تعلق کر لیا۔ وہ ایک دور دراز ملک میں غیروں کے درمیان رہتے تھے۔ اور چاروں طرف سے دشمن ان پر نرغہ کر رہے تھے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی اور خطرے یا مصیبت کے وقت میں کوئی مدد کرنے والا بھی نہ تھا۔ لیکن اس زمانہ میں انھیں اپنی ذات پر بڑا اعتماد تھا اور خطروں کی وہ ذرہ برابر پروا نہیں کرتے تھے۔ سچ پوچھو تو شمال کی طرف سے عیسائی قوموں کے برابر دباؤ اور یورش کے مقابلہ میں انھوں نے جرات و استقلال کا حیرت انگیز ثبوت دیا اور اسپین کے بیشتر حصے پر وہ پانچ سو برس تک حکومت کرتے

رہے۔ اس کے بعد بھی انھوں نے جنوب میں ایک چھوٹی سی سلطنت قائم رکھی۔ جو دو سو برس تک اور چلی۔ گویا حقیقت میں اس کی زندگی سلطنت بغداد سے زیادہ ہوئی اور جب اسپین سے عربوں کو رخصت ہونا پڑا اس سے بہت پہلے شہر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی

اسپین کے علاقہ پر سات سو برس تک عربوں کا حکومت کرنا خود ایک کارنامہ ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ کارنامہ ان کی اعلیٰ تہذیب و تمدن ہے۔ چنانچہ ایک مورّخ کچھ جوش میں آ کر یوں لکھتا ہے کہ "موروںؔ[لہ] نے قرطبہ کی وہ حیرت انگیز سلطنت قائم کی جسے دور وسطیٰ کا معجزہ کہنا چاہئے اور جس نے مغربی دنیا کے سامنے علم و تہذیب کی شمع اس وقت روشن رکھی جب سارا یورپ جہالت اور خانہ جنگی کی تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔"

قرطبہ صرف پانچ سو برس تک اس سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ یہ بہت بڑا شہر تھا جس کی آبادی دس لاکھ اور لمبائی دس میل تھی، شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔ اور اس کے اِدھر اُدھر چوبیس میل تک حوالیٔ شہر کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہاں ۶۰ ہزار محل اور ایوان ۲ لاکھ اوسط درجے کے مکانات، ۸۰ ہزار دکانیں، ۳۰۰۸ سو مسجدیں اور سات سو حمام تھے۔ ممکن ہے ان اعداد میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہو لیکن ان سے شہر کی حالت کے متعلق ایک اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ وہاں بےشمار کتب خانے بھی تھے۔ جن میں امیر کا شاہی کتب خانہ خاص طور پر مشہور تھا۔ اس میں ۴ لاکھ کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ قرطبہ کی یونیورسٹی نہ صرف اقصائے یورپ میں بلکہ مغربی ایشیا میں بھی مشہور تھی۔ ابتدائی مدارس کی

لہ۔ یورپ والے اسپین کے عربوں کو مور کہتے تھے۔

افراط تھی جہاں غریبوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مورّخ لکھتا ہے کہ "اسپین میں تقریباً ہر فرد لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کے یورپ میں پادریوں کے سوا اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کے لوگ بھی بالکل جاہل تھے۔"

یہ تھا شہر قرطبہ جو عرب کے عظیم الشان شہر بغداد سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ دسویں صدی کا ایک جرمن مصنف اسے "زینت عالم" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کی یونیورسٹی میں دور دور کے طالب علم آتے تھے۔ چنانچہ عربی فلسفہ کا اثر یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں یعنی پیرس۔ آکسفورڈ اور شمالی اٹلی کی یونیورسٹیوں تک پہنچا۔ بارھویں صدی میں ابن رشد قرطبہ کا مشہور فلسفی گزرا ہے۔ آخری عمر میں امیر سے اس کی کچھ ان بن ہو گئی اور وہ ملک بدر کر دیا گیا۔ اس لئے وہ پیرس میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔

اسپین میں بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح جاگیرداری نظام رائج تھا۔ بڑے بڑے طاقتور نواب پیدا ہو گئے تھے اور ان کے اور امیر کے درمیان اکثر جنگ رہتی تھی۔ سچ پوچھو تو بیرونی حملوں نے عربی سلطنت کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا اس خانہ جنگی نے اسے کمزور کر دیا۔ اس کے علاوہ شمالی اسپین میں چند چھوٹی چھوٹی عیسائی ریاستوں کی قوت بھی بڑھ رہی تھی اور وہ عربوں پر برابر حملے کر رہی تھیں۔

سنہ ۱۰۰۰ء میں تقریباً سارے اسپین پر امیر کی حکومت تھی بلکہ جنوبی فرانس کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دن کے بعد زوال شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ حسب دستور اندرونی کمزوریاں تھیں۔ عربی تہذیب کا خوشنما تار و پود اس کے فنون لطیفہ۔ عیش و عشرت کے سامان اور شجاعت

کے کارنامے اپنی جگہ بہت خوب تھے۔ لیکن یہ ساری تہذیب محض امیروں کی تہذیب تھی۔ چنانچہ فاقہ کش غریبوں نے بغاوت کی اور مزدوروں نے بلوے کئے۔ رفتہ رفتہ خانہ جنگی کا بازار گرم ہو گیا۔ اور صوبوں نے خود مختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کی اسپینی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ لیکن اس طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جانے کے باوجود عرب جمے رہے۔ اور کہیں ۱۲۳۶ء میں کیسٹل کے عیسائی بادشاہ نے قرطبہ کو فتح کیا۔

اب عربوں کو جنوب کی طرف ہٹنا پڑا۔ لیکن یہاں پہنچ کر وہ پھر رک گئے۔ انھوں نے جنوبی اسپین میں ایک چھوٹی سی سلطنت بنائی جو سلطنت غرناطہ کے نام سے مشہور ہے اور یہاں جم گئے۔ رقبہ کے لحاظ سے تو یہ بہت چھوٹی سی سلطنت تھی۔ لیکن چھوٹے پیمانے پر عربی تہذیب کا مکمل نمونہ تھی غرناطہ میں الحمرا کا مشہور محل آج بھی موجود ہے۔ جس کی خوبصورت محرابیں ستون اور نقش و نگار اس زمانہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ الحمرا عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "سرخ محل" اسلام میں تصویریں بنانے کی تو اجازت تھی نہیں اس لئے مسلمان معماروں نے نہایت خوشنما اور نازک نقش و نگار بنانا شروع کئے۔ اکثر وہ قرآن کی آیتیں محرابوں وغیرہ پر کندہ کرتے تھے۔ اور ان سے آرائش کا کام لیتے تھے۔ عربی رسم الخط میں خود اتنی روانی اور لوچ ہے کہ اس قسم کی آرائشوں میں بڑی آسانی سے کام آ سکتا ہے۔

سلطنت غرناطہ کوئی دو سو برس تک قائم رہی۔ اسپین کی عیسائی ریاستیں بالخصوص کیسٹل کی ریاست اسے برابر دباتی اور ستاتی رہی یہاں تک کہ کبھی کبھی اس نے حکومت کیسٹل کو خراج دینا بھی قبول کیا۔ غرناطہ کی سلطنت اتنے عرصے تک نہ چلتی اگر عیسائی سلطنتوں میں خود آپس میں

اختلاف نہ ہوتا۔ لیکن ۱۴۶۹ء میں دو بڑی عیسائی ریاستوں کے حکمرانوں یعنی فرڈینانڈ اور اسبیلا کی ایک دوسرے سے شادی ہو گئی جس کی بدولت کیسٹل ۔ آراگون ۔ اور لیون میں اتحاد ہو گیا۔ فرڈینانڈ اور اسبیلا نے غرناطہ کی عربی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ عرب کئی برس تک بڑی بے جگری سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ غرناطہ میں محصور ہو گئے اور جب وہ بھوکوں مرنے لگے تو ۱۴۹۲ء میں انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اس کے بعد بہت سے عرب اسپین سے ہجرت کر کے افریقہ چلے گئے۔ غرناطہ کے قریب شہر کے سامنے ایک مقام ہے جس کا نام اس واقعہ کی یادگار میں "عربوں کا آخری سانس پڑ گیا ہے"۔

تاہم بہت سے عرب اسپین میں باقی رہ گئے۔ ان عربوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ اسپین کی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے۔ ہر طرف ظلم و تشدد کا بازار گرم تھا۔ عربوں کا قتل عام ہو رہا تھا اور رواداری کے متعلق جتنے وعدے کئے گئے تھے۔ سب کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اسی زمانہ میں اسپین میں "دینی عدالت" (Inquisition) قائم ہو گئی۔ یہ وہ خوفناک ہتھیار تھا جو رومی کلیسا نے ان لوگوں کو کچلنے کے لئے گھڑا تھا جو اس کے سامنے جھکنے سے انکار کرتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کو جنھیں عربوں کے زمانے میں پوری آزادی حاصل تھی اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کیا گیا اور بہتوں کو آگ میں جھونک دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں کی گئی۔ چنانچہ ایک مورّخ لکھتا ہے کہ "منکروں (یعنی عربوں) کو حکم دیا کہ اپنا خوشنما لباس تہ کر کے رکھ دیں اور فاتحین کے ہیٹ اور برجس اختیار کریں۔ اس کے علاوہ اپنی زبان

اپنے رسم و رواج یہاں تک کہ اپنے نام بھی ترک کر دیں اور اسپینی زبان بولیں اسپینیوں کی طرح رہیں سہیں اور اسپینی نام رکھ لیں"۔ اس میں شک نہیں کہ ان مظالم کے خلاف بہت سی بغاوتیں اور بلوے ہوئے لیکن انھیں بڑی سفاکی سے کچل ڈالا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے عیسائی نہانے دھونے کے سخت مخالف تھے۔ ممکن ہے انھیں اس وجہ سے ضد ہو گئی ہو کہ اسپین کے عرب نہانے دھونے کے بہت شوقین تھے۔ اور انھوں نے ہر جگہ عام حمام کھول رکھے تھے۔ عیسائیوں نے تو اس معاملہ میں اس حد تک سختی برتی کہ یہ احکام جاری کر دیئے تھے کہ "موروں کی اصلاح کے خیال سے اعلان کیا جاتا ہے کہ انھیں یا ان کی عورتوں کو یا کسی اور شخص کو گھر میں یا گھر سے باہر نہانے یا ہاتھ منہ دھونے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ ان کے تمام حمام فوراً مسمار کر دیئے جائیں"۔

نہانے دھونے کے گناہ کے علاوہ موروں کا ایک اور قصور بھی ثابت کیا گیا تھا یعنی یہ کہ وہ مذہب کے معاملہ میں رواداری برتتے تھے یہ سن کر واقعی حیرت ہوتی ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے۔ ولنشیا کے لاٹ پادری نے ۱۶۰۲ء میں "موروں کی بے دینی اور بغاوت" کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اور جس میں ان کو اسپین سے نکالنے کی تلقین کی تھی اس میں اس نے عربوں پر سب سے بڑا الزام یہی لگایا تھا وہ لکھتا ہے کہ "مور کسی چیز کے اتنے قائل نہیں ہیں جتنے تمام مذہبی معاملات میں ضمیر کی آزادی کے قائل ہیں۔ حالانکہ ترک اور دوسرے مسلمان اپنی رعایا کو یہ آزادی نہیں دیتے"۔ دیکھنا یہ پادری اسپین کے عربوں کی برائی

کے پردے میں کتنی بڑی تعریف کر گیا اور ان کے مقابلہ میں اسپین کے عیسائیوں کا رویہ کتنا مختلف اور متعصبانہ تھا۔

لاکھوں عرب جبراً اسپین سے نکالے گئے جن میں سے زیادہ تر افریقہ اور کچھ فرانس چلے گئے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ عرب اسپین میں سات سو برس تک رہے تھے۔ اور اس طویل مدت میں وہ بہت بڑی حد تک اسپین کے باشندوں کے ساتھ مخلوط ہو گئے تھے۔ ابتدا میں تو وہ خالص عرب تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ اسپینی ہوتے گئے۔ لیکن بعد کے زمانے کے اسپینی عرب بغداد کے عربوں سے بالکل مختلف ہو گئے۔ آج بھی اسپینی قوم کی رگوں میں بہت کچھ عربی خون موجود ہے۔

یہ عرب جنوبی فرانس اور سوئزرلینڈ میں بھی پھیل گئے تھے۔ حکمراں کی حیثیت سے نہیں بلکہ معمولی باشندوں کی حیثیت سے۔ اب بھی کہیں کہیں فرانسیسیوں میں عربی خد وخال نظر آجاتے ہیں۔

غرض اسپین میں نہ صرف عرب سلطنت بلکہ عرب تہذیب کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس سے بہت پہلے ایشیا میں عربوں کی تہذیب پر زوال آچکا تھا۔ اس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔ بہرحال بہت ملک اور بہت سی تہذیبیں اس سے متاثر ہوئیں اور اس نے اپنی بہت درخشاں یادگاریں چھوڑیں۔ لیکن وہ خود دنیا کی تاریخ میں پھر پنپنے نہ پائی۔

عربوں کے اخراج کے بعد اسپین نے فرڈیننڈ اور اسبیلا کے زیر حکومت بہت قوت حاصل کی۔ اس کے بعد ہی امریکہ دریافت ہو گیا جس سے اسپین مالامال ہو گیا اور کچھ عرصہ تک اسپین یورپ کا سب سے طاقتور ملک رہا اور سب ملکوں پر حاوی تھا۔ لیکن اس کا زوال بڑی سرعت سے ہوا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد یہ گمنامی کے غار میں گر گیا۔ یورپ کے دوسرے ملک تو ترقی

کرتے رہے لیکن یہ اسی طرح جمود کی حالت میں پڑا ہوا دورِ وسطیٰ کے خواب دیکھتا رہا اور اس نے یہ محسوس نہ کیا کہ دنیا بہت کچھ بدل گئی ہے۔

ایک انگریز مورخ لین پول اسپین کے عربوں کے متعلق لکھتا ہے ۔

"صدیوں تک اسپین تہذیب کا مرکز علم و فن اور سائنس کا گھر غرضکہ ہر طرح کی روشن خیالی اور شائستگی کا منبع رہا۔ یورپ کا کوئی ملک اس وقت تک موروں کی مہذب سلطنت کے لگ بھگ بھی نہ پہنچا تھا فرڈینانڈ اور اسبیلا کے زمانے کی چندروزہ آب وتاب یا چارلس سلطنت کی شان و شوکت کو یہ دائمی شہرت و عظمت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ مور اسپین سے نکال دیئے گئے اور وہاں کے عیسائی کچھ عرصے کے لئے اس طرح چمکتے رہے جیسے چاند مستعار روشنی کی وجہ سے چمکتا ہے۔ پھر یہ چاند گہنا گیا اور اس وقت سے آج تک اسپین گھپ اندھیرے میں پڑا ہوا ہے۔ موروں کی سچی یادگاریں تو ان بنجروں اور ویران میدانوں میں جاکر دیکھو۔ جہاں کبھی وہ افراط کے ساتھ انگور اور زیتون بوتے تھے اور ہر طرف اناج کی پیلی پیلی بھری ہوئی بالیاں نظر آتی تھیں۔ دیکھو جہاں کبھی گھر گھر علم و دانش کا چرچا تھا وہاں آج جاہل اور احمق بستے ہیں۔ اسپینی قوم انحطاط اور زوال میں مبتلا ہے۔ اس کا درجہ اب دنیا کی سب قوموں کے مقابلہ میں بہت نیچا ہو گیا ہے اور وہ اس ذلت و رسوائی کی سزاوار بھی ہے۔"

کتنی سخت تنقید ہے! ابھی کوئی ایک سال ہوا کہ اسپین میں انقلاب ہوا اور بادشاہ کو تخت سے اتار کر اس کی جگہ جمہوریت قائم کی گئی۔ ممکن ہے یہ نئی جمہوریت کچھ بہتر ثابت ہو اور اسپین کو دوسرے ملکوں کے دوش بدوش لے آئے ۔

(۶۲)

صلیبی جنگ

۱۹ر جون ۱۹۳۲ء

ابھی کسی پچھلے خط[1] میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ بیت المقدس کے حصول کے لئے پاپائے روم اور مجلس کلیسا نے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ سلجوقی ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سارا یورپ عموماً اور قسطنطنیہ کی سلطنت خصوصاً خوفزدہ تھی کیونکہ وہ براہ راست خطرے میں تھی۔ اس کے علاوہ بیت المقدس اور فلسطین جانے والے زائرین کے ساتھ ترکوں کی بدسلوکی کے قصوں نے سارے یورپ کو مشتعل کر دیا تھا اور وہ غصہ سے برہم ہو رہا تھا۔ چنانچہ "مذہبی جنگ" کا اعلان کر دیا گیا اور پوپ وکلیسا نے یورپ کے تمام عیسائیوں کو دعوت دی کہ "مقدس" شہر کو چل کر بچائیں۔

اس طرح ۱۰۹۵ء میں صلیبی جنگوں کی ابتدا ہوئی اور کوئی ڈیڑھ سو برس تک عیسائیت اور اسلام یا صلیب و ہلال کے درمیان یہ کشمکش جاری رہی۔ بیچ بیچ میں طویل وقفے بھی ہوئے لیکن جنگ کی فضا برابر قائم رہی۔ عیسائی مجاہد لڑنے کے لئے بلکہ مقدس سرزمین میں جان دینے کے لئے موج در موج آتے تھے لیکن اس جنگ و جدال کا مجاہدین کے حق میں کوئی معقول نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ کے لئے تو بیت المقدس مجاہدین کے ہاتھ آگیا لیکن بعد میں ترکوں نے واپس لے لیا اور پھر انہیں کے قبضہ میں رہا۔ بس صلیبی جنگوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ

---

[1] خط نمبر ۵

لاکھوں عیسائی اور مسلمان موت کے گھاٹ اتر گئے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ اور ایشیائے کوچک اور فلسطین کی سرزمین پھر انسانی خون سے رنگین ہو گئی۔

اس وقت سلطنت بغداد کی کیا کیفیت تھی؟ عباسی اب بھی برسرِ حکومت تھے۔ اب بھی وہ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین تھے۔ لیکن وہ محض برائے نام بادشاہ تھے ان کے اختیارات کچھ نہ تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی اور تمام صوبے خود مختار ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ محمود غزنوی نے جو بڑا طاقتور بادشاہ تھا اور جس نے ہندوستان پر بار بار حملے کئے تھے خلیفہ کو یہ دھمکی دی کہ اگر تم میرے مطالبے منظور نہ کروگے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ بغداد میں بھی ترک سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ اس کے بعد ترکوں کی ایک دوسری قوم یعنی سلجوقی آئے۔ انھوں نے بہت جلد اپنا اقتدار قائم کر لیا اور دور تک فتح کرتے چلے گئے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کے دروازے تک پہنچ گئے۔ لیکن خلیفہ اب بھی خلیفہ تھا۔ اگرچہ اسے کوئی سیاسی اختیارات حاصل نہ تھے۔ اس نے سلجوقی سرداروں کو سلطان کا خطاب عطا کر دیا تھا اور حقیقت میں یہی سلطان حکومت کرتے تھے۔ گویا عیسائیوں کی صلیبی جنگیں سلجوقی سلطانوں سے ہوئیں۔

یورپ میں صلیبی جنگوں کی وجہ سے "عالم عیسائیت" کے تصور کو بہت تقویت پہنچی اور وہ تمام غیر عیسوی ممالک سے جدا سمجھا جانے لگا یورپ کا ایک مشترک عقیدہ اور مشترک مقصد تھا۔ یعنی 'مقدس سرزمین' کو منکرین کے پنجے سے چھڑایا جائے۔ اس مشترک مقصد نے لوگوں کو جوش سے اتنا سرشار کر دیا کہ وہ اس کی خاطر گھر بار۔ مال دولت سب کچھ چھوڑ

جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بہت سے تو اس نیک جذبے کے ماتحت گئے اور بہت سے پوپ کے اس وعدے کی بنا پر گئے کہ جو لوگ اس جنگ میں شریک ہوں گے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ صلیبی جنگوں کی تہ میں اور چیزیں بھی کام کر رہی تھیں۔ مثلاً روم کی خواہش تھی کہ قسطنطنیہ کا مالک بن جائے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ قسطنطنیہ کا کلیسا رومی کلیسا سے بہت مختلف تھا۔ قسطنطنیہ والے اپنے آپ کو پکے عیسائی کہتے تھے رومی کلیسا سے سخت نفرت کرتے تھے اور پاپائے روم کو بدعتی سمجھتے تھے۔ اس لئے پوپ چاہتا کہ قسطنطنیہ کے غرور کو نیچا دکھائے اور اسے بھی اپنے میں شامل کرلے۔ چنانچہ ترک منکرین کے خلاف مذہبی جنگ کے پردے میں پوپ وہ بات حاصل کرنا چاہتا تھا جس کی اُسے ہمیشہ سے تمنا تھی۔ سیاست داں یا وہ لوگ جو اپنے آپ کو مدبر کہتے ہیں ہمیشہ اسی قسم کی چالیں چلا کرتے ہیں۔ بہر حال تم روم اور قسطنطنیہ کی اس باہمی کشمکش کو ذہن میں رکھنا کیونکہ یہ صلیبی جنگوں کے دوران میں بارہا نظر آتی ہے۔

صلیبی جنگوں کا ایک اور سبب خالص تجارتی تھا۔ تمام کاروباری طبقہ بالخصوص وینس اور جنوا کی بندرگاہوں کے تاجر اُن کے حق میں تھے کیونکہ سلجوقی ترکوں نے ان کے مشرق کی طرف کے تجارتی راستے بند کر دیئے تھے جس کی وجہ سے ان کی تجارت کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔

عوام کو ان وجوہ کا کوئی علم نہ تھا۔ انھیں بھلا کون بتلاتا! سیاستداں عموماً اصل وجہ کو چھپاتے ہیں اور تکلف اور اہتمام سے مذہب۔ انصاف حق وغیرہ کا نام لیا کرتے ہیں۔ یہی حال صلیبی جنگ کے زمانے میں تھا اور

یہی آج کل بھی ہے۔ عوام نے اس وقت بھی دھوکا کھایا اور اب بھی اکثر لوگ سیاست والوں کی میٹھی میٹھی باتوں کے فریب میں آجاتے ہیں۔

غرضکہ صلیبی جنگوں کے لئے بے شمار مجاہدین نکل کھڑے ہوئے اُن میں نیک اور مخلص لوگ بھی تھے اور ایسے بھی تھے جنھیں نیکی کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ یہ لوگ لوٹ مار کے خیال سے گئے تھے۔ گویا مجاھدین کے جتھے مقدس اور دیندار لوگوں اور ان بدمعاشوں اور غنڈوں کا ایک معجون مرکب تھے جنھیں بُرے سے بُرا جرم کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ کہنے کو تو یہ مجاہدین گئے تھے ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے لیکن حقیقت ان میں سے اکثر و بیشتر انتہائی نا روا اور ذلیل ترین حرکتوں کے مرتکب ہوئے۔ بہت سے تو راستے ہی میں لوٹ مار اور شرارتیں کرنے میں ایسے محو ہو گئے کہ فلسطین تک پہنچ بھی نہ پائے۔ بعض نے راستے میں یہودیوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا اور بعض نے اپنے عیسائی بھائیوں ہی کو قتل کر ڈالا۔ ان بدسلوکیوں سے کبھی کبھی ان عیسائی ملکوں کے کسان بھی عاجز آجاتے تھے جہاں سے یہ لوگ گذرتے تھے۔ چنانچہ وہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ان میں سے بہتوں کو قتل کر دیا اور باقی سب کو نکال باہر کیا۔

بالآخر بوئیٹوں کے رہنے والے گاڈ فرے نامی ایک نارمن کی سرکردگی میں یہ مجاہد فلسطین پہنچ گئے۔ اور اُنھوں نے بیت المقدس کو فتح کر لیا اس کے بعد ایک ہفتہ تک قتل عام جاری رہا۔ اور سخت خونریزی ہوئی چنانچہ ایک فرانسیسی نے چشم دید حالات لکھے ہیں کہ "مسجد کے سائبان میں گھٹنوں گھٹنوں خون تھا اور گھوڑوں کی لگامیں خون میں ڈوب جاتی تھیں" غرضکہ گاڈ فرے بیت المقدس کا بادشاہ ہو گیا۔

ستر برس بعد صلاح الدین سلطان مصر نے عیسائیوں سے بیت المقدس پھر چھین لیا۔ اس سے یورپ میں نئے سرے سے اشتعال پیدا ہوا۔ اور پھر بہت سی صلیبی جنگیں ہوئیں۔ اس مرتبہ یورپ کے بادشاہ اور شہنشاہ بذات خود شریک ہوئے۔ لیکن انھیں زیادہ کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ وہ اپنی اپنی فوقیت کے لئے آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اور ایک دوسرے سے جلا کرتے تھے۔ یہ صلیبی جنگ خوفناک اور وحشیانہ لڑائیوں۔ اندرونی سازشوں اور ناپاک جرائم کی ایک افسوس ناک داستان ہے لیکن کبھی کبھی انسانی فطرت کا درخشاں رُخ بھی ان سفاکیوں کی تاریکی میں چمک اُٹھتا تھا۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جب دشمن اپنے دشمن کے ساتھ اخلاق اور دلاوری سے پیش آئے۔ فلسطین میں یورپ سے جو بادشاہ لڑنے آئے تھے ان میں انگلستان کا رچرڈ شیر دل بھی تھا جو اپنی جسمانی قوت اور دلیری کے لئے بہت مشہور تھا۔ صلاح الدین بھی بڑا مردِ میدان تھا اور شجاعت میں خاص طور پر مشہور تھا۔ یہاں تک کہ عیسائی مجاہد بھی جن کا صلاح الدین سے مقابلہ ہوا تھا اس کی شجاعت کے معترف ہوگئے۔ چنانچہ یہ قصہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ رچرڈ سخت بیمار پڑا شاید اُسے لوگ گئی تھی۔ جب صلاح الدین کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے پہاڑوں سے تازہ برف منگوا کر اسے بھجوایا۔ اس زمانہ میں آج کل کی طرح پانی جما کر تو برف بنایا نہ جاتا تھا اس لئے تیز رفتار ہرکاروں کے ذریعہ سے پہاڑوں سے قدرتی برف منگوایا جاتا تھا۔

صلیبی جنگوں کے زمانے کے اور بہت سے قصے بھی مشہور ہیں شاید تم نے والٹر اسکاٹ کی کتاب ٹیلسمان تو پڑھی ہوگی۔

ان مجاہدوں کے ایک حصے نے قسطنطنیہ پہنچ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے مشرقی سلطنت کے بادشاہ کو مار بھگایا اور لاطینی سلطنت اور رومی کلیسا قائم کر لیا۔ ان مجاہدوں نے قسطنطنیہ میں بھی خوب کشت و خون کیا اور شہر کے ایک حصے کو آگ لگا دی۔ لیکن یہ لاطینی سلطنت زیادہ عرصہ تک نہیں چلی مشرقی سلطنت کے یونانی باوجود کمزور ہونے کے پچاس برس بعد پھر واپس آئے اور انھوں نے لاطینیوں کو نکال دیا۔ اس کے بعد کوئی دو سو برس تک قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت اور قائم رہی یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے آکر اس کا بالکل خاتمہ کر دیا۔

قسطنطنیہ پر مجاہدوں کا قبضہ کر لینے پر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رومی کلیسا کا اصل منشا یہی تھا کہ وہ اپنے اثر و اقتدار کو بڑھانا چاہتے تھے۔ اگرچہ قسطنطنیہ کے یونانیوں نے پریشانی اور گھبراہٹ میں روم والوں سے یہ درخواست کر دی تھی کہ ترکوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کرو لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مجاہدوں کی ذرا بھی مدد نہیں کی بلکہ وہ اُن سے سخت نفرت کرتے تھے۔

ان جنگوں میں سب سے زیادہ دردناک بچّوں کی صلیبی جنگ تھی۔ زیادہ تر فرانس اور کچھ جرمنی کے نوعمر لڑکے بھی جوش میں آکر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے فلسطین جانے کی ٹھان لی۔ ان میں سے بہت سے تو راستے میں مر گئے اور بہت سے کھو گئے باقی کسی نہ کسی طرح مارسلز پہنچ گئے۔ یہاں ان بھولے بچوں کو سخت دھوکے دیئے گئے اور بدمعاشوں نے ان کے مذہبی جوش سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ بردہ فروشوں نے انھیں یہ فریب دیا کہ ہم تمہیں اپنے جہازوں پر "مقدس سرزمین"

تک پہنچا دیں گے۔ لیکن انھیں مصر میں غلام بنا کر بیچ ڈالا۔

انگلستان کے شاہ رچرڈ کو فلسطین سے واپس ہوتے ہوئے دشمنوں نے مشرقی یورپ میں گرفتار کر لیا اور بہت بڑی رقم لینے کے بعد رہا کیا۔ فرانس کے ایک بادشاہ کو فلسطین ہی میں پکڑ لیا تھا۔ اور اسے بھی خون بہا لے کر چھوڑا تھا۔

مقدس رومی سلطنت کا ایک بادشاہ فریڈرک باربروسا فلسطین میں ایک ندی میں ڈوب گیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا صلیبی جنگوں کا نمائشی رنگ بھی پھیکا پڑ گیا اور لوگ ان سے عاجز آ گئے۔ بیت المقدس مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہا۔ لیکن اب یورپ کے بادشاہ اور عوام اسے دوبارہ فتح کرنے کے لئے مزید روپیہ اور جانیں تلف کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے بعد کوئی سات سو برس تک بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ حتیٰ کہ ابھی ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم کے آخر میں ایک انگریز جرنیل نے اسے ترکوں سے چھین لیا۔

بعد کی صلیبی جنگوں میں سے ایک بہت دلچسپ اور معمولی ہوئی سچ پوچھو تو پُرانے مفہوم کے مطابق اسے صلیبی جنگ کہنا ہی غلط ہے۔ یعنی مقدس رومی سلطنت کا شہنشاہ فریڈرک ثانی مصر پہنچا اور لڑنے کے بجائے اس نے سلطان مصر سے ملاقات کی اور اس سے کچھ دوستانہ معاہدہ کر لیا۔ فریڈرک بڑا غیر معمولی آدمی تھا۔ اُس زمانہ میں جب کہ اکثر بادشاہ عموماً بے پڑھے ہوتے تھے۔ وہ بہت سی زبانوں کا ملکہ رکھتا تھا حتیٰ کہ عربی بھی جانتا تھا۔ وہ "عجوبہ روزگار" کے خطاب سے مشہور ہے۔ پوپ کی وہ ذرا پروا نہ کرتا تھا۔ اِس

لئے پوپ نے اِسے ملحد قرار دے دیا تھا۔ لیکن اس کا فریڈرک پر کچھ اثر نہیں ہوا۔

غرض صلیبی جنگیں اپنے مقصد کی تکمیل میں ناکام رہیں۔ لیکن اس مسلسل جنگ نے سلجوقی ترکوں کو بھی شل کر دیا سلجوقیوں کی کمزوری کی یہی خاص وجہ نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ جاگیرداری نظام نے ان کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ بڑے بڑے نواب اپنے آپ کو تقریباً خود مختار سمجھتے تھے۔ وہ آپس میں برابر لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں عیسائیوں سے بھی مدد لیتے تھے۔ ترکوں کی اسی اندرونی کمزوری کی وجہ سے کبھی کبھی عیسائی مجاہدین کو فائدہ پہنچ جاتا تھا لیکن جب صلاح الدین جیسا قوی حکمراں ہوتا تھا تو ان کی کچھ نہ چلتی تھی۔

ایک انگریز مورخ جی۔ ایم۔ ٹریولین نے جو گیری بالڈی کی کتابوں کا مولف ہے صلیبی جنگوں کے متعلق ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ یہ بہت دلچسپ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ" یورپ میں ایک تازہ قوت عمل پیدا ہو رہی تھی اور وہ مشرق کی طرف بڑھنے کے لئے بے چین تھی۔ چنانچہ یہ صلیبی جنگیں حقیقت میں اسی جذبہ کی فوجی اور مذہبی شکلیں تھیں۔ یورپ کو ان صلیبی جنگوں کا جو انعام ملا۔ اور جو تحفہ وہ مشرق سے لایا، وہ روضۂ مقدس کی مستقل آزادی یا مسیحی دنیا کا امکانی اتحاد نہ تھا، کیونکہ صلیبی جنگوں کی ساری داستان خود اس کی نفی ہے۔ البتہ اس کے بجائے یورپ وہاں سے فنون لطیفہ صنعت و حرفت۔ سامان آسائش، سائنس اور تحقیق و تفتیش کا

جذبہ لایا۔ اور یہ سب وہ چیزیں تھیں کہ اگر پطرس راہب زندہ ہوتا تو انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا"۔

صلاح الدین کا ۱۱۹۳ء میں انتقال ہوگیا اور رفتہ رفتہ رہی سہی عربی سلطنت بھی مٹ گئی۔ مغربی ایشیا کے اکثر حصوں میں چھوٹے چھوٹے نوابوں کی بدولت طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوگیا آخری صلیبی جنگ ۱۲۴۹ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کی سرکردگی میں ہوئی۔ اُسے بھی شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا اور بالآخر وہ قید کرلیا گیا۔

اس عرصہ میں مشرقی اور وسطی ایشیا میں بڑے بڑے اہم انقلاب ہوگئے۔ مغل قوم اپنے زبردست سردار چنگیز خاں کی ماتحتی میں مشرقی مطلع پر کالی گھٹا کی طرح چھا رہی تھی اور عیسائی مجاہد اور مسلمان غازی دونوں اس اُٹھتے ہوئے طوفان کو دیکھ دیکھ کر ڈر رہے تھے۔ بہر حال ہم چنگیز خاں اور مغلوں کا آئندہ کسی خط میں تذکرہ کریں گے۔

اس خط کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ وسطی ایشیا کے شہر بخارا میں اس زمانہ میں ایک بہت بڑا عرب طبیب موجود تھا۔ جس کا شہرہ ساری ایشیا اور یورپ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا نام ابن سینا تھا۔ وہ شہنشاہ اطبا کے لقب سے مشہور تھا۔ صلیبی جنگ شروع ہونے سے پہلے ۱۰۳۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔

میں نے ابن سینا کا ذکر اس کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے کیا۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ اس زمانہ میں بھی جب کہ عرب سلطنت زوال پذیر تھی۔ عرب تہذیب کا مغربی ایشیا میں اور وسطی ایشیا

کے بعض حصوں میں بدستور فروغ رہا۔ باوجودیکہ صلاح الدین صلیبی جنگوں میں مصروف تھا۔ پھر بھی اس نے بہت سے کالج اور اسپتال کھولے۔ لیکن اب اس تہذیب کی ساری عمارت یکایک بیٹھنے والی تھی۔ مغل مشرق کی سمت سے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

(۶۴)

صلیبی جنگوں کے وقت یورپ کی حالت

۲۰ رجون ۱۹۳۲ء

میں نے اپنے پچھلے خط میں گیارہویں۔ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں اسلام اور عیسائیت کی ٹکر کا کچھ ذکر کیا تھا۔ اس زمانہ میں یورپ میں عالم مسیحی کے تصوّر نے نشو ونما پائی۔ اس وقت عیسائی مذہب سارے یورپ میں پھیل چکا تھا۔ سب سے آخر میں مشرقی یورپ کی سلافی قومیں یعنی روسی وغیرہ اس میں شامل ہوئے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے جو معلوم نہیں کہاں تک صحیح ہے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے کے روسیوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے سے پہلے اپنے تبدیلی مذہب کے مسئلہ پر غور کیا۔ انھوں نے دو نئے مذہبوں کا نام سنا تھا۔ یعنی عیسائیت اور اسلام کا۔ چنانچہ انھوں نے بالکل آج کل کے انداز میں ان ملکوں میں جہاں یہ مذہب رائج تھے۔ ایک وفد بھیجا تاکہ وہ ان مذاہب کی چھان بین کرکے ان کے متعلق اپنی رائے دے۔ یہ وفد پہلے مغربی ایشیا کے بعض مقامات پر گیا جہاں اسلام کا زور تھا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ آیا یہاں کا منظر دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ کیونکہ یہاں کلیسا کی تقریبات بڑے ٹھاٹ سے ہوتی تھیں اور ان میں گانا بجانا بھی خوب ہوتا تھا۔ پادری بڑا شاندار لباس پہن کر آتے تھے اور افراط سے خوشبوئیں سلگائی جاتی تھیں۔ شمال کی طرف یہ بھولے بھالے نیم وحشی لوگ ان

مذہبی تقریروں سے بے انتہا متاثر ہوئے۔ اسلام میں بھلا یہ ٹھاٹھ کہاں تھے۔ اس لئے اُنھوں نے عیسائیت کے حق میں فیصلہ کر لیا۔ اور واپس جا کر اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ اس پر بادشاہ اپنی ساری قوم کے ساتھ عیسائی ہو گیا۔ چونکہ ان لوگوں نے عیسائیت قسطنطنیہ سے لی تھی۔ اس لئے وہ رومی کلیسا کے نہیں بلکہ قدیم یونانی کلیسا کے پیرو رہے اور بعد میں بھی روس نے کبھی پاپائے روم کو تسلیم نہیں کیا۔

روس صلیبی جنگوں سے بہت پہلے عیسائی ہو چکا تھا۔ سنا ہے کہ کسی زمانہ میں بلغاریہ والوں کا بھی اسلام کی طرف کچھ رجحان ہوا تھا لیکن پھر قسطنطنیہ کی کشش زیادہ موثر ثابت ہوئی۔ ان کے بادشاہ نے قسطنطنیہ کی ایک شاہزادی سے شادی کر لی اور عیسائی ہو گیا۔ اسی طرح اور بہت سے آس پاس کے ملک بھی عیسائی ہو گئے۔

صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یورپ میں کیا ہو رہا تھا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یورپ کے بعض بادشاہ بھی فلسطین گئے تھے اور ان میں سے اکثر طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے تھے۔ لیکن ان کا پوپ روم ہی میں بیٹھے بیٹھے احکام جاری کرتا تھا۔ اور "منکر" ترکوں کے خلاف دینی جنگ میں شریک ہونے کے لئے لوگوں کو جوش دلاتا رہتا تھا۔ اس زمانہ میں پوپ کی قوت معراج کمال پر تھی۔ میں تمہیں یہ واقعہ بتا چکا ہوں کہ ایک مغرور بادشاہ پوپ سے معافی مانگنے گیا تھا تو اس کی اجازت کے انتظار میں بہت دیر تک ننگے پیر برف میں کھڑا رہا۔ یہی وہ پوپ گریگوری ہفتم تھا (اس کا اصلی نام ہلڈبرانڈ تھا) جس نے پوپ کے انتخاب کا ایک نیا طریقہ ایجاد

کیا۔ رومن کیتھولک فرقے کے سب سے بڑے پادری کارڈنل کہلاتے ہیں ان کارڈنلوں کی مجلس بنائی گئی جسے "مقدس کالج" کہتے ہیں۔ یہی کالج نیا پوپ منتخب کرتا تھا۔ ۱۰۵۹ء میں یہ طریقہ رائج ہوا اور چند ترمیموں کے علاوہ اس وقت سے اب تک بجنسہ چلا آتا ہے۔ اب بھی جب پوپ کا انتقال ہوتا ہے تو کارڈنلوں کے کالج کا جلسہ فوراً طلب کیا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ ایک مقفل کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں اور جب تک انتخاب ختم نہ ہو جائے نہ کوئی اندر سے باہر جا سکتا ہے اور نہ باہر سے اندر آ سکتا ہے۔ اگر ان میں اختلاف رائے ہوتا ہے تو گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن باہر نہیں نکل سکتے۔ آخر وہ چارناچار ایک بات پر متفق ہو جاتے ہیں اور جیسے ہی انتخاب ہو چکتا ہے۔ کمرے کی کھڑکی میں سے باہر روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ باہر جو مجمع منتظر ہوتا ہے اُسے خبر ہو جائے۔

جس طرح پوپ کا انتخاب ہوتا تھا اسی طرح مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ کا بھی انتخاب ہونے لگا۔ لیکن اسے بڑے بڑے رئیس منتخب کرتے تھے۔ ان کی تعداد سات ہوتی تھی اور وہ "انتخاب کنندہ روسار" کہلاتے تھے۔ گویا اس طرح ان کی یہ کوشش تھی کہ بادشاہ ہمیشہ ایک ہی خاندان کے نہ ہوں۔ لیکن حقیقت میں عرصہ تک ایک ہی خاندان ان انتخابات پر حاوی رہا۔

چنانچہ بارھویں اور تیرھویں صدی میں ہوہن اشٹاؤفن خاندان کی حکمرانی رہی۔ ہوہن اسٹاؤفن شاید جرمنی میں کوئی چھوٹا سا قصبہ یا گاؤں ہے۔ چونکہ یہ خاندان اول اول وہیں سے

یورپ تیرہویں صدی میں



آیا تھا اس لئے اس کا یہی نام پڑ گیا۔ ہوہن اسٹاؤفن کا فریڈرک اوّل ۱۱۵۲ء میں بادشاہ ہوا۔ وہ عام طور پر فریڈرک باربروسا کے نام سے مشہور ہے۔ یہی وہ بادشاہ تھا جو صلیبی جنگوں کے زمانے میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سلطنت کی تاریخ میں اس کا دور حکومت سب سے درخشاں رہا ہے۔ جرمن والے تو مدت تک اسے سورما یا نیم دیوتا مانتے رہے جس کے متعلق لاکھوں افسانے مشہور تھے ان کا خیال تھا کہ وہ کسی پہاڑ کی کھو میں سو رہا ہے اور جب وقت آئے گا تو بیدار ہوگا اور اپنی قوم کو بچانے کے لئے آئے گا۔

فریڈرک باربروسا کی پوپ سے بڑی سخت جنگ ہوئی۔ لیکن اس میں پوپ کو فتح ہوئی اور فریڈرک کو اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ وہ مطلق العنان بادشاہ تھا لیکن اس کے ماتحت رئیس اسے برابر دق کرتے رہے۔ اٹلی میں جو بڑے بڑے شہر آباد ہوتے جا رہے تھے فریڈرک نے ان کی آزادی کو کچلنے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ ناکام رہا جرمنی میں بھی بڑے بڑے شہر خاص کر ندیوں کے کنارے آباد ہو رہے تھے۔ مثلاً کولون۔ ہیمبرگ فرینک فرٹ وغیرہ۔ یہاں اس نے بالکل مختلف حکمت عملی اختیار کی۔ یعنی ان شہروں کی آزادی کی حمایت کی۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ رئیسوں کی قوت کم ہو جائے۔

میں بارہا تمہیں یہ بتا چکا ہوں کہ ہندوستان میں بادشاہت کا قدیم تصور کیا تھا؟ آریوں کے ابتدائی زمانے سے لے کر اشوک کے زمانہ تک اور ارتھ شاستر کی تصنیف سے لے کر آچاریہ کی نیتی سار کے زمانے تک بار بار اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ بادشاہ کو

رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اصلی حاکم خود جمہور ہیں۔ ہندوستانی نظریہ یہی تھا اگرچہ عملاً یہاں کے بادشاہ بھی دوسرے ملکوں کے بادشاہوں سے کچھ کم مطلق العنان نہ تھے۔ وہ مطلق العنان تھے۔ لیکن ذرا اس کا قدیم یورپی نظریہ سے مقابلہ کرو۔ اس زمانہ میں وہاں کے مقنن بادشاہ کو مختار کل مانتے تھے ان کے نزدیک اس کی مرضی قانون کا حکم رکھتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "بادشاہ روئے زمین پر زندہ قانون ہوتا ہے" خود فریڈرک بار بار دہرایا کہتا ہے کہ "رعایا کا یہ منصب نہیں ہے کہ بادشاہ کے لیئے قانون بنائے بلکہ وہ تو محض بادشاہ کے احکام کی تعمیل کرنے کے لیئے ہے"۔

اب ذرا چینی نظریہ بھی سن لو اگرچہ وہاں کے بادشاہوں کے بڑے بلند آہنگ خطاب ہوتے تھے۔ مثلاً فرزند الٰہی وغیرہ لیکن ان خطابوں سے دھوکا نہ کھانا۔ ان کے نظریہ کے مطابق بادشاہ کی حیثیت یورپ کے مختار کل بادشاہوں سے بہت مختلف تھی۔ چنانچہ ایک قدیم چینی مصنف مینگ سی لکھتا ہے: "ملک میں جمہور سب سے اہم عنصر ہیں اس کے کھیتوں اور فصلوں کے نفع بخش دیوتا ہیں اور سب سے آخر میں بادشاہ کا نمبر آتا ہے۔"

غرض یورپ میں بادشاہ سب سے برتر سمجھا جاتا تھا۔ اسی سے بادشاہ کے ربانی حقوق کا تخیل پیدا ہوا۔ لیکن حقیقت میں وہ برتری سے بہت دور تھا۔ اس کے ماتحت رئیس بڑے سرکش ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ شہروں میں بھی رفتہ رفتہ نئے طبقے پیدا ہو گئے جو اختیارات کا مطالبہ کرنے لگے۔ دوسری طرف پوپ کو بھی دعویٰ تھا کہ دنیا میں سب سے افضل

دہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ دو تلواریں ایک میان میں کیسے رہ سکتی ہیں ۔ چنانچہ وہ آپس میں ٹکراتے تھے ۔

فریڈرک باربروسا کے پوتے کا نام بھی فریڈرک تھا۔ وہ بہت کمسنی میں بادشاہ ہو گیا تھا اور فریڈرک ثانی کے نام سے مشہور ہے ۔ یہی وہ بادشاہ تھا جو "عجوبۂ روزگار" کہلاتا تھا اور جس نے فلسطین جاکر سلطان مصر سے دوستانہ معاہدہ کیا تھا۔ اُس نے بھی اپنے دادا کی طرح پوپ کی کوئی پروانہ کی اور اس کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ پوپ نے یہ انتقام لیا کہ اُسے مرتد قرار دے دیا۔ پوپ کے ہاتھ میں یہ بہت پرانا اور زبردست ہتھیار تھا لیکن اب یہ زنگ آلود ہوتا جا رہا تھا فریڈرک ثانی نے پوپ کے غیض و غضب کی ذرا پروانہ کی اور اب زمانہ بھی بدل رہا تھا ۔ اس نے یورپ کے تمام بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو بڑے طویل خط لکھے جس میں اس بات پر زور دیا کہ پوپ کو بادشاہوں کے معاملات میں دخل دینے سے کیا سروکار۔ اس کا تعلق تو صرف مذہبی اور روحانی معاملات سے ہے ۔ اسے سیاسیات میں ٹانگ نہ اڑانا چاہیے اس کے علاوہ اس نے پادریوں کی بداعمالیوں کی پول بھی کھولی تھی اس معاملہ میں پوپ کے مقابلہ میں فریڈرک کی دلیلیں بہت وزنی تھیں۔ اس کے خط بھی بہت دلچسپ ہیں کیونکہ بادشاہ اور پوپ کے درمیان جو پرانی کشمکش چلی آتی تھی ۔ اس میں اب عہد جدید کے خیالات کی جھلک نظر آنے لگی ۔

فریڈرک ثانی مذہب کے معاملہ میں بہت فراخ دل تھا عرب اور یہودی فلسفی اس کے دربار میں آیا کرتے تھے کہتے ہیں کہ اسی نے عربی

اعداد اور الجبرا یورپ میں رائج کیا۔ (تمہیں یاد ہوگا کہ الجبرا ہندوستان کی ایجاد ہے) اس نے نیپلز کی یونیورسٹی بھی قائم کی اور سلارنو کی قدیم یونیورسٹی میں ایک بہت بڑی طبی درسگاہ بھی کھولی۔

فریڈرک ثانی ۱۲۱۲ء سے ۱۲۵۰ء تک برسر حکومت رہا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطنت ہوہن اشاؤفن خاندان کے ہاتھ سے نکل گئی بلکہ سچ پوچھئے تو سلطنت کا خاتمہ ہی ہوگیا۔ اٹلی خود مختار ہوگیا۔ جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور برسوں وہاں سخت بدنظمی رہی۔ ڈاکو لٹیرے بانکوں نے چاروں طرف لوٹ مار مچا رکھی تھی اور کوئی انھیں روکنے والا نہ تھا۔ مقدس رومی سلطنت کا بار اٹھانا شاہ جرمنی کے بس کی بات نہ تھی۔ انگلستان اور فرانس کا بادشاہ رفتہ رفتہ اپنی پوزیشن کو مضبوط کر رہے تھے۔ اور بڑے بڑے سرکش نوابوں کو اپنا مطیع کرتے جاتے تھے۔ اگرچہ جرمنی کا بادشاہ بھی بظاہر سب رئیسوں کا شہنشاہ تھا لیکن وہ پوپ اور اطالوی شہروں سے لڑنے میں اتنا مصروف تھا کہ اسے ان رئیسوں کی سرکوبی کرنے کی فرصت نہیں تھی۔ جرمنی کو یہ اعزاز ضرور حاصل تھا (اگر یہ کوئی اعزاز ہو) کہ ان کا بادشاہ مقدس رومی سلطنت کا شہنشاہ تھا۔ لیکن اس کی اسے کافی قیمت ادا کرنی پڑی۔ یعنی خود اس کے گھر میں نفاق بڑھ گیا اور وہ بہت کمزور ہوگیا۔ اس سے بہت پہلے کہ جرمنی متحد ہو سکے۔ انگلستان اور فرانس کے لوگ قوم بن چکے تھے۔ جرمنی میں تو سینکڑوں برس تک بے شمار چھوٹے چھوٹے فرمانروا ہوتے رہے۔ ابھی کوئی ساٹھ برس پہلے وہ متحد ہوا۔ پھر بھی یہ چھوٹے چھوٹے حکمراں باقی رہے۔ اس انبوہ کا خاتمہ تو ۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم نے کیا۔

فریڈرک ثانی کے بعد جرمنی میں بدنظمی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ تیئس برس تک شہنشاہ کا انتخاب ہی نہ ہو سکا۔ بالاخر ۱۲۷۳ء میں ہیپس برگ کا کاؤنٹ روڈلف شہنشاہ منتخب ہوا۔ اب گویا ایک نیا خاندان یعنی ہیپس برگ منظر عام پر آیا۔ یہ سلطنت کے خاتمے تک چلا اور اس کی حکومت کا آفتاب بھی جنگ عظیم کے زمانے میں غروب ہوا۔ جنگ شروع ہونے کے وقت آسٹریا ہنگری کا بادشاہ ہیپس برگ خاندان ہی کا فرد تھا۔ اس کا نام فرانسس جوزف تھا۔ وہ نہایت بوڑھا شخص تھا اور تخت پر بیٹھے اسے کوئی ساٹھ برس ہو گئے تھے۔ اسی کا بھتیجا اور ولی عہد وہ فرانز فرڈنیانڈ تھا جو ۱۹۱۴ء میں بوسینا (بلقان) میں سیراجیوو کے مقام پر اپنی بیوی کے ہمراہ قتل ہوا تھا۔ اسی قتل کی بدولت جنگ عظیم شروع ہوئی تھی۔ اس جنگ نے بہت سی چیزوں کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں ہیپس برگ کا قدیم خاندان بھی تھا۔

یہ تو ہوئی مقدس رومی سلطنت کی داستان۔ اب سنو۔ اس کے مغرب میں فرانس اور انگلستان اکثر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور اس سے زیادہ یہاں کے بادشاہ اپنے ماتحت رئیسوں سے دست و گریباں رہتے تھے۔ ان ملکوں کے بادشاہ جرمنی کے بادشاہ یا شہنشاہ کی بہ نسبت اپنے امرار کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہوئے چنانچہ انگلستان اور فرانس میں اندرونی اتحاد پیدا ہو گیا۔ اور اس اتحاد سے ان کی قوت میں بھی اضافہ ہوا۔

اسی زمانہ میں انگلستان میں ایک نہایت اہم واقعہ ہوا جو شاید تم نے پڑھا بھی ہو۔ یعنی ۱۲۱۵ء میں بادشاہ جان نے میگنا چارٹا

پر دستخط کئے۔ جان اپنے بھائی رچرڈ شیر دل کے بعد تخت پر بیٹھا۔ وہ بڑا حریص تھا لیکن اسی کے ساتھ کمزور بھی تھا۔ اس نے ہر شخص کو برافروختہ کردیا چنانچہ امرار نے اسے ٹیمس ندی کے جزیرہ رنی میڈ میں پکڑ لیا۔ اور دھمکا کر دستخط کرنے پر مجبور کیا۔ اس فرمان کی روسے، اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انگلستان کے امرار اور جمہور کے بعض حقوق کا احترام کرے گا۔ انگلستان کی سیاسی آزادی کی طویل جنگ کا یہ سب سے پہلا قدم تھا۔ اس فرمان میں یہ خاص طور پر درج تھا کہ بادشاہ شہریوں کی جائداد اور ان کی آزادی کے معاملہ میں ان کے ہمعصروں کے مشورے کے بغیر کوئی دخل نہ دے گا۔ اسی سے جیوری (Jury) کا طریقہ رائج ہوا جس میں ہمسر فیصلہ کیا کرتے ہیں گویا انگلستان میں بادشاہ کے اختیارات کی بہت جلد روک تھام ہوگئی انگلستان بادشاہ کی برتری کے نظریہ کا جو مقدس رومی سلطنت میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اس وقت بھی قائل نہ تھا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو قانون انگلستان کے لئے سات سو برس پہلے بنایا گیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ماتحت آج بھی اس پر عمل نہیں ہوتا۔ یہاں تو اب بھی ایک شخص یعنی وائسرائے کو آرڈیننس جاری کرنے۔ قوانین وضع کرنے اور لوگوں کو ہر طرح کی آزادی اور ان کی جائدادوں سے محروم کرنے کے کامل اختیارات حاصل ہیں۔

میگنا چارٹا (Magna Charta) کے بعد ہی انگلستان میں ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ یعنی رفتہ رفتہ ایک قومی مجلس عالم وجود میں آگئی جس میں مختلف دیہی اور شہری علاقوں سے سپاہی اور شہری

منتخب کرکے بھیجے جاتے تھے۔ یہ گویا انگریزی پارلیمنٹ کی ابتدا تھی اس کے بعد سپاہیوں اور شہریوں کے نمائندوں سے دارالعلوم اور امیروں اور پادریوں کے نمائندوں سے دارالامرا بنا۔ شروع شروع میں اس پارلیمنٹ کو کوئی اختیارات نہ تھے۔ اس کی طاقت تو رفتہ رفتہ بڑھی بالآخر بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان آخری معرکہ ہوا کہ کس کا بول بالا رہے۔ چنانچہ بادشاہ مارا گیا اور پارلیمنٹ کا اقتدار مسلّم ہو گیا لیکن یہ تو کوئی چار سو برس بعد یعنی سترھویں صدی میں ہوا۔

فرانس میں "تین اداروں" کے نام سے ایک مجلس قائم تھی۔ یہ ادارے امرا۔ پادری اور جمہور تھے۔ غرض کہ جب بادشاہ چاہتا تھا تو اس مجلس کا جلسہ ہوتا تھا لیکن وہ بھی کبھی کبھی۔ اس لئے انگریزی پارلیمنٹ کی طرح یہ مجلس اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی فرانس میں بھی ایک بادشاہ کی قربانی کے بعد بادشاہوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔

مشرق میں، مشرقی رومی سلطنت باقی تھی۔ وہ ابتدا ہی سے کسی نہ کسی کے ساتھ برسر جنگ رہتی تھی اور اکثر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گئی اب گئی۔ لیکن پہلے تو وہ شمالی وحشی اقوام کے ہاتھوں سے بچ گئی اور پھر مسلمانوں کے ہاتھوں سے اس سلطنت پر بہت سے حملے ہوئے مثلاً رومیوں کے، بلغاریوں کے عربوں کے سلجوقی ترکوں کے لیکن ان سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک حملہ عیسائی مجاہدوں کا ثابت ہوا۔ انھوں نے قسطنطنیہ کو تمام "منکروں" سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس خوفناک حادثہ سے سلطنت روم

اور شہر قسطنطنیہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے۔

مغربی یورپ کی دنیا مشرقی رومی سلطنت سے بالکل بے خبر تھی اُسے اس کی ذرا پروا نہ تھی۔ بلکہ مشرقی سلطنت عالم مسیحی شمار ہی نہیں ہوتی تھی۔ اُس کی زبان یونانی تھی اور مغربی یورپ کی علمی زبان لاطینی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی قسطنطنیہ میں مغرب کے مقابلہ میں علم و ادب کا زیادہ چرچا تھا۔ لیکن یہ بوڑھوں کا بے جان علم تھا جس میں کوئی تخلیقی قوت باقی نہ تھی۔ مغرب میں تھوڑا تھا مگر جوان تھا۔ اس لئے اس میں تخلیقی قوت موجود تھی اور عنقریب یہ قوت حسن کے نادر شاہکاروں کی شکل میں ظاہر ہونے والی تھی۔

مشرقی سلطنت میں روم کی طرح کلیسا اور شہنشاہ میں کشمکش نہ تھی۔ یہاں تو بادشاہ سب سے بالاتر اور بالکل مطلق العنان تھا کسی قسم کی آزادی کا نام بھی نہ تھا۔ تخت اسی کا حصّہ تھا جو سب سے زیادہ طاقتور ہو اور جسے قبیح سے قبیح فعل کے کرنے میں باک نہ ہو۔ لوگ قتل و فریب سے خونریزی اور بدکاری کے ذریعہ ہی تخت حاصل کیا کرتے تھے اور عوام بے چون وچرا ان کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا کہ کون حکومت کرتا ہے اور کون نہیں۔

یہ مشرقی سلطنت یورپ کے پھاٹک پر دربان کی حیثیت سے کھڑی تھی۔ اور ایشیا روالوں کے حملوں سے اس کی حفاظت کرتی تھی۔ سینکڑوں برس تک یہ کامیاب رہی اور عرب قسطنطنیہ پر قبضہ نہ کر سکے۔ سلجوقی ترک بھی اگرچہ اِس

کے قریب تک پہنچ گئے۔ لیکن اسے فتح نہ کر سکے۔ مُغل اس کی
بغل سے گذرتے ہوئے روس چلے گئے۔ سب سے آخر میں
عثمانی ترک آئے اور ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کا شاہی شہر۔ ان
کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اور اسی کے ساتھ مشرقی سلطنت کا بھی
خاتمہ ہوگیا۔

(۶۴)

یورپ کے شہروں کی ترقی

۲۱ر جون ۳۲ء

یورپ میں صلیبی جنگوں کا دور ایمان وعقیدے کا اور مشترک خیالات اور جذبات کا دور تھا اور اس ایمان اور امید کی بدولت لوگوں کو آئے دن کی پریشانیوں میں ایک گونہ سکون میسر آتا تھا۔ سائنس کا تو پتہ بھی نہ تھا۔ اور دوسرے علوم وفنون بھی برائے نام تھے۔ اس لئے کہ علم اور عقیدہ کا ساتھ مشکل سے ہوتا ہے۔ علم سے لوگوں میں غور وخوض کی عادت پیدا ہوتی ہے اور شک وشبہ کے ساتھ عقیدہ کا نباہ مشکل ہے۔ سائنس کی راہ تحقیق وتجربہ چاہتی ہے اور عقیدہ کی راہ دوسری ہے۔ آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ کس طرح عقیدہ کمزور ہو گیا اور شک نے سر اٹھایا۔

لیکن ابھی تو عقیدہ کا دور دورہ ہے اور رومی کلیسا ایمان والوں کی پیشوا ہے اور وہ اکثر اُن سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ہزاروں، لاکھوں عقیدتمند صلیبی جنگ کے لئے فلسطین بھیجے گئے جو وہاں سے پھر کبھی نہ پلٹے اب پوپ نے یورپ کے بعض عیسائیوں یا ان کے فرقوں کے خلاف بھی جو ہر معاملہ میں اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرتے تھے۔ صلیبی جنگوں کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ اِس کے علاوہ پوپ اور کلیسا نے لوگوں کی عقیدتمندی سے یہ ناجائز فائدہ

اُٹھایا کہ "معافیاں" اور "مراعات" جاری کرنے بلکہ بیچنے لگے۔ کلیسا کے کسی قانون یا رواج کی خلاف ورزی کرنے کی اجازت کو "معافیاں" کہتے تھے۔ گویا کلیسا نے جو قانون بنائے تھے خاص خاص صورتوں میں وہ خود ان کے توڑنے کی اجازت دینے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان قوانین کا احترام کب تک باقی رہ سکتا تھا۔ "مراعات" کی صورت ان سے بھی بدتر تھی۔ رومی کلیسا کے عقیدے کے مطابق انسان کی روح موت کے بعد اعراف میں چلی جاتی ہے۔ یہ جنت اور جہنم کا درمیانی مقام ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں جو گناہ کرتا ہے اس کی سزا پہلے یہاں بھگتنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد روح کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملتی ہے۔ چنانچہ پوپ روپیہ لے کر لوگوں سے یہ وعدہ کیا کرتا تھا کہ تم اعراف کے قیام سے بچ جاؤ گے اور سیدھے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ اسی کو "مراعات" کہتے تھے۔ گویا بھولے بھالے لوگوں کی عقیدتمندی سے کلیسا اس طرح ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ اور جرم اور گناہ کا لین دین کرتا تھا "مراعات" بیچنے کا یہ طریقہ صلیبی جنگوں کے بعد رائج ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ ایک مصیبت بن گیا۔ چنانچہ رومی کلیسا کے خلاف بغاوت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سیدھے سادے دین دار لوگ ان خرافات کو کیسے گوارا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں مذہب سب سے بڑا کاروبار اور آمدنی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ذرا مندروں کے پروہتوں کو دیکھو۔ وہ غریب پوجاریوں کو کیا

مونڈتے ہیں۔ اور ذرا گنگا کے کنارے جاکر دیکھو کہ پنڈت لوگ اس وقت تک بعض رسوم ادا نہیں کرتے جب تک بے چارے دیہاتی منہ مانگی رقم ادا نہ کردیں۔ خاندان میں چاہے کوئی تقریب ہو یعنی بچہ پیدا ہو۔ یا شادی ہو یا غمی ہو۔ پنڈت جی آ دھمکتے ہیں اور روپیہ لئے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

ہر مذہب کا یہی حال ہے۔ خواہ وہ ہندو دھرم ہو یا پارسی مذہب۔ عیسائیت ہو یا اسلام۔ ہر ایک میں عقیدتمندوں کی عقیدت سے فائدہ اُٹھاکر روپیہ کمانے کے خاص طریقے رائج ہیں۔ ہندو دھرم کے طریقے تو کافی بدنام ہیں۔ اسلام میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی خاص طبقہ نہیں مانا گیا ہے۔ اسی کی بدولت ماضی میں اسلام کے پیرو مذہبی لوٹ سے ایک حد تک محفوظ رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ایسے افراد اور طبقے پیدا ہوگئے جو اپنے آپ کو مذہب کے ماہر، عالم، مولوی ملّا وغیرہ کہتے تھے۔ اُنھوں نے سیدھے سادھے مومنوں پر اپنا اثر جما لیا اور انھیں لوٹنا شروع کر دیا۔ جہاں کہیں لمبی داڑھی یا سر کی چوٹی یا ماتھے کا ٹیکا یا فقیرانہ لباس یا سنیاسیوں کی پیلی یا گیروا کفنی تقدس کی سند ہو جائے وہاں عوام پر اثر جما لینا کیا مشکل ہے۔

اگر تم امریکہ میں جاکر دیکھو جو تمام ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے تو وہاں بھی تمہیں یہ اندازہ ہوگا کہ مذہب کمائی کا بہت بڑا ذریعہ ہے جس کا انحصار سراسر عوام کو لوٹنے پر ہے

یں یورپ کے دور وسطی یا عقیدے کے دور سے بہت دور بھٹک گیا۔ اس لئے چلو واپس چلیں۔ ہمیں نظر آرہا ہے کہ یہ عقیدہ

بہت واضح اور تخلیقی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں تعمیرات کا عظیم الشان دور شروع ہوا اور سارے مغربی یورپ میں گرجے ہی گرجے بن گئے اب ایک ایسے طرز تعمیر کی بنیاد پڑی جس کی مثال اس سے پہلے یورپ میں نظر نہیں آتی تھی۔ یعنی ایک نئی ترکیب سے بھاری چھتوں کا سارا بوجھ عمارت کے بیرونی پشتوں پر ڈال دیا گیا۔ اندر بڑے نازک ستون نظر آتے ہیں جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالائی بوجھ کو اٹھائے ہوئے ہیں ان پر ایک نوکیلی محراب ہوتی ہے جو عرب طرز تعمیر سے لی گئی ہے اور ساری عمارت کے اوپر ایک بلند مینار ہوتا ہے جو آسمان سے باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ گوتھک طرز تعمیر کہلاتا ہے۔ جس نے یورپ میں نشو و نما پائی۔ یہ نہایت خوبصورت ہے اور اس ماننے کے بڑھتے ہوئے ولولوں اور ایمان کا مظہر معلوم ہوتا ہے حقیقت میں اس دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس قسم کی عمارتیں وہی معمار اور کاری گر بنا سکتے ہیں۔ جنھیں اپنے کام کے ساتھ عشق ہو اور جو مل کر ایک بہت بڑے مقصد کے لئے کام کر رہے ہوں۔

مغربی یورپ میں اس گوتھک طرز تعمیر کا ارتقا حیرت انگیز ہے۔ اس بدنظمی۔ طوائف الملوکی۔ جہالت اور تعصب کے طوفان میں سے یہ حسین چیز پیدا ہو گئی جو دیکھنے میں ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے دعا قبولیت کے لئے آسمان کی طرف جا رہی ہو۔ فرانس شمالی اٹلی۔ جرمنی اور انگلستان میں یہ گوتھک طرز کے گرجے تقریباً ایک ہی وقت میں تعمیر ہوئے۔ اس کا علم نہیں کہ ان کی ابتدا

کیونکر ہوئی اور ان کے بنانے والے کون تھے۔ اُن سے کسی ایک صناع کی کوشش کے بجائے بحیثیت مجموعی ساری قوم کے متحدہ ارادے اور محنت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دوسری نئی چیز گرجوں کی کھڑکیوں کے شیشیوں پر نقش و نگار کا کام تھا۔ ان شیشوں پر بڑے خوبصورت رنگوں میں ایچھی سے ایچھی تصویریں بنائی جاتی تھیں اور ان میں سے چھن چھن کر روشنی پڑتی تھی تو عمارت اور زیادہ باوقار اور پُر رعب معلوم ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے حال ہی کے کسی خط میں ایشیا اور یورپ کا مقابلہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ اُس زمانہ میں یورپ کے مقابلہ میں ایشیار بہت مہذب اور متمدن تھا۔ تاہم ہندوستان میں کچھ زیادہ تخلیقی کام نہیں ہو رہا تھا حالانکہ میرے نزدیک یہی زندگی کی نشانی ہے۔ یہ گوتھک طرز تعمیر جو نیم مہذب یورپ سے پیدا ہوا اس کا ثبوت ہے کہ وہاں کافی زندگی موجود تھی۔ ان تمام مشکلات کے باوجود جو بدنظمی اور تہذیب کی کمی سے پیدا ہوئی ہیں یہ زندگی بھر کر رہی اور اس نے اپنے اظہار کے مواقع تلاش کر لئے۔ گوتھک طرز تعمیر بھی اسی قسم کا ایک اظہار تھا۔ بعد میں یہ چیز مصوری، سنگ تراشی اور مہم بازی کے شوق میں نمودار ہوئی۔

تم نے بعض گوتھک گرجے تو دیکھے ہیں۔ معلوم نہیں تمہیں یاد ہیں کہ بھول گئیں۔ تم نے جرمنی کے شہر کولون کا نہایت خوبصورت گرجا دیکھا تھا۔ اٹلی کے شہر میلان میں بھی ایک بہت ہی خوشنما گوتھک گرجا ہے۔ اسی طرح فرانس کے شہر شارترمیں بھی ہے۔ لیکن ان سب کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ اس قسم کے گرجے تو جرمنی۔ فرانس انگلستان۔ اور شمالی اٹلی کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔ لیکن یہ تعجب

ہے کہ خود روم میں کوئی مشہور گوتھک عمارت نہیں ہے۔

اس گیارھویں اور بارھویں صدی کے دور تعمیرات میں بہت سے غیر گوتھک گرجے بھی تعمیر ہوئے۔ مثلاً پیرس کا ناتردام کا عظیم الشان گرجا اور غالباً وینس کا سینٹ مارک گرجا۔ سینٹ مارک تو تم نے دیکھا ہے۔ یہ بازنطینی کی کاریگری کا نمونہ ہے اور اس میں بڑی خوبصورت پچی کاری کی گئی ہے۔

بالآخر عقیدے کے دور کا زوال شروع ہو گیا اور اُسی کے ساتھ گرجوں کی تعمیریں بھی کمی ہو گئی۔ اب لوگوں کی توجہ دوسری جانب رجوع ہونے لگی۔ یعنی کاروبار اور تجارت کی جانب یا مدنی زندگی کی جانب۔ اب گرجوں کے بجائے ٹاؤن ہال بننے لگے۔ چنانچہ پندرھویں صدی کی ابتدا میں تمام شمالی اور مغربی یورپ میں گوتھک طرز کے خوبصورت ٹاؤن ہال اور گلڈ ہال تعمیر ہوئے۔ لندن کا ایوان پارلیمنٹ بھی گوتھک طرز کے ہیں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کب بنے۔ البتہ کچھ یونہی سا خیال ہے کہ ابتدائی گوتھک عمارت جل گئی تھی۔ اس لئے گوتھک طرز ہی کی ایک دوسری عمارت اس کے بجائے تعمیر کی گئی۔

یہ بڑے بڑے گوتھک گرجے جو گیارھویں اور بارھویں صدی میں تعمیر ہوئے شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں واقع تھے۔ پرانے شہر پھر سے ترقی کر رہے تھے اور نئے نئے شہر آباد ہو رہے تھے۔ سارے یورپ میں نقشہ بدل رہا تھا۔ اور ہر جگہ شہری زندگی کو فروغ ہو رہا تھا۔ رومی سلطنت کے قدیم دور میں بحر روم کے ساحل

پر بڑے بڑے شہر ضرور تھے لیکن روم اور یونانی رومی تہذیب کے زوال کے بعد یہ سب تباہ ہو گئے۔ اس کے بعد اسپین کے علاوہ جہاں عربوں کی حکومت تھی سارے یورپ میں صرف قسطنطنیہ ہی ایک بڑا شہر رہ گیا تھا۔ ایشیا میں تو ہندوستان، چین اور عرب سلطنت میں اس وقت بڑے بڑے شہر موجود تھے لیکن یورپ ان سے بالکل محروم تھا۔ تہذیب و تمدن اور شہروں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور رومی نظام کی تباہی کے بعد یورپ میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی۔

لیکن اب پھر شہری زندگی بحال ہو رہی تھی۔ اٹلی میں خاص کر بڑے بڑے شہر قائم ہو گئے تھے جو مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے شہری حقوق کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اٹلی اور دوسرے ملکوں کے یہ شہر تجارت پیشہ اور متوسط طبقہ کی قوت کے بڑھنے کا ثبوت تھے۔

شہر وینس میں جو بحر ایڈریاٹک پر فرمانروائی کر رہا تھا آزاد جمہوریت قائم ہو چکی تھی۔ یہ آج بھی نہایت خوبصورت ہے کیونکہ اس میں بہت بیچ در بیچ نہریں بنی ہیں جن میں سمندر کا پانی آتا جاتا رہتا ہے کہتے ہیں کہ شہر آباد ہونے سے پہلے یہاں سخت دلدل تھی۔ جب اٹیلا ہن قتل و غارت کرتا ہوا اکیولیہ کے علاقہ میں داخل ہوا تو کچھ لوگ وہاں سے بھاگ کر وینس کی دلدل میں پناہ گزیں ہوئے۔ انھوں نے دلدل صاف کر کے شہر وینس آباد کیا اور چونکہ یہ شہر مشرقی اور مغربی رومی سلطنتوں کے درمیان واقع تھا اس لئے انھیں کسی نے نہ چھیڑا اور وہ برابر آزاد رہے۔ مشرق اور بالخصوص ہندوستان

کے ساتھ وینس کی تجارت ہونے لگی جس سے اس کی دولت میں اضافہ ہوا۔ پھر اس نے جہازوں کا ایک بیڑا بنالیا اور سمندر پر اس کی طاقت مسلم ہوگئی۔ یہ دولت مندوں کی جمہوریت تھی جس کا صدر ڈوجے کے لقب سے مشہور تھا۔ یہ جمہوریت اس وقت تک قائم رہی جب کہ ۱۷۹۷ء میں نپولین فاتح کی حیثیت سے وینس میں داخل ہوا۔ سنا ہے کہ اس وقت کا ڈوجے بہت بوڑھا آدمی تھا اور جس دن نپولین نے وینس کے اندر قدم رکھا اسی دن وہ گر کر مر گیا۔ یہ وینس کا آخری ڈوجے تھا۔

اٹلی کے دوسری طرف جینوا کا شہر تھا۔ یہ بھی ایک جہازراں قوم کا بہت بڑا تجارتی مرکز اور وینس کا مدمقابل تھا۔ دونوں کے درمیان میں بولونا شہر تھا جس میں یونیورسٹی قائم تھی اور ریسا، ورونہ اور فلورنس کے بڑے بڑے شہر تھے۔ فلورنس میں آگے چل کر بہت سے مشہور و معروف آرٹسٹ پیدا ہوئے اور اس کا ستارہ میڈیچی خاندان کے دور حکومت میں خوب چمکا۔ میلان شہر اٹلی کے شمال میں تھا۔ یہ بھی صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز تھا اور جنوب میں نیپلز بھی بڑھ رہا تھا۔

اب فرانس کے شہروں کا حال سنو۔ جیسے جیسے فرانس نے ترقی کی، پیرس بھی جسے ہیوکاپے نے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا بڑھتا گیا۔ پیرس کی حیثیت ہمیشہ فرانس کے قلب کی سی رہی ہے۔ دارالسلطنت تو دوسرے ملکوں کے بھی ہیں۔ لیکن پچھلے ایک ہزار برس میں کوئی بھی اپنے ملک پر اتنا حاوی نہیں رہا۔ جتنا پیرس فرانس پر حاوی

رہا ہے۔ فرانس کے دوسرے اہم شہر لیون مارسیلز (جو بہت پرانی بندرگاہ ہے) آرلیاں بورڈو اور بولون تھے۔

اٹلی کی طرح جرمنی میں بھی تیرھویں اور چودھویں صدی میں آزاد شہروں کی نشو و نما خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ ان کی آبادی بڑھنا شروع ہوئی اور جیسے جیسے ان کی قوت اور دولت میں اضافہ ہوا وہ جری ہوتے گئے اور امرار کا مقابلہ کرنے لگے۔ شہنشاہ بھی اکثر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بڑے بڑے اُمرا کا سر کچلنا چاہتے تھے۔ ان شہروں نے اپنی مدافعت کے لئے بڑے بڑے تجارتی اتحاد قائم کرلئے بعض اوقات یہ اتحاد (Confederation) جو وفاق کہلاتے تھے امرا کی متحدہ قوت سے جنگ بھی کرتے تھے۔ ان میں خاص مشہور شہر یہ تھے :۔ ہیمبرگ۔ بریمن۔ کولون فرنیک فرٹ۔ میونک۔ ڈانزگ۔ نورم برگ۔ برسلاڈ۔

ندرلینڈ میں جو اب ہالینڈ اور بلجیم کے نام سے مشہور ہیں۔ انٹورپ بروجز اور گھنٹ بڑے بڑے شہر تھے۔ یہ سب تجارتی شہر تھے جن کا کاروبار روز بروز بڑھ رہا تھا۔ انگلستان میں لندن شہر تھا تو سہی لیکن نہ وسعت کے لحاظ سے وہ براعظم کے دوسرے مشہور شہروں کے مقابلہ کا تھا اور نہ دولت و تجارت کے لحاظ سے۔ البتہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کی اہمیت علم و فضل کے مرکزوں کی حیثیت سے بڑھ رہی تھی۔ یورپ کے مشرق میں شہر وائنا تھا جو یورپ کا سب سے پرانا شہر تھا اور روس میں ماسکو۔ کیف اور نووگورود قابل ذکر تھے۔

ان میں سے اکثر نئے شہر پرانے طرز کے شاہی شہروں سے بالکل مختلف تھے۔ اب یورپ کے ان شہروں کی نشو و نما کسی بادشاہ یا شہنشاہ کی مرہون منت نہ تھی بلکہ اس کا سبب ان کی تجارتی اہمیت تھی۔ اس لئے ان کی قوت کا انحصار امرا پر نہیں بلکہ تاجر طبقے پر تھا۔ گویا یہ خالص تجارتی شہر تھے۔ یعنی ان شہروں کا ارتقا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ اوسط طبقہ زور پکڑ رہا ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ یہ اوسط طبقہ برابر زور پکڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے بادشاہ اور امرا کا کھلم کھلا مقابلہ کیا اور ان سے بہت سے اختیارات چھین لئے۔ لیکن یہ تو بہت بعد کا ذکر ہے۔

میں یہ ابھی بتا چکا ہوں کہ تہذیب اور شہروں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شہروں کی ترقی کے ساتھ ساتھ علم میں اور آزادی کے جذبے میں اضافہ ہوتا ہے۔ دیہات کے رہنے والے بہت منتشر رہتے ہیں اور عموماً بڑے توہم پرست ہوتے ہیں وہ گویا قدرت کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں سخت محنت کرتے ہیں۔ انھیں بہت کم آرام ملتا ہے اور اپنے آقاؤں کی حکم عدولی کرنے کی کبھی جرات نہیں کرتے۔ بخلاف اس کے شہر والے زیادہ تعداد میں یکجا رہتے ہیں اور انھیں مہذب زندگی بسر کرنے تعلیم حاصل کرنے اور بحث و مباحثہ۔ چھان بین اور غور و فکر کا زیادہ موقع ملتا ہے۔

چنانچہ ان شہروں میں ایک طرف تو رئیسوں کے سیاسی اقتدار کے خلاف اور دوسری طرف کلیسا کے روحانی اقتدار کے خلاف آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ یعنی عقیدے کا دور ختم ہوا اور شک کا دور شروع ہوا۔

اب پوپ اور کلیسا کے احکام کی آنکھیں بند کرکے تعمیل نہیں ہوتی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شہنشاہ فریڈرک ثانی پوپ کے ساتھ کس طرح پیش آیا۔ غرض کہ بغاوت کا یہ جذبہ برابر بڑھتا گیا۔

بارھویں صدی سے علم وفن کا نئے سرے سے چرچا شروع ہوا۔ سارے یورپ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی مشترک زبان لاطینی تھی۔ اور لوگ علم کی پیاس بجھانے کے لئے ایک یونیورسٹی سے دوسری یونیورسٹی میں آیا جایا کرتے تھے۔ اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے ۱۲۶۵ء میں اور وہاں کا دوسرا بڑا شاعر پیٹرارک ۱۳۰۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انگلستان کا سب سے پہلا بڑا شاعر چوسر کا دور آیا۔

لیکن اس علم وادب کے نشوونما سے زیادہ دلچسپ سائنس کی دھندلی سی ابتدا تھی۔ یہ تحریک یورپ میں بعد کو بہت زور پکڑ گئی تمہیں شاید خیال ہو کہ میں نے یہ بتایا تھا کہ عربوں میں بھی یہ تحریک موجود تھی اور انھوں نے کسی حد تک اسے عملی جامہ بھی پہنایا تھا۔ لیکن دورِ وسطیٰ میں یورپ بے باک تحقیق اور تجربے کے جذبہ کا پرورش پانا مشکل تھا۔ کلیسا اسے ہرگز گوارا نہیں کرتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کلیسا کی پابندیوں کے باوجود اس کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ یورپ کا سب سے پہلا شخص جس میں علمی تحقیق کا یہ جذبہ نظر آتا ہے ایک انگریز روجر بیکن تھا۔ وہ تیرھویں صدی میں آکسفورڈ میں گذرا ہے۔

(۶۵)

افغانوں کا ہندوستان پر حملہ

۲۳ر جون ۱۹۳۲ء

میرا کل کا خط نا تمام رہ گیا تھا جب میں لکھنے بیٹھا تو جیل اور اس کی فضا کو بالکل بھول گیا اور تصور کے صبا رفتار گھوڑے پر بیٹھ دور وسطیٰ کی دنیا میں پہنچ گیا۔ لیکن اس سے زیادہ تیزی سے مجھے موجودہ زمانہ میں کھینچ لایا گیا۔ اور یہ احساس کرایا گیا کہ یہ جیل ہے۔ اس سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ اوپر سے یہ احکام آ گئے ہیں کہ ایک مہینے کے لئے تمہاری ممی اور دداجی[1] سے میں ملاقات نہیں کر سکتا۔ آخر کیوں؟ یہ مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔ ایک قیدی کو بھلا وجہ کیوں بتائی جانے لگی۔ یہ دونوں ملاقات کے انتظار میں دس دن سے دہرہ دون میں ٹھہری ہوئی تھیں اب ان کا انتظار اکارت گیا اور انھیں واپس جانا پڑے گا۔ یہ برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ خیر اس کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ جس کام کا ہم نے بیڑہ اٹھایا ہے اس میں یہ سب کچھ تو بھگتنا ہی ہے اور ہم کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ جیل، جیل ہی ہے۔

اس طرح جھنجھوڑے جانے کے بعد میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ حال کو بھول کر ماضی کا رخ کر سکوں۔ لیکن رات کو آرام کرنے کے بعد آج کچھ طبیعت بحال ہے۔ اس لئے میں نئے سرے سے شروع

---

[1] اندرا کی دادی۔

کرتا ہوں

ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا اس لئے اب ہم یہیں واپس آئیں گے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ اس وقت یہاں کیا ہو رہا تھا جب یورپ دور وسطیٰ کی تاریکی میں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جب وہاں کے باشندے جاگیرداری نظام کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے اور عام بدنظمی اور بدعلمی کا شکار ہو رہے تھے۔ جب پوپ اور شہنشاہ ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کر رہے تھے اور یورپ کے ملک عالم وجود میں آتے جا رہے تھے اور جب صلیبی جنگوں کے زمانے میں برتری کے لئے عیسائیت اور اسلام میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔

دور وسطیٰ کے اوائل میں ہندوستان کی ایک جھلک تو ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ بھی ہم نے دیکھا کہ سلطان محمود غزنوی نے شمال و مغرب کی جانب سے شمالی ہند کے زرخیز میدانوں پر حملہ کیا اور بہت غارتگری کی اگرچہ محمود کے حملے بہت خوفناک تھے لیکن ان سے ہندوستان میں کوئی زبردست یا دیرپا انقلاب نہیں ہوا۔ ان سے ملک کو، خاص کر شمالی ہند کو سخت دھچکا لگا اور بہت سی اچھی اچھی یادگاریں اور عمارتیں برباد ہو گئیں لیکن غزنی کی سلطنت کا قبضہ صرف پنجاب کے کچھ حصہ اور سندھ پر رہا۔ شمالی ہند کا باقی حصہ بہت جلد سنبھل گیا۔ رہا بنگال اور جنوبی ہند تو وہاں تک محمود پہنچا ہی نہیں۔ محمود کے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد تک پھر نہ تو کوئی اسلامی فتوحات ہوئیں اور نہ ہندوستان میں اسلام نے کچھ ترقی کی۔

البتہ بارھویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۱۹۰ء کے قریب شمال و

مغرب سے حملہ کا ایک نیا طوفان اٹھا۔ افغانستان میں ایک سردار پیدا ہوا جس نے غزنی پر قبضہ کرکے سلطنت غزنی کا خاتمہ کر دیا۔ وہ شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے۔ غور افغانستان میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے غوری نے پہلے لاہور پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا پھر وہ دہلی کی طرف بڑھا اس وقت دہلی میں پرتھوراج چوہان راجہ تھا۔ اس کی سرگردگی میں شمالی ہند کے بہت سے راجوں نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست فاش دی۔ لیکن یہ محض چند روزہ ثابت ہوئی اگلے سال شہاب الدین زیادہ لشکر لے کر آیا اور اس مرتبہ اس نے پرتھوی راج کو شکست دے دی اور اسے قتل کر ڈالا۔

پرتھوی راج اب بھی بہت ہر دلعزیز ہے اور ہندوستان کا سورما مانا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق بہت سے افسانے اور گیت مشہور ہیں۔ ان میں سب سے مشہور وہ گیت ہے جس میں قنوج کے راجہ جے چند کی بیٹی کو لے کر فرار ہونے کا تذکرہ ہے۔ لیکن اس حرکت کی اسے بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ یعنی اسے اپنے بہادر سے بہادر رفیقوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور ایک طاقتور راجہ اس کا دشمن ہو گیا۔ اس واقعہ نے باہمی اختلاف اور رنجش کا بیج بو دیا۔ جس کی وجہ سے حملہ آور کے لئے فتح حاصل کرنا آسان ہو گیا۔

غرض سنہ ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین نے وہ سب سے پہلی عظیم الشان فتح حاصل کی جس کے بعد ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مسلمان مشرق اور جنوب کی جانب بڑھتے گئے اگلے ڈیڑھ سو برس میں یعنی سنہ ۱۳۲۱ء تک جنوبی ہند کے بیشتر حصے میں

کرتا ہوں

ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا اس لئے اب ہم یہیں واپس آئیں گے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ اس وقت یہاں کیا ہو رہا تھا جب یورپ دور وسطیٰ کی تاریکی میں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جب اس کے باشندے جاگیرداری نظام کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے اور عام بدنظمی اور بدعلمی کا شکار ہو رہے تھے۔ جب پوپ اور شہنشاہ ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کر رہے تھے اور یورپ کے ملک عالمِ وجود میں آتے جا رہے تھے اور جب صلیبی جنگوں کے زمانے میں برتری کے لئے عیسائیت اور اسلام میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔

دور وسطیٰ کے اوائل میں ہندوستان کی ایک جھلک تو ہم دیکھ چکے ہیں۔ یہ بھی ہم نے دیکھا کہ سلطان محمود غزنوی نے شمال و مغرب کی جانب سے شمالی ہند کے زرخیز میدانوں پر حملہ کیا اور بہت غارتگری کی اگرچہ محمود کے حملے بہت خوفناک تھے لیکن ان سے ہندوستان میں کوئی زبردست یا دیرپا انقلاب نہیں ہوا، ان سے ملک کو، خاص کر شمالی ہند کو سخت دھچکا لگا اور بہت سی اچھی یادگاریں اور عمارتیں برباد ہو گئیں لیکن غزنی کی سلطنت کا قبضہ صرف پنجاب کے کچھ حصہ اور سندھ پر رہا۔ شمالی ہند کا باقی حصہ بہت جلد سنبھل گیا۔ رہا بنگال اور جنوبی ہند تو وہاں تک محمود پہنچا ہی نہیں۔ محمود کے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد تک پھر نہ تو کوئی اسلامی فتوحات ہوئیں اور نہ ہندوستان میں اسلام نے کچھ ترقی کی۔

البتہ بارھویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۱۹۰ء کے قریب شمال غ

اور چاروں طرف دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے جن کے متعلق یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ وہ نہ جانے کب بغاوت کردیں۔ بغاوت کا خوف انھیں ہر وقت دامنگیر رہتا ہوگا اور خوف عموماً تشدد اور قہر کی صورت اختیار کرتا ہی ہے۔ چنانچہ لوگوں کو دبانے کے لئے خونریزی بھی کی گئی۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسلمان ہندوؤں کو مذہبی تعصب کی وجہ سے قتل کرتے تھے بلکہ صورت یہ تھی کہ ایک پردیسی فاتح مفتوح قوم کو کچل رہا تھا کہ اُسے پھر سر اُٹھانے کی ہمت نہ ہو۔ ہمیشہ مذہب کو ان مظالم کی وجہ بتایا جاتا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے مانا کہ کبھی کبھی مذہب کا بہانا بھی کیا گیا۔ لیکن اصلی سبب سیاسی یا سماجی تھے۔ وسطی ایشیا کی قومیں جنھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا خود اپنے وطن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی ایسی ہی تندخو اور بے رحم تھیں۔ ایک نیا ملک فتح کرنے کے بعد اسے اپنے قابو میں رکھنے کا انھیں صرف ایک ہی طریقہ معلوم تھا یعنی تخویف سے کام لینا۔

رفتہ رفتہ ہندوستان نے ان تند مزاج جنگجو لوگوں کو ٹھنڈا کرکے رام کرلیا۔ اور انھیں مہذب بنا دیا۔ پھر وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ بھی ہندوستانی ہی ہیں۔ بدیشی حملہ آور نہیں ہیں۔ انھوں نے یہاں کی عورتوں کے ساتھ شادیاں کرنا شروع کردیں اور رفتہ رفتہ فاتح اور مفتوح کا فرق کم ہوگیا۔

یہ بات تم بڑی دلچسپی سے سنوگی کہ محمود غزنوی کے پاس جس نے شمالی ہند میں سب سے زیادہ غارتگری کی اور جو "بت پرستوں" کے مقابلہ میں اسلام کا سب سے بڑا سورما کہا جاتا ہے۔ تلک نامی

اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد وہاں اس کے پاؤں اکھڑنے لگے اب نئی نئی ریاستیں نمودار ہوئیں جن میں کچھ مسلمان تھیں اور کچھ ہندو۔ ان میں سب سے مشہور وجیانگر کی ہندو سلطنت تھی۔ اُس وقت تک ایک حد تک اسلام کا اقتدار کم ہو گیا اور یہ صورت کوئی دو سو برس تک جاری رہی۔ پھر جب سولھویں صدی کے وسط میں اکبر اعظم نے عنان حکومت سنبھالی تو ایک بار پھر تقریباً سارے ہندوستان میں اسلام کا پرچم لہرایا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے حملوں کا ردعمل بہت سی شکلوں میں ظاہر ہوا۔ ملحوظ رہے کہ یہ حملے افغانیوں نے کئے تھے۔ نہ کہ عربوں ایرانیوں یا مغربی ایشیاء کے متمدن اور مہذب مسلمانوں نے۔ تہذیب کے معاملے میں یہ افغانی ہندوستانیوں سے بہت پیچھے تھے لیکن ان میں جوش عمل موجود تھا اور اُس زمانے کے ہندوستانیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جان دار تھے۔ ہندوستانی تو لکیر کے فقیر بن کر رہ گئے تھے۔ ان میں تبدیلی یا ترقی کے آثار بالکل مفقود ہو گئے تھے وہ پرانے طریقوں کے پابند تھے اور ان کو بدلنے یا سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے تھے۔ فن حرب میں بھی ہندوستان بہت پیچھے تھا اور افغانی بہت زیادہ منظم تھے۔ اس لئے جرات و قربانی کے باوجود قدیم ہندوستان کو مسلم حملہ آوروں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔

شروع شروع میں یہ مسلمان بہت تند خو اور جابر تھے وہ ایک ایسے سخت ملک سے آئے تھے جہاں "نرمی" کی کوئی قدر نہ تھی۔ مزید براں یہ وجہ بھی تھی کہ وہ ایک نئے مفتوحہ ملک میں تھے

گروہ جنوبی ہند چلے گئے۔ اس سے جنوب کی آریہ تہذیب کو بڑی تقویت پہنچی

جنوب کا کچھ حال تو میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چھٹی صدی کے وسط سے دو برس تک جنوبی ہند کے مغربی اور وسطی علاقے میں (یعنی مہاراشٹر میں) چلوکیہ سلطنت کا اقتدار رہا۔ ہیون سانگ بھی پولاکیشن ثانی سے ملا تھا جو اس وقت یہاں کا راجہ تھا۔ اس کے بعد راشٹر کوٹ آئے جنھوں نے چلوکیہ خاندان کو شکست دی اور پھر کوئی دو سو برس تک یعنی آٹھویں صدی سے دسویں صدی کے آخر تک جنوبی ہند میں ان کی حکمرانی رہی۔ ان راشٹر کوٹوں کے سندھ کے عربوں سے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ بہت سے تاجر اور سیاح یہاں آئے ان میں سے ایک سیاح نے تو اپنا سفر نامہ بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس زمانہ کا (یعنی نویں صدی کا) راشٹر کوٹ راجہ دنیا کے چار بڑے شہنشاہوں میں سے ہے۔ اس کی رائے میں باقی تین خلیفہ بغداد شہنشاہ چین اور قیصر روم (یعنی قسطنطنیہ کا بادشاہ) تھے۔ یہ بہت دلچسپ چیز ہے۔ کیونکہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ایشیا کے لوگوں کی عام رائے کیا تھی۔ ایک عرب سیاح نے راشٹر کوٹوں کی سلطنت کا اس زمانہ میں جب کہ بغداد کا اقتدار اور شان و شوکت عروج پر تھی۔ خلیفہ کی سلطنت سے مقابلہ کیا تو اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ مہاراشٹر کی یہ سلطنت بہت بردست اور طاقتور ہوگی۔

دسویں صدی میں یعنی ۹۷۳ء میں چلوکیہ خاندان نے راشٹر کوٹوں

سے پھر سلطنت چھین لی۔ اور یہ پھر کوئی دو سو برس تک (یعنی ۱۱۹۰ء تک برسراقتدار رہا۔ چلوکیہ خاندان کے ایک راجہ کے متعلق ایک بہت بڑی نظم بھی موجود ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی رانی نے اسے عام سوئمبر میں پسند کیا تھا۔ گویا اُس زمانے تک آریوں کی یہ قدیم رسم باقی تھی۔

آگے بڑھ کر جنوب و مشرق میں تامل دیس تھا۔ یہاں تیسری صدی سے نویں صدی تک یعنی کوئی ۶ سو برس تک پلّووں کی حکومت رہی۔ اس مدت میں چھٹی صدی کے وسط سے دو سو برس تک سارے جنوبی ہندپر ان کی حکمرانی رہی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ انہی پلّووں نے ملیشیا اور مشرقی جزائر میں نوآبادیاں قائم کی تھیں۔ پالو سلطنت کی راجدھانی کانچی یا کانچی ورم تھی۔ اس وقت یہ بہت خوبصورت شہر تھا۔ اور اب بھی یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس قدر سلیقے سے بسایا گیا ہے۔

دسویں صدی کے شروع میں اولوالعزم چولا خاندان نے پلّووں کی جگہ لے لی۔ میں چولا سلطنت کے راجہ رج راج اور راجیندر کا تذکرہ کرچکا ہوں کہ انھوں نے عظیم الشان بحری بیڑے بنائے تھے اور لنکا، برما اور بنگال کو فتح کیا تھا۔ اس سے زیادہ دلچسپ یہ چیز ہے کہ ان کے یہاں گاؤں کی پنچایتیں منتخب ہوتی تھیں۔ انتخاب کا یہ نظام نیچے سے شروع ہوکر اوپر تک چلا گیا تھا گاؤں کی پنچایتیں مختلف کمیٹیاں منتخب کرتی تھیں جو مختلف کاموں کی نگرانی کرتی تھیں اس کے علاوہ وہ ضلع کی پنچایتیں بھی منتخب کرتی تھیں۔ پھر بہت سے ضلعوں سے ایک صوبہ بن جاتا تھا۔ میں نے بارہا ان خطوں میں گاؤں کی پنچایتی نظام کے ذکر پر زور دیا ہے کیونکہ یہ قدیم آریہ نظم ونسق کی روح رواں تھا

جس وقت شمالی ہند پر افغانوں کا حملہ ہوا اس وقت جنوبی ہند میں چولا خاندان کی حکومت تھی۔ لیکن بہت جلد اس کا زوال شروع ہو گیا اور چھوٹی سی سلطنت جو اس کی ماتحت تھی خود مختار ہو کر طاقت پکڑ گئی۔ یہ پانڈیہ سلطنت تھی جس کی راجدھانی مدورا اور بندرگاہ کائل تھی۔ وینس کا ایک مشہور سیاح مارکو پولو دو مرتبہ کائل آیا تھا ایک تو ۱۲۸۸ء میں اور پھر ۱۲۹۳ء میں آگے چل کر ہم اس کا کچھ اور بھی ذکر کریں گے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ یہ بہت بڑا اور شاندار شہر تھا۔ جہاں عرب اور چین کے بہت سے جہاز ہر وقت کھڑے رہتے تھے اور کاروبار کی خوب چہل پہل تھی۔ مارکو خود بھی چین سے جہاز پر آیا تھا۔

مارکو نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل پر ایسی باریک و نفیس ململ تیار ہوتی تھی جیسے مکڑی کا جالا۔ وہ لکھتا ہے کہ تلنگی ملک میں یعنی مدراس کے شمال میں مشرقی ساحل پر رانی اودرامبی دیوی برسر حکومت تھی۔ اس دیوی نے کوئی چالیس برس تک حکومت کی مارکو نے اس کی نہایت تعریف کی ہے۔

مارکو کے ذریعہ سے جو دلچسپ باتیں ہمیں معلوم ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جنوبی ہند میں عرب اور ایران سے سمندر کے راستہ سے کافی تعداد میں گھوڑے بھی آتے تھے۔ کیونکہ خود جنوبی ہند کی آب و ہوا گھوڑوں کی افزائش نسل کے لئے موافق نہ تھی لوگوں کا خیال ہے کہ میدان جنگ میں مسلمان حملہ آوروں کے زیادہ کامیاب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پاس بہترین گھوڑے

تھے۔ کیونکہ ایشیا میں جہاں سب سے اچھے گھوڑے پیدا ہوتے تھے وہ ملک انہی کے قبضے میں تھے۔

غرض کہ چولا سلطنت کے زوال کے بعد تیرہویں صدی میں تامل علاقے میں پانڈیہ سلطنت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ چودھویں صدی کے شروع میں یعنی ۱۳۱۰ء میں اسلامی حملے کی ضرب جنوب پر بھی پڑی اور پانڈیہ سلطنت پر اس کا وار اتنا کاری پڑا کہ وہ بہت جلد ختم ہو گئی۔

میں نے اس خط میں جنوبی ہند کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی اور جو کچھ میں پہلے کہہ چکا تھا شاید اسی کو دہرا دیا۔ بات یہ ہے کہ یہاں کی تاریخ بہت الجھی ہوئی ہے اور لوگ تلگو۔ چلوکیہ اور چولا کو گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ تاہم اگر بحیثیت مجموعی تم اس پر نظر ڈالو تو یہ ممکن ہے کہ اس کا ایک سطحی خاکہ اپنے ذہن میں ترتیب دے سکو۔ تمہیں خیال ہوگا کہ انتہائی جنوب میں ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے علاوہ اشوک کی حکومت سارے ہندوستان پر اور افغانستان اور وسطی ایشیا کے کچھ حصہ پر بھی تھی۔ اس کے بعد جنوب میں آندھرا سلطنت کا عروج ہوا جو سارے دکن میں پھیلی ہوئی تھی اور کوئی چار سو برس تک باقی رہی۔ اسی زمانہ میں شمال میں کشنوں کی سرحدی سلطنت قائم تھی۔ جب آندھرا کی تلنگی سلطنت کا زوال ہوا تو مشرقی ساحل اور جنوب میں پلووں کی تامل سلطنت قائم ہوئی اور ایک عرصہ تک وہ برسر اقتدار رہے۔ انھیں نے ملیشیا میں نوآبادیاں قائم کیں۔ کوئی چھ سو برس کی حکومت کے بعد انھوں نے چولوں کے لئے جگہ خالی کر دی۔

چولا سلطنت نے دور دراز ملک فتح کئے اور اپنے بیڑوں سے سارے سمندر چھان مارے۔ تین سو برس بعد وہ بھی میدان سے ہٹ گئے۔ اور پانڈیہ سلطنت نے زور پکڑا۔ ان کے زمانے میں مدورا تہذیب و تمدن کا مرکز تھا اور کائل نہایت مصروف اور زبردست بندرگاہ تھی۔ جس کا سلسلہ آمد و رفت دور دور کے ملکوں سے تھا۔

یہ تو ہوا جنوب اور مشرق کا حال۔ مغرب کی طرف مہاراشٹر کے علاقے میں پہلے چلوکیہ خاندان کی حکومت تھی۔ پھر راشٹر کوٹ آئے۔ اس کے بعد دوبارہ چلوکیہ خاندان قابض ہو گیا۔

کہنے کو تو یہ محض نام ہیں لیکن ذرا ان کے طویل دورِ حکومت پر غور کرو۔ اور تہذیب کے ان اعلیٰ مدارج کو دیکھو جو انھوں نے طے کئے تھے تو تمہیں یہ اندازہ ہو گا کہ ان کے اندر کوئی ایسی قوت ضرور موجود تھی جس کی وجہ سے یورپ کی سلطنتوں سے کہیں زیادہ انھیں استقلال و استحکام نصیب ہوا اور وہاں سے کہیں زیادہ ان کے یہاں امن و سکون رہا۔ لیکن اب سماجی نظام اپنے دن پورے کر چکا تھا اور استحکام ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے جب چودھویں صدی میں مسلم فوجیں جنوب کی طرف بڑھیں تو جلد ساری عمارت بیٹھ گئی۔

(۶۶)

دہلی کے غلام بادشاہ

۲۴ جون ۱۹۳۲ء

میں نے سلطان محمود غزنوی کا ذکر کیا اور فردوسی شاعر کا بھی ذکر کیا جس نے محمود کی فرمائش پر فارسی میں شاہنامہ لکھا تھا۔ لیکن محمود کے زمانے کے ایک دوسرے ممتاز شخص کا کوئی ذکر نہیں آیا جو اس کے ساتھ پنجاب آیا تھا۔ اس کا نام البیرونی تھا وہ بہت بڑا عالم و فاضل تھا اور اس زمانے کے تند خو اور متعصب سپاہیوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اس نئے ملک اور اس کے باشندوں کو سمجھنے کی انتہائی کوشش کی وہ ہندوستان کے طرزِ خیال کو سمجھنے کا اتنا مشتاق تھا کہ اس نے سنسکرت سیکھی اور اپنے طور پر ہندوؤں کی خاص خاص کتابیں پڑھیں۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان کے فلسفہ کا اور ان علوم و فنون کا جو یہاں سکھائے جاتے تھے اچھی طرح مطالعہ کیا۔ بھگوت گیتا سے تو اُسے خاص شغف تھا۔ وہ جنوب میں چولا سلطنت میں بھی گیا اور ان کا آبپاشی کا عظیم الشان نظام دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے ہندوستان کے سفرنامہ کا شمار آج بھی دنیا کے مشہور سفرناموں میں ہوتا ہے۔ قتل و غارت اور تعصب کی افراتفری میں وہ اُس ثابت قدم طالب علم کی حیثیت سے نمایاں نظر آتا ہے۔ جو ہر چیز کو غور سے دیکھتا اور

یکھتا ہے اور حق کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

شہاب الدین افغانی کے بعد جس نے پرتھوی راج کو شکست دی تھی دہلی میں بہت سے سلطان ہوئے۔ یہ غلام بادشاہ کہلاتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا قطب الدین تھا۔ یہ شہاب الدین کا غلام تھا۔ چونکہ مسلمانوں میں غلام بھی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو سکتے تھے۔ اس لئے وہ دہلی کا سب سے پہلا سلطان ہو گیا۔ اس کے بعد کے چند بادشاہ بھی دراصل غلام ہی تھے۔ اس لئے یہ سلسلہ غلامان کہلاتا ہے۔ یہ سب خاصے تند خو تھے۔ چنانچہ فتوحات اور غارتگری کے ساتھ ساتھ تخویف بھی جاری تھی۔ وہ عمارتیں بنانے کے بڑے دلدادہ تھے اور بڑی بڑی عمارتیں پسند کرتے تھے۔ چنانچہ قطب الدین نے قطب مینار کی بنیاد ڈالی۔ یہ وہ عظیم الشان مینار ہے جو دہلی کے قریب ہی واقع ہے اور جس سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ اس کے جانشین التمش نے اس مینار کو مکمل کیا اور چند خوبصورت محرابیں بھی تعمیر کیں جو اب تک باقی ہیں۔ ان عمارتوں میں جو سامان لگا ہے وہ سب قدیم ہندوستانی عمارتوں سے، خاص کر مندروں سے لیا گیا تھا۔ کاریگر سب ہندوستانی ہی تھے لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مسلمانوں کے جدید طرز تعمیر سے وہ بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے۔

محمود غزنوی اور اس کے بعد کا ہر حملہ آور اپنے ساتھ بہت سے ہندوستانی کاریگر اور معمار لے جایا کرتا تھا اس طرح ہندوستانی طرز تعمیر وسطی ایشیا میں بھی پھیل گیا

افغانوں نے بہار اور بنگال کو سب سے زیادہ آسانی سے

فتح کر لیا۔ دراصل افغانی بڑے دلیر تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو اچانک جا لیتے تھے۔ یہ ترکیب اکثر کامیاب ہوتی ہے۔ بنگال کی یہ فتح قریب قریب اتنی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے جتنی امریکہ میں کورٹش اور پزآرو کی فتوحات۔

التتمش کے دور حکومت میں (سنہ ۱۲۱۱ء تا سنہ ۱۲۳۶ء) ہندوستان کی سرحد پر ایک خوفناک بادل گھر کر آیا۔ یہ چنگیز خاں کی سرکردگی میں مغلوں کا حملہ تھا وہ ایک فوج کا پیچھا کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے تک چلا آیا لیکن یہاں آ کر وہ رک گیا اور ہندوستان اس آفت سے بال بال بچ گیا۔ پھر کوئی دو سو برس بعد اسی کی قوم کا ایک دوسرا شخص تیمور ہندوستان میں قتل و غارت کرتا ہوا آیا۔ پہلی مرتبہ اگرچہ چنگیز خاں ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس کے بعد مغل برابر حملے کرتے رہے اور اکثر لاہور تک پہنچ گئے۔ ان کا ایسا خوف طاری ہو گیا تھا کہ وہ دہلی کے سلطانوں کو بھی دھمکانے لگے اور بعض اوقات انھوں نے رشوت دے کر پیچھا چھڑایا۔ ان میں سے ہزاروں پنجاب میں آباد بھی ہو گئے۔

سلطانوں میں ایک عورت رضیہ بھی گذری ہے۔ وہ التتمش کی بیٹی تھی۔ وہ بڑی بہادر اور قابل عورت تھی۔ لیکن ایک طرف تو اس کے تند خو افغان عہدہ داروں نے اسے چین نہ لینے دیا۔ اور دوسری طرف ان سے زیادہ تند خو مغل پنجاب پر حملے کر رہے تھے۔

غلام بادشاہوں کا دور حکومت سنہ ۱۲۹۰ء میں ختم ہو گیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد علاؤ الدین خلجی بادشاہ ہوا۔ اُس نے

اپنے چچا کو جو اس کا خسر بھی تھا قتل کر کے تخت حاصل کیا تھا۔ پھر اس کی تکمیل اس طرح کی کہ ان تمام مسلم امرا کو جن پر اُسے بیوفائی کا شک تھا ایک سرے سے قتل کرا دیا۔ اس کے بعد چونکہ اُسے مغلوں سے بغاوت کا اندیشہ تھا اس لئے حکم دے دیا کہ ایک ایک مغل چن چن کر قتل کر دیا جائے تاکہ "ان میں کا ایک فرد بھی دنیا کے پردے پر باقی نہ رہے"۔ چنانچہ کوئی بیس تیس ہزار مغل موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ جن میں سے اکثر بالکل بے گناہ تھے۔

قتل و غارت کا بار بار تذکرہ کرنا غالباً کچھ خوشگوار نہ ہوگا۔ اور تاریخ کے وسیع نقطۂ نظر سے ان کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ اندازہ کرنے میں ان سے ضرور مدد ملتی ہے کہ اسوقت شمالی ہند میں امن یا تہذیب کا نام بھی نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بربریت کا زمانہ پھر پلٹ آیا ہے۔ اگرچہ اسلام ہندوستان میں ترقی کے کچھ عناصر ضرور لایا لیکن اس کے ساتھ مسلمان افغانی بربریت کے کچھ عناصر بھی لائے۔ اکثر لوگ ان دونوں کو گڈمڈ کر دیتے ہیں حالانکہ انھیں امتیاز کرنا چاہیے۔

علاؤ الدین بھی دوسروں کی طرح متعصب تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ وسطی ایشیا کے ان ہندوستانی حکمرانوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اب وہ ہندوستان کو اپنا گھر سمجھنے لگے تھے۔ اور یہاں پردیسیوں کی طرح نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ علاؤ الدین اور اس کے بیٹے دونوں نے ہندو عورتوں سے شادی کی۔

علاؤ الدین کے زمانہ میں یہ کوشش کی گئی کہ حکومت کا

نظم و نسق کسی نہ کسی حد تک معقول ہو جائے۔ خاص طور پر سڑکیں فوج کی آمد و رفت کے لئے اچھی حالت میں رکھی جاتی تھیں اور فوج کی جانب علاؤالدین کی خاص توجہ تھی اس نے فوج کو بہت مضبوط کر لیا۔ پھر اس کی مدد سے اس نے گجرات اور جنوبی ہند کا بہت بڑا علاقہ فتح کیا۔ اس کا سپہ سالار جنوب سے بے شمار مال غنیمت لے کر آیا تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ وہ پچاس ہزار من سونا۔ بہت سے جواہرات اور موتی بیس ہزار گھوڑے اور تین سو بارہ ہاتھی لایا تھا۔

چتوڑ اس وقت ارمان اور شجاعت کا گھر اور جرات و ہمت کا خزانہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود پرانے انداز کا پیرو اور فرسودہ طریقۂ جنگ پر کاربند تھا۔ علاؤالدین کی طاقتور فوج نے اسے بھی فتح کر لیا۔ ۱۳۰۳ء میں چتوڑ فتح ہوا اور لوٹا گیا لیکن اس سے پہلے ہی قلعہ کے تمام مرد اور عورتیں پرانے رواج کے مطابق "جوہر" کی خوفناک رسم ادا کر چکے تھے۔ "جوہر" سے یہ مراد ہے کہ جب شکست یقینی ہو جائے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آئے تو بالکل آخری صورت یہ اختیار کی جاتی ہے کہ مرد تو تلوار لے کر میدان میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور لڑ کر جان دیدیتے ہیں اور عورتیں چتا میں جل مرتی ہیں۔ یہ بڑا خوفناک کام تھا، خاص کر عورتوں کے لئے میرے نزدیک تو یہ بہتر تھا کہ عورتیں بھی تلوار لے کر نکل کھڑی ہوتیں اور میدان جنگ میں لڑتے بھڑتے مر جاتیں۔ بہر حال اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ غلامی اور ذلت کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کی جنگ کا لازمی نتیجہ تھا۔ موت کو ترجیح دیتے تھے۔

اس عرصہ میں یہاں کے باشندے یعنی ہندو آہستہ آہستہ مسلمان ہو رہے تھے۔ اس کی رفتار بہت تیز نہ تھی بعض کو تو اسلام سچ مچ اچھا معلوم ہوا۔ لیکن بعضوں نے خوف کی وجہ سے اپنا مذہب تبدیل کیا اور بعضوں نے محض اس وجہ سے کہ لوگ جس کا پلہ بھاری دیکھتے ہیں فطرتاً اسی کی طرف ہو جاتے ہیں لیکن تبدیلی مذہب کا اصل سبب اقتصادی تھا۔ یعنی غیر مسلموں کو جزیہ دینا پڑتا تھا۔ غریبوں کے لئے یہ بار ناقابل برداشت تھا۔ اس لئے بہتوں نے محض اس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب تبدیل کر دیا۔ اعلیٰ طبقوں کے تبدیلی مذہب کی یہ وجہ تھی کہ وہ بادشاہ کی خوشنودی اور بڑے بڑے عہدے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ علاؤالدین کا زبردست سپہ سالار ملک کافور جس نے دکن فتح کیا ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔

دہلی کے ایک سلطان محمدؐ بن تغلق کا میں اور ذکر کر دوں گا جو نہایت ہی عجیب و غریب شخص تھا۔ وہ عربی اور فارسی دونوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس کا فلسفے اور منطق کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا اور وہ یونانی فلسفہ کا بھی ماہر تھا۔ اس کے علاوہ، وہ تھوڑی بہت ریاضی۔ سائنس اور طب بھی جانتا تھا۔ وہ بڑا بہادر تھا۔ گویا وہ اپنے زمانہ میں علم و فضل کا بھی مجسمہ اور عجوبۂ روزگار تھا۔ لیکن ! —— اس کے ساتھ وہ جبر و تشدد کا دیو بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں کچھ خبط تھا۔ وہ اپنے باپ کو قتل کر کے بادشاہ بنا تھا۔ اس کے دماغ میں یہ خبط سما گیا تھا کہ ایران اور چین کو فتح کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس

میں اسے ناکامی ہوئی۔ لیکن اس کی سب سے مشہور حرکت یہ تھی کہ اُس نے اپنے دارالسلطنت دہلی کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ بعض شہر والوں نے اس کی پالسی پر گمنام اشتہاروں کے ذریعہ سے نکتہ چینی کی تھی۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا کہ سارا شہر، دہلی سے دیوگری منتقل ہو جائے اب یہ مقام ریاست حیدر آباد میں شامل ہے اور اس نے اس کا نام دولت آباد رکھا تھا۔ مالکان مکان کو کچھ معاوضہ بھی دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ بلا استثنا ہر شخص تین دن میں دہلی خالی کر دے۔

چنانچہ زیادہ تر باشندے حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گئے۔ کچھ ادھر اُدھر چھپ رہے۔ لیکن جب وہ پکڑے گئے تو انھیں سخت سزائیں دی گئیں۔ ان میں ایک اندھا اور ایک مفلوج بھی تھا۔ دلی کے دولت آباد تک چالیس دن کا راستہ تھا۔ ذرا خیال تو کرو کہ اس سفر میں ان لوگوں کی کیا بری گت ہوئی ہوگی۔ کتنے ہی تو راستہ میں ختم ہو گئے ہونگے۔

اور دلی شہر کا کیا حشر ہوا؟ دو سال بعد جب محمد بن تغلق نے اسے پھر آباد کرنا چاہا تو وہ کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ وہ اسے پہلے (بقول ایک چشم دید گواہ کے) "بالکل ویران کر چکا تھا کسی باغ کو اجاڑنا تو بہت آسان ہے لیکن اس ویرانے میں پھر چمن لگانا بہت مشکل ہے۔ افریقہ کا ایک عرب سیاح ابن بطوطہ اس سفر میں سلطان کے ہمرکاب تھا۔ دلی پہنچ کر وہ لکھتا ہے کہ "اس کا شمار دنیا کے بڑے سے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ جب ہم اس دارالسلطنت میں داخل ہوئے تو ہم نے اسے بالکل ویران پایا۔ سارے باشندے اسے خالی کر کے چلے گئے تھے۔ صرف معدودے چند متنفس آباد تھے۔" ایک دوسرا

شخص بیان کرتا ہے کہ یہ شہر جو آٹھ یا دس میل میں آباد تھا۔ اب بالکل برباد ہو گیا تھا۔ یہ بربادی اتنی مکمل تھی کہ شہر کی عمارتیں یا محلوں میں گلیوں یا سڑکوں پر کوئی کتا یا بلی تک بھی نظر نہیں آتی تھی۔

یہ شخص پورے پچیس برس تک یعنی سنہ ۱۳۵۱ء تک حکومت کرتا رہا۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کس طرح اپنے حکمرانوں کا ظلم و تشدد اور نااہلیت برداشت کر سکتے ہیں۔ اگرچہ محمد تغلق کی رعایا نے اس کے احکام کی بے چون وچرا تعمیل کی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ سارا ملک اس کی احمقانہ تجویزوں اور محصول کی زیادتی سے تباہ ہو گیا۔ پہلے قحط پڑے بالآخر بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس کی زندگی ہی میں سنہ ۱۳۴۰ء کے بعد سلطنت کے بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے تھے۔ مثلاً بنگال خود مختار ہو گیا۔ جنوب میں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے قابل ذکر وجیانگر کی ہندو ریاست تھی جو سنہ ۱۳۳۶ء میں قائم ہوئی اور دس سال کے اندر اندر جنوب میں بہت طاقتور ہو گئی۔

دہلی کے نزدیک تغلق آباد کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ یہ شہر محمد تغلق کے باپ نے آباد کیا تھا۔

(۶۷)

چنگیز خاں نے یورپ اور ایشیا کو ہلا ڈالا

۲۵ جون ۱۹۳۲ء

میں نے حال کے متعدد خطوں میں مغلوں کا ذکر کیا ہے اور اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے دہشت اور بربادی کا بازار گرم کر رکھا تھا چین میں ہم مغلوں کی آمد تک سُنگ خاندان کا حال بیان کر چکے ہیں۔ مغربی ایشیا میں پھر ہماری اُن سے مُٹ بھیڑ ہوئی اور ان کے نمودار ہوتے ہی وہاں کا قدیم نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہندوستان میں غلام بادشاہ ان سے بال بال بچ گئے۔ پھر بھی مغلوں نے کافی ہنگامہ برپا کیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ منگولیا کے ان خانہ بدوشوں نے ساری ایشیا کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ نہ صرف ایشیا بلکہ نصف یورپ کو بھی۔ آخر یہ عجیب و غریب انسان کون تھے جو یکا یک امنڈ پڑے جنھوں نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا؟ سیتھین۔ ہن۔ ترک۔ اور تاتاری سب وسطی ایشیا سے آئے تھے اور انھوں نے تاریخ میں بہت نمایاں حصّہ لیا تھا۔ ان میں سے بعض تو اب تک برسر اقتدار تھے مثلاً مغربی ایشیا میں سلجوقی ترک یا شمالی چین وغیرہ میں تاتاری۔ لیکن مغلوں کا اب تک کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ مغربی ایشیا میں تو غالباً کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ وہ منگولیا کے گم نام قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے اور کین تاتاریوں کے جنھوں نے شمالی چین فتح کیا تھا، ماتحت تھے۔

یکایک وہ طاقت پکڑ گئے۔ ان کے سب منتشر قبیلے متحد ہو گئے اور انھوں نے اپنا ایک سردار منتخب کر لیا۔ جسے خانِ اعظم کا لقب دیا۔ پھر انھوں نے اس کی وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اس کی سرکردگی میں انھوں نے پیکن پر حملہ کیا اور کین سلطنت کا قلع قمع کر دیا اس کے بعد وہ مغرب کی طرف بڑھے اور راستے میں جو بڑی بڑی سلطنتیں پڑیں سب کا صفایا کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ روس پہنچے اور اسے بھی زیر کر لیا اور آخر میں بغداد اور سلطنت بغداد کا تختہ الٹتے ہوئے وہ پولینڈ اور وسطی یورپ تک پہنچ گئے۔ انھیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہندوستان تو حسن اتفاق سے بچ گیا ذرا سوچو تو کہ اس کوہ آتش فشاں کے پھٹ پڑنے سے یورپ اور ایشیا والے کیسے بھونچکے رہ گئے ہوں گے۔ گویا یہ بھی کوئی آفت ناگہانی یا زلزلہ تھا جس کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے اور کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتی۔

منگولیا کے یہ خانہ بدوش، عورت مرد سب بڑے مضبوط لوگ تھے وہ جفاکشی کے عادی تھے۔ اور شمالی ایشیا کے وسیع بنجر علاقوں میں خیموں میں رہا کرتے تھے لیکن ان کی یہ جسمانی طاقت اور جفاکشی کچھ زیادہ کام نہ آتی اگر ان میں ایک سردار نہ پیدا ہوا ہوتا جو نہایت حیرت انگیز شخص تھا۔ یہ وہی شخص ہے جو چنگیز خاں کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ۱۱۵۵ء میں پیدا ہوا۔ اور اس کا اصلی نام تموچن تھا۔ اس کے باپ یسوگی بغتور کا سایہ بہت صغیر سنی میں اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ بغتور مغل امرا کا خاص لقب تھا۔ اس کے معنی سورما کے ہیں اور شاید اردو

کا لفظ بہادر بھی اسی سے نکلا ہے۔

اگرچہ وہ ابھی صرف دس برس کا تھا اور کوئی اس کا مدد کرنے والا بھی نہیں تھا لیکن وہ برابر ہاتھ پاؤں مارتا رہا یہاں تک کہ وہ کامیاب ہوگیا۔ وہ ایک ایک قدم کرکے آگے بڑھا۔ بالآخر مغلوں کی مجلس اعلیٰ نے جو کورل تائی کہلاتی تھی اسے خان اعظم یا گگن منتخب کرلیا۔ چند سال پہلے اسے چنگیز کا لقب مل چکا تھا۔

"مغلوں کی خفیہ تاریخ" کے نام سے ایک کتاب تیرھویں صدی میں تصنیف ہوئی تھی اور چودھویں صدی میں چین سے شائع ہوئی تھی اس میں اس انتخاب کا تذکرہ درج ہے۔ لکھا ہے کہ "جب Leopard چیتے کے سال میں خیموں کے رہنے والے تمام قبیلے ایک جھنڈے کے نیچے متحد ہوگئے تو وہ اونن ندی کے منبع پر جمع ہوئے اور نو پایوں پر سفید علم بلند کرکے انھوں نے گگن کا اعلیٰ عہدہ چنگیز کو تفویض کردیا"

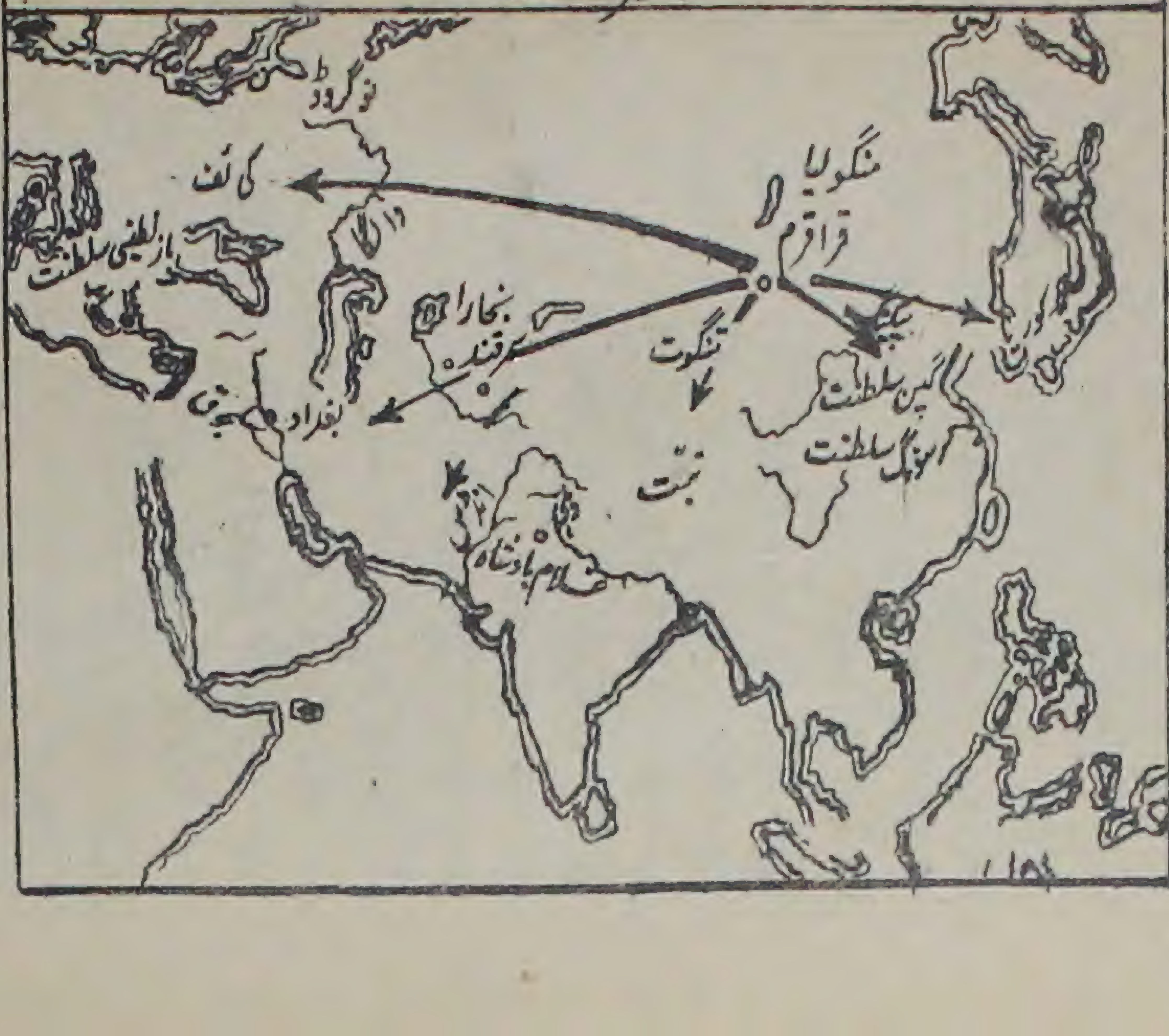
چنگیز جب خان اعظم یا گگن کے عہدے پر سرفراز ہوا تو اس کی عمر اڑتالیس برس کی تھی وہ کوئی نوجوان نہ تھا۔ اس عمر میں لوگ عموماً امن وسکون چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی فتوحات کا سلسلہ تو اب شروع ہونے والا تھا۔ یہ چیز اس لئے خصوصیت سے قابل لحاظ ہے کہ عام طور پر سب فاتح عالم شباب میں فتوحات کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چنگیز محض جوش جوانی کے جذبے میں ایشیا پر نہیں چڑھ دوڑا تھا وہ نہایت محتاط اور ہوشمند سال خوردہ شخص تھا اس نے جو قدم اٹھایا وہ ہمیشہ خوب سوچ سمجھ کر اور پوری

تیاری کرکے اُٹھایا

یہ مغل خانہ بدوش تھے اس لئے شہروں سے اور شہر کی معاشرت سے انھیں سخت نفرت تھی۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ چونکہ وہ خانہ بدوش تھے اس لئے بالکل وحشی ہوں گے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ شہر کے بہت سے فنون سے ناواقف تھے لیکن ان کی اپنی ایک مخصوص معاشرت تھی اور ان کے یہاں نہایت پیچیدہ نظام موجود تھا۔ اگر میدان جنگ میں انھوں نے بڑی بڑی لڑائیاں سر کیں تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے بلکہ اصلی سبب نظم و تنظیم تھی۔ اور سب سے بڑھ کر چنگیز خاں کی بے نظیر رہبر سرداری۔ کیونکہ چنگیز خاں بلاشبہ تاریخ عالم میں سب سے بڑا ماہر جنگ اور فوجی رہنما گزرا ہے۔ سکندر اور قیصر کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ پھر یہی نہیں کہ وہ خود بہت بڑا سپہ سالار تھا بلکہ اس نے اپنے بہت سے سرداروں کو ایسی ترتیب دی تھی کہ وہ بڑے قابل سپہ سالار بن گئے تھے۔ چنانچہ وطن سے ہزاروں میل دور، دشمنوں اور مخالفوں کے نرغے میں بھی وہ اپنے سے دگنی تگنی تعداد کا مقابلہ کرتے اور ان پر فتح حاصل کرتے رہے۔

جب چنگیز خاں یورپ اور ایشیا کے قلابے ملا رہا تھا اس وقت ان دونوں کا کیا نقشہ تھا۔ منگولیہ کے جنوب اور مشرق کی طرف چین کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے جنوب میں تونگ سلطنت تھی جہاں جنوبی سُنگ خاندان کی حکومت تھی اور اس کے شمال میں کین یا زرین تاتاریوں کی سلطنت تھی جس کا دارالسلطنت

چنگیز کے حملے



پیکن تھا۔ انہی تاتاریوں نے سنگ خاندان کو جنوب کی طرف بھگا دیا تھا۔ مغرب میں گوبی کے ریگستان میں اور اس سے آگے تک خانہ بدوشوں کی ستیایا تنگوت سلطنت تھی۔ ہندوستان میں ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ غلام بادشاہ دہلی کے تخت پر تھے۔ ایران اور عراق میں ہندوستان کی سرحد تک خوارزم یا خیوہ کی زبردست اسلامی سلطنت تھی جس کا دارالسلطنت سمرقند تھا۔ اس کے مغرب میں سلجوقی ترک تھے اور مصر و فلسطین میں صلاح الدین کے جانشین حکمراں تھے۔ بغداد اور اس کے قرب و جوار میں سلجوقیوں کے زیر سایہ خلیفہ کی برائے نام حکومت تھی۔

یہ بعد کی صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا۔ اور مقدس رومی سلطنت کی عنان حکومت ہوہن اشتاؤفن خاندان کے "عجوبۂ روزگار" بادشاہ فریڈرک ثانی کے ہاتھ میں تھی۔ انگلستان میں میگنا چارٹا اور اس کے بعد کا زمانہ تھا۔ فرانس میں شاہ لوئی نہم برسر حکومت تھا یہ وہی بادشاہ تھا جو صلیبی جنگ میں گیا تھا اور جسے ترکوں نے گرفتار کر لیا تھا اور فدیہ لے کر چھوڑا تھا۔ مشرقی یورپ میں روس تھا جو بٹا ہر دو ریاستوں میں تقسیم تھا۔ شمال میں ریاست نووگوروڈ تھی اور جنوب میں کیف، روس اور مقدس رومی سلطنت کے درمیان ہنگری اور پولینڈ تھے۔ قسطنطنیہ کے آس پاس بازنطینی سلطنت برقرار تھی۔

چنگیز خاں نے بڑے اہتمام سے حملہ کی تیاریاں کیں اس نے اپنی فوج کی خوب تربیت کی۔ مزید براں اس نے اپنے گھوڑوں

اور سواری کے جانوروں کو بھی سدھایا۔ کیونکہ یہ خانہ بدوش خونیں گھوڑوں کو سب سے زیادہ ضروری اور اہم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مشرق کی طرف بڑھا اور شمالی چین اور منچوریا کی کین سلطنت کا خاتمہ کر کے پیکن پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے کوریا کو زیر کیا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جنوبی سُنگ خاندان سے اس کے تعلقات اچھے تھے کیونکہ انھوں نے کین سلطنت کو فتح کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ اس کے بعد خود ان کی باری آئے گی۔ بعد میں چنگیز نے تنگوت سلطنت بھی فتح کر لی۔

ان فتوحات کے بعد ممکن تھا کہ چنگیز رُک جاتا معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب پر حملہ کرنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ شاہ خوارزم سے دوستانہ مراسم رکھنا چاہتا تھا لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ لاطینی میں ایک مثل ہے کہ خدا جسے برباد کرنا چاہتا ہے پہلے اس کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ شاہ خوارزم خود اپنی تباہی کے درپے تھا اور اس نے اس میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہوا یہ کہ اس کے صوبے دار نے چند مغل تاجروں کو قتل کرا دیا۔ چنگیز پھر بھی جنگ پر آمادہ نہ تھا اس لئے اُس نے شاہ خوارزم کے پاس سفیر بھیجے اور یہ درخواست کی کہ اس صوبیدار کی خاطر خواہ سرزنش کی جائے لیکن یہ احمق بادشاہ بڑا مغرور تھا۔ چنانچہ اس نے سفیروں کو بہت ذلیل کیا اور انھیں قتل کرا دیا۔ چنگیز بھلا یہ ذلت کب برداشت کر سکتا تھا۔ لیکن وہ یکایک چڑھ نہیں دوڑا۔ بلکہ اس نے پہلے خوب تیاری کی۔ اس کے بعد اپنا لشکر لے کر مغرب کی

طرف بڑھا۔

یہ حملہ ۱۲۱۹ء میں ہوا۔ اس نے ایشیا کی اور ایک حد تک یورپ کی بھی آنکھیں کھول دیں اور انھیں اس نئے خطرے کا احساس ہو گیا۔ کیونکہ یہ مہیب سیلاب اندھا دھند بڑھتا اور راستے میں ہزاروں شہروں اور لاکھوں انسانوں کو تباہ کرتا آ رہا تھا۔ سلطنت خوارزم کا نشان تک نہ رہا۔ بخارا کا عظیم الشان شہر جو محلوں سے بھرا پڑا تھا اور جس کی آبادی دس لاکھ سے اوپر تھی جل کر راکھ ہو گیا۔ دارالسلطنت سمرقند بھی تباہ ہو گیا اور اس کی دس لاکھ کی آبادی میں سے صرف پچاس ہزار نفوس باقی رہ گئے۔ ہرات۔ بلخ اور بہت سے دوسرے خوشحال شہر بھی برباد ہو گئے اور لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ بہت سی صنعتیں اور دستکاریاں جو وسطی ایشیا میں سینکڑوں برس سے پھل پھول رہی تھیں بالکل غارت ہو گئیں گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وسطی ایشیا اور ایران سے مدنیت کا خاتمہ ہو گیا ہے بس جدھر سے چنگیز نکل جاتا تھا۔ بستیاں صحرا بن جاتی تھیں

شاہ خوارزم کے بیٹے جلال الدین نے اس طوفان کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا وہ سندھ ندی تک پیچھے ہٹتا چلا گیا اور جب وہاں ہر طرف سے گھر گیا تو سُنا ہے کہ وہ گھوڑے کی پیٹ پر سوار تیس فٹ کی بلندی سے اس زبردست دریا میں کود پڑا اور تیر کر پار نکل گیا۔ دہلی کے دربار نے اسے پناہ دی۔ لیکن چنگیز نے وہاں تک اس کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

سلجوقی ترکوں اور بغداد کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چنگیز نے اُن

گے امن وسکون کو درہم برہم نہیں کیا اور روس کی طرف رخ کر دیا وہاں پہنچ کر اس نے کیف کے ڈیوک اعظم کو شکست دی اور اُسے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد وہ مشرق کی طرف پلٹ پڑا کیونکہ تنگوتوں نے بغاوت کر دی تھی اور ان کا سر کچلنا تھا۔

چنگیز نے ۱۲۲۷ء میں بہتر برس کی عمر میں انتقال کیا اس کی سلطنت مغرب میں بحر اسود سے لے کر مشرق میں بحر الکاہل تک پھیلی ہوئی تھی اور ابھی زور اور ترقی پر تھی لیکن اس کا دار السلطنت اب بھی منگولیا کا وہی چھوٹا سا شہر قراقرم تھا۔ وہ باوجود اس کے کہ ایک خانہ بدوش قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں اعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت تھی۔ اور اس نے یہ عقلمندی کی تھی کہ اپنی مدد کے لئے لائق سے لائق وزرا مقرر کر لئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی سلطنت کا جسے اس نے اتنی تیزی سے فتح کیا تھا اس کے مرنے کے بعد شیرازہ بکھرنے نہیں پایا۔

ایرانی اور عربی مورخ چنگیز کو ایک خوفناک دیو سمجھتے ہیں چنانچہ اسے "خدا کی لعنت" کہتے تھے۔ انھوں نے اسے بہت ظالم شخص کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا ظالم تھا لیکن اس کے زمانے میں سب ہی بادشاہ ایسے تھے۔

ہندوستان میں افغان بادشاہ چھوٹے پیمانے پر اسی کا نمونہ تھے۔ افغانستان میں جب ۱۱۵۰ء میں غوریوں نے غزنی فتح کیا تو انھوں نے پرانی عداوت نکالنے کے لئے پہلے تو شہر کو خوب لوٹا پھر اس میں آگ لگا دی سات دن تک "لوٹ مار، تباہی و

و بربادی اور قتل عام برابر جاری رہا۔ جو مرد سامنے آیا وہ قتل کر دیا گیا اور تمام عورتیں اور بچے قید کر لئے گئے۔ آل محمود (یعنی سلطان محمود کی اولاد) کے تمام محل اور ایوان جو دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ مسمار کر دیئے؛؛
یہ تھا مسلمان بادشاہوں کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ۔ اب بتاؤ کہ اس روّیہ میں اور افغان بادشاہوں کے ہندوستان کے طرزِ عمل میں یا چنگیز کی وسطی ایشیا اور ایران کی تباہ کاریوں میں کیا فرق تھا۔ چنگیز شاہ خوارزم سے اس لئے ناراض تھا کہ اس نے اس کے سفیروں کو قتل کرا دیا تھا۔ وہ تو گویا خون کا بدلہ لے رہا تھا۔ دوسری جگہ بھی چنگیز نے بڑی تباہ کاری کی لیکن شاید وسطی ایشیا رہے یعنی سلطنت خوارزم سے زیادہ کہیں نہیں کی۔

شہروں کے تباہ کرنے میں چنگیز کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ خانہ بدوشی کا حامی تھا اس لئے شہروں اور قصبوں سے نفرت کرتا تھا اسے تو بس پہاڑوں یا کھلے میدانوں میں رہنا پسند تھا۔ ایک مرتبہ تو چنگیز نے یہ ارادہ کیا تھا کہ چین کے تمام شہر مسمار کر دے۔ لیکن خیریت ہوگئی کہ وہ اس سے باز رہا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ تمدن اور خانہ بدوشی کو سمو دے لیکن یہ نہ اس وقت ممکن تھا نہ اب ممکن ہے۔

چنگیز خاں کے نام سے شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ وہ مسلمان تھا لیکن نہیں۔ وہ مسلمان نہیں تھا یہ تو ایک مغل نام ہے۔ مذہب کے معاملہ میں چنگیز خاں بڑا آزاد خیال شخص تھا۔ وہ شامانی مذہب کا پیرو تھا اس مذہب میں "ابدی نیلے آسمان" کی پرستش ہوتی تھی۔ وہ چین کے تاؤ مذہب کے علماء سے خوب بحث مباحثے کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے

باوجود وہ اپنے مذہب پر قائم رہا۔ چنانچہ جب کبھی اسے کوئی مشکل پیش آتی تھی تو آسمان ہی سے رجوع کرتا تھا۔

تم نے اس خط کے شروع میں یہ پڑھا ہوگا کہ چنگیز کو مغلوں کی ایک مجلس نے "خان اعظم" منتخب کیا تھا۔ یہ مجلس جمہور کی نہیں بلکہ سرداروں کی مجلس تھی۔ گویا چنگیز اپنی قوم کے سرداروں کا سردار تھا۔

وہ اور اس کے سب ساتھی بالکل بے پڑھے تھے۔ شاید اسے عرصہ تک اس کا علم بھی نہ تھا کہ دنیا میں کوئی چیز تحریر بھی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں زبانی پیام بھیجے جاتے تھے۔ اور عموماً تشبیہوں یا تمثیلوں کی صورت میں نظم کر دیے جاتے تھے۔ تعجب ہے کہ اتنی بڑی سلطنت میں زبانی پیاموں سے کیسے کام چلتا ہوگا۔ جب چنگیز کو معلوم ہوا کہ دنیا میں فن تحریر کا بھی وجود ہے تو اس نے فوراً یہ محسوس کیا کہ واقعی یہ بڑی کارآمد اور قابل قدر چیز ہوگی۔ اس لئے اس نے اپنے لڑکے اور خاص خاص سرداروں کو حکم دیا کہ لکھنا سیکھ لیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ مغلوں کے قدیم رواجی قانون اور میرے اقوال بھی ضبط تحریر میں آجائیں۔ اس کا خیال یہ تھا کہ یہ رواجی قانون ابد تک قائم رہے گا اور کوئی اس سے سرتابی کی جرات نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ شہنشاہ بھی اس کا تابع ہے۔ لیکن اس "نہ بدلنے والے قانون" کا آج نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ مغلوں میں بھی نہ اس کی یاد باقی ہے اور نہ روایات۔

ہر ملک اور ہر ملت میں کچھ تحریری قانون ہوتے ہیں اور کچھ رواجی چنانچہ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کبھی بدل نہیں سکتے بلکہ ابد تک اسی طرح

برقرار رہیں گے۔ بعض اوقات اسے وحی یا آسمانی صحیفہ سمجھا جاتا ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ جو قانون خدا کی طرف سے نازل ہوا ہو وہ نہ تو عارضی ہو سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام قانون اس لئے ہوتے ہیں کہ موجودہ حالت کا ساتھ دیں اور ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم اپنی موجودہ حالت کو بہتر بنا سکیں۔ پھر اگر حالات بدل جائیں تو پرانے قانون کیسے ان کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ انھیں بھی بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتے رہنا چاہئے۔ ورنہ ان کی مثال زنجیروں کی سی ہو جاتی ہے جو ہمیں آگے بڑھنے سے روکے رہتی ہیں۔ اور دنیا آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اس لئے کوئی قانون "ابدی قانون" نہیں ہو سکتا۔ اس کا انحصار علم پر ہونا چاہئے اور جیسے علم میں اضافہ ہو اس میں بھی اضافہ ہونا ضروری ہے۔

میں نے شاید ضرورت سے زیادہ تفصیل سے چنگیز خاں کا حال لکھ ڈالا۔ لیکن میں کیا کروں۔ میرے لئے اس شخص میں ایک کشش سی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک خانہ بدوش قوم کے جاگیرداری نظام کا ایک خونخوار ظالم اور جنگجو سردار مجھ جیسے مسکین شخص کو بھائے جو امن و آشتی اور عدم تشدد کا حامی ہے، جو شہر کا رہنے والا اور جسے جاگیرداری نظام سے سخت نفرت ہے۔

مغل ساری دُنیا پر چھا گئے

۲۶ رجون ۱۹۳۲ء

چنگیز کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اوغوتائی خان اعظم ہوا۔ چنگیز اور اس کے زمانے کے مغلوں کی بہ نسبت اس میں پھر انسانیت تھی۔ اس کا رجحان امن پسندی کی طرف تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "ہمارے گُگن چنگیز نے بڑی عرق ریزی سے اس شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی ہے اب وقت ہے کہ لوگوں کو امن چین نصیب ہو اور ان کا بار ہلکا کیا جائے۔" خیال تو کرو کہ سردار کی حیثیت سے اسے اپنی قوم کا کتنا خیال تھا۔

لیکن ابھی فتوحات کا دور ختم نہیں ہوا تھا۔ مغلوں میں اب تک جوش عمل کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ مغلوں نے اپنے زبردست سپہ سالار سابوتائی کی سرکردگی میں یورپ پر ایک دوسرا حملہ کیا اس نے پہلے دشمنوں کے ملکوں میں جاسوس بھیج کر تمام حالات معلوم کرائے اور جب اسے یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کی سیاسی اور فوجی قوت کیا ہے تب اس نے پوری طرح تیاری کرنے کے بعد قدم اُٹھایا۔ میدان جنگ کا تو وہ سورما تھا اور یورپ کے سپہ سالار اس کے سامنے بالکل مبتدی معلوم ہوتے تھے۔ سبوتائی نے سیدھا روس کا رخ کیا اور جنوب و مغرب کی طرف بغداد اور سلجوقی ترکوں کو چھوڑ دیا۔ چھ سال تک وہ برابر بڑھتا اور ماسکو۔ کیف۔ پولینڈ۔ ہنگری اور کراکو کو

لوٹتا اور برباد کرتا چلا گیا۔ ۱۲۴۱ء میں اس نے جنوبی سلیشیا (وسطی یورپ) میں لیپ زن کے مقام پر پولینڈ اور جرمنی کی ایک مشترکہ فوج کا بالکل صفایا کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے یورپ کی شامت آگئی ہے۔ گویا مغلوں کو کوئی روکنے والا ہی نہ تھا۔ فریڈرک ثانی عجوبۂ روزگار کے لقب سے مشہور تھا۔ لیکن اس حقیقی عجوبہ کے سامنے جو منگولیا سے آیا تھا اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ یکایک غیر متوقع طور پر یورپ کے سر سے یہ بلا ٹل گئی اور اس کی جان میں جان آئی۔

ہوا یہ کہ اوغاتائی کا انتقال ہو گیا اور اس کی جانشینی کے سلسلہ میں کچھ جھگڑا پیدا ہوا۔ اس لئے ۱۲۴۲ء میں یورپ کی مغل فوجیں بغیر کسی شکست کے خود بخود اپنے وطن کو واپس چلی گئیں اور یورپ نے ایک بار پھر اطمینان کا سانس لیا۔

اس دوران میں مغل سارے چین پر چھا گئے۔ انھوں نے شمال کی کین سلطنت کو اور جنوب کے سُنگ خاندان کو بھی بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔ ۱۲۵۲ء میں منگو خان، خان اعظم ہوا اور اس نے قبلائی کو چین کا گورنر مقرر کیا۔ قراقرم میں منگو کے دربار میں ایشیا اور یورپ کے لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اس کے باوجود اب تک یہ خان اعظم خانہ بدوشوں کی طرح خیموں ہی میں رہتا تھا۔ لیکن اب یہ خیمے دولت سے مالا مال تھے اور ایشیا اور یورپ کے مال غنیمت سے بھرے پڑے تھے بے شمار تاجر بالخصوص مسلمان تاجر یہاں آتے تھے اور مغل ان کا مال

بڑے اچھے داموں پر خریدتے تھے۔ صناع۔ نجومی۔ ریاضی داں غرض کہ ایسے تمام لوگ جو اس زمانہ کے علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے، اس خیموں کے شہر میں جس کا ساری دنیا پر سکہ جم رہا تھا چاروں طرف سے آ آکر اکٹھے ہوگئے۔ اس وسیع مغل سلطنت میں کسی حد تک امن واماں بھی تھا اور ایشیا اور یورپ کے بڑے بڑے راستوں پر ہر وقت مسافر چلتے رہتے تھے۔

اب مختلف مذاہب کے حامیوں میں باہم مقابلہ شروع ہوا کہ قوم پر اپنا اثر ڈالنا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ دنیا کے ان فاتحین کو اپنے مذہب میں داخل کرلیں۔ کیونکہ جو مذہب اس زبردست قوم کا مذہب بن جاتا۔ وہ لازمی طور پر بہت قوی ہوجاتا اور سب پر غالب آجاتا۔ چنانچہ پوپ نے روم سے سفیر بھیجے۔ نسطوری عیسائی بھی یہاں پہنچے اور مسلمان اور بودھ تو یہاں موجود ہی تھے۔ لیکن مغلوں کو مذہب تبدیل کرنے کی عجلت نہ تھی اور وہ کچھ زیادہ مذہبی لوگ بھی نہ تھے۔ ایک مرتبہ خان اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کرنے کے مسئلہ پر غور بھی کیا تھا۔ لیکن وہ پوپ کے اقتدار کو کب گوارا کرسکتا تھا۔ بالآخر جہاں جہاں یہ مغل آباد ہوئے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے وہیں کا مذہب اختیار کرلیا۔ یعنی چین اور منگولیا کے مغل عموماً بودھ ہوگئے۔ وسطی ایشیا کے مسلمان ہوگئے اور شاید روس اور ہنگری کے مغل عیسائی ہوگئے۔

روم میں وٹیکن کی لائبریری میں اب بھی وہ خط موجود ہے جو خان اعظم منگو خاں نے پوپ کو لکھا تھا۔ وہ عربی زبان میں ہے

اوغوتائی کے انتقال کے بعد شاید پوپ نے نئے خان کے پاس کوئی قاصد بھیجا تھا اور اسے متنبہ کیا تھا کہ اب دوبارہ یورپ کا رُخ نہ کرنا۔ اس پر خان نے یہ جواب دیا تھا کہ یورپ والوں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی تھی اس لئے میں نے حملہ کیا تھا۔

پھر بھی منگو کے زمانے میں فتح و غارت گری کی ایک دوسری لہر اُٹھی۔ اس کا بھائی ہلاکو ایران کا گورنر تھا وہ کسی بات پر خلیفہ بغداد سے خفا ہو گیا چنانچہ اس نے خلیفہ کی وعدہ خلافیوں پر اسے بہت برا بھلا کہلا بھیجا اور یہ تنبیہہ کی کہ آئندہ سے اپنا رویہ بدل دو ورنہ سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ہوش مند شخص نہ تھا۔ اور دنیا کے رنگ کو نہ پہچانتا تھا اس لئے اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس کے علاوہ بغداد کے ایک عام مجمع نے مغل سفیروں کو بہت ذلیل کیا۔ یہ سن کر ہلاکو کا مغل خون کھول گیا۔ غصہ میں وہ فوراً بغداد پر چڑھ دوڑا اور چالیس دن کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ الف لیلہ کا یہ شہر اور وہ مال و دولت جو پانچ سو برس کے دورِ حکومت میں جمع ہوا تھا۔ اس طرح غارت ہو گیا۔ خلیفہ اس کے بیٹے اور اس کے تمام قریبی رشتے دار تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ہفتوں تک قتلِ عام جاری رہا۔ یہاں تک کہ دریائے دجلہ میلوں تک خون سے رنگین ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ۱۵ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے علم و فن کے تمام بیش بہا ذخیرے اور کتب خانے برباد ہو گئے یہاں تک کہ ہلاکو نے مغربی ایشیا کے ہزاروں برس پرانا آبپاشی

کا نظام بھی تباہ کر ڈالا۔

حلب، ادیسہ اور دوسرے شہروں کی بھی یہی گت بنی اور جہالت کی تاریکی سارے مغربی ایشیا پر چھا گئی۔ اس زمانہ کا ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ "یہ دور علم اور نیکی کے قحط کا دور تھا" مغلوں نے ایک فوج فلسطین بھی بھیجی۔ لیکن مصر کے سلطان بائی برس کے ہاتھوں اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس سلطان کا ایک بہت دلچسپ لقب تھا یعنی وہ "بندوق دار" کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ اس کے پاس بندوق والے سپاہیوں کی ایک پلٹن تھی۔ اب ہم آتشیں اسلحہ جات کے دور تک آ گئے ہیں۔ چینیوں کو بارود کا عرصہ سے علم تھا۔ مغلوں نے بھی غالباً انہیں سے بارود سازی سیکھی اور بہت ممکن ہے کہ اس ہی کی بدولت انھیں فتوحات میں آسانی ہوئی ہو۔ یورپ میں آتشیں اسلحہ جات مغلوں ہی کے ذریعہ سے پہنچے۔

سلطنت عباسیہ کے کچھ بچے کھچے آثار رہ گئے تھے، ۱۲۵۸ء کی بغداد کی تباہی نے ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔ گویا مغربی ایشیا میں عرب تہذیب کی امتیازی حیثیت ختم ہو گئی۔ عرب سے بہت دور جنوبی اسپین یعنی غرناطہ میں اب بھی عربی روایات باقی تھیں وہاں یہ کوئی دو سو برس تک اور باقی رہیں۔ اس کے بعد بالکل نیست و نابود ہو گئیں۔ پھر تو عرب کی عظمت کا آفتاب بڑی تیزی کے ساتھ غروب ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک عربوں نے دنیا کی تاریخ میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا ہے۔ بعد میں عرب عثمانی ترکوں کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ لیکن ۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ عظیم میں انگریزوں

نے ترکوں کے خلاف وہاں بغاوت کرادی۔ اس وقت سے عرب کم و بیش خود مختار ہو گیا ہے۔

ہلاکو کے حملے کے بعد دو برس تک تو کوئی خلیفہ رہا ہی نہیں۔ اس کے بعد مصر کے سلطان بائی برس نے آخری عباسی خلیفہ کے ایک رشتہ دار کو خلیفہ بنایا۔ لیکن اسے کوئی سیاسی اختیارات نہ تھے بلکہ وہ صرف مذہبی پیشوا تھا اس کے تین سو برس بعد قسطنطنیہ کے ترکی سلطان نے خلافت کا منصب مصر کے آخری خلیفہ سے حاصل کر لیا۔ یہ ترکی سلاطین عرصہ تک خلیفہ رہے لیکن ابھی چند سال ہوئے کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے سلطانی اور خلافت دونوں کا خاتمہ کر دیا۔

میں بہک کر کہیں سے کہیں نکل گیا۔ ہاں تو خان اعظم منگو خاں کا ۱۲۳۹ء میں انتقال ہو گیا۔ اپنے مرنے سے پہلے اس نے تبت بھی فتح کر لی تھی۔ اب چین کا گورنر قبلائی خاں، خان اعظم بن گیا۔ قبلائی خاں عرصہ تک چین میں رہا تھا اور اسے اس ملک سے خاص انس تھا۔ اس لئے اس نے بجائے قراقرم کے پیکن کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اس کا نام خان بالک (یعنی "خان کا شہر") رکھا۔ چین کے معاملات سے قبلائی کی اتنی دلچسپی بڑھ گئی کہ اس نے اپنی وسیع سلطنت کی طرف سے بے توجہی شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ بڑے بڑے مغل صوبیدار خود مختار ہو گئے۔

قبلائی نے چین کی فتح کی تکمیل کر لی۔ لیکن اس کی مہم مغلوں کی پرانی مہموں سے بالکل مختلف تھی۔ اس نے ظلم و تشدد اور غارتگری سے زیادہ کام نہیں لیا۔ چین قبلائی کے جوش کو ٹھنڈا کر کے اسے مہذب

چکا تھا۔ اس کے علاوہ چینیوں کو بھی کو اس سے اُنس تھا اور وہ اُسے اپنوں ہی میں سے سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس نے جس خاندان کی بنیاد ڈالی (یعنی یوان خاندان) وہ بالکل چینی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے ٹانگ کنگ انام اور برما بھی فتح کر لیا تھا۔ اور جاپان اور ملیشیا بھی فتح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوا کیونکہ مغل بحری سفر کے عادی نہ تھے۔ اور جہاز سازی سے بالکل ناواقف تھے۔

منگو خاں کے پاس فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کا ایک بہت دلچسپ پیام آیا تھا۔ لوئی نے یہ تجویز کی تھی کہ یورپ کی تمام عیسائی سلطنتیں اور مغل مل کر مسلمانوں سے لڑیں۔ بیچارا لوئی صلیبی جنگ کے زمانہ میں قید ہو چکا تھا اور اُسے بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں۔ لیکن مغلوں کو اس قسم کے اتحاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ وہ کسی قوم پر اس کے مذہب کی وجہ سے حملہ کرنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ، وہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں سے اتحاد کیوں کرنے لگے تھے اور آخر کس کے خلاف؟ وہ مغربی یورپ کی ریاستوں یا اسلامی حکومتوں کی جنگی قابلیت کو ہیچ سمجھتے تھے۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ مغربی یورپ ان کی زد سے بچ گیا۔ سلجوقی ترکوں نے ان کی اطاعت قبول ہی کر لی تھی اور انھیں خراج دینا منظور کر لیا تھا صرف سلطان مصر نے ایک مغل فوج کو شکست دی تھی، لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر وہ سچ مچ کوشش کرتے تو اسے بھی زیر کر لیتے ایشیا اور یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مغل سلطنت پھیلی ہوئی تھی۔ تاریخ عالم میں مغلوں کی فتوحات کی کوئی نظیر

نہیں ملتی ہے۔ نہ اس سے پہلے کوئی سلطنت اتنی وسیع ہوئی ہے۔ اُس زمانہ میں مغل واقعی ساری دنیا کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ ہندوستان اگر آزاد تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے ادھر کا رُخ ہی نہ کیا تھا۔ اسی طرح مغربی یورپ بھی جو بالکل ہندوستان کے برابر تھا۔ ان کی سلطنت میں شامل نہ تھا۔ لیکن یہ سب مقامات ان کے رحم و کرم پر تھے۔ اور اسی وقت تک آزاد تھے۔ جب تک مُغل ان پر قبضہ کرنے کا ارادہ نہ کریں۔ غرضکہ تیرھویں صدی میں دنیا کی یہ صورت حال تھی۔

لیکن اب مغلوں کا غیر معمولی جوش عمل ٹھنڈا پڑتا جاتا تھا۔ اور فتوحات کا ولولہ کم ہو رہا تھا۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس زمانہ میں لوگ پیدل یا گھوڑے پر سفر کرتے تھے جس میں نسبتاً بہت دیر لگتی تھی۔ آج کل کی طرح نقل و حمل کے تیز رفتار ذرائع نہ تھے۔ اگر مغلوں کی کوئی فوج اپنے وطن منگولیا سے سلطنت کی مغربی سرحد یعنی یورپ کی طرف روانہ ہوتی تو سفر میں پورا ایک سال لگ جاتا۔ ان کو فتوحات کا اتنا شوق نہ تھا کہ جب تک بہت سا مال غنیمت ملنے کی امید نہ ہو۔ خود اپنی سلطنت کے اندر اتنے لمبے لمبے سفر کریں۔ اس کے علاوہ جنگ کی پیہم کامیابیوں اور مال غنیمت کی افراط نے مغل سپاہیوں کو بہت مال دار کر دیا تھا بہتوں کے پاس غلام بھی ہوں گے اس لئے وہ خاموش بیٹھ رہے اور امن و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔ انسان کو اپنی خواہش کے مطابق سب کچھ مل جائے تو وہ فطرتاً امن پسند ہو جاتا ہے۔

اس وسیع مغل سلطنت کا نظام کرنا بھی بڑا مشکل کام ہوگا۔ اس لئے اگر اس کا شیرازہ بکھرنے لگا تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے

قبلائی خاں کا ۱۲۹۲ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد کوئی خان اعظم مقرر نہیں ہوا اور سلطنت حسب ذیل پانچ بڑے بڑے حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

(۱) سلطنت چین جس میں منگولیا منچوریا اور تبت بھی شامل تھے۔ یہ سب سے اہم سلطنت تھی اور اس پر قبلائی کی اولاد یعنی یوان خاندان حکمراں تھا۔

(۲) مغرب بعید میں روس پولینڈ اور ہنگری میں گولڈن ہورڈ[1] کی سلطنت تھی۔

(۳) ایران۔ عراق۔ اور وسطی ایشیا کے بعض حصوں میں سلطنت ایل خاں تھی جسے ہلاکو نے قائم کیا تھا اور سلجوقی ترک اسے خراج ادا کرتے تھے۔

(۴) وسطی ایشیا میں تبت کے شمال کا علاقہ عظیم ترکی کے نام سے مشہور تھا اور یہاں چغتائیوں کی حکومت تھی

اور (۵) منگولیا اور گولڈن ہورڈ کی سلطنت کے درمیان سلطنت سائبیریا تھی۔ اس پر بھی مغلوں کی حکمرانی تھی۔ اگرچہ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی لیکن ان میں کا ہر ٹکڑا خود ایک زبردست سلطنت کی حیثیت رکھتا تھا۔

---

[1] یورپ میں مغلوں کو اسی نام سے پکارتے تھے۔

مشہور و معروف سیاح مارکوپولو

۲۷؍جون ۱۹۳۲ء

میں نے خان اعظم کے قراقرم کے دربار کا تذکرہ کیا تھا کہ وہاں تجار صناع۔ علماء اور مبلغین جوق جوق آتے تھے۔ مغلوں کی شہرت دور تک تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کی فتوحات کی دھاک بیٹھ گئی تھی، اس لئے لوگ چاروں طرف سے کھنچے چلے آتے تھے۔ اس کے علاوہ مغل خود ان آنے والوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ یہ مغل بھی عجیب لوگ تھے یعنی بعض باتوں میں تو بہت قابل اور بعض باتوں میں بالکل بچوں کی طرح ناسمجھ باوجودیکہ ان کی تند خوئی اور ظلم و تشدد سخت نفرت انگیز تھا لیکن اس میں بھی کچھ طفلانہ عناصر موجود تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان خونخوار لڑنے والوں میں ایک دلکشی پائی جاتی ہے۔ کئی سو برس بعد ایک مغل[1] نے ہندوستان بھی فتح کیا۔ اس کا نام بابر تھا اور اس کی ماں چنگیز خاں کی اولاد میں تھی فتح کے بعد اسے کابل اور اس کے شمال کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں، پھولوں، باغوں اور تربوزوں کی یاد نے بہت ستایا۔ وہ بڑی دلکش شخصیت رکھتا تھا۔ اس نے خود اپنی سرگذشت بھی لکھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بہت انسانیت تھی اور بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔

غرض مغل اپنے دربار میں باہر سے آنے والوں کی بہت

---

[1] منگولیا کے رہنے والے منگولی کہلاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں وہ مغل کے نام مشہور ہیں

خاطر کرتے تھے۔ انھیں علم کی جستجو تھی اور وہ ان سے کچھ سیکھنا چاہتے تھے
تمہیں خیال ہوگا، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب چنگیز خاں کو علم ہوا کہ دنیا
میں تحریر کا بھی ایک فن ہے تو اس نے فوراً اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا
اور اپنے سرداروں کو سیکھنے کا حکم دیا۔ مغل بہت اثر پذیر دل ودماغ
رکھتے تھے اور ہر چیز کو قبول کرنے کی ان میں استعداد موجود تھی۔
قبلائی خاں جب پیکین میں مستقل طور پر مقیم ہو گیا اور چین کا بادشاہ بن گیا
تو اس نے خاص طور پر غیر ملکوں سے آنے والوں کی سرپرستی کی۔ اس
کے پاس وینس کے دو سوداگر بھی آئے۔ یہ دونوں بھائی بھائی تھے
اور ان کے نام نکولو پولو اور مافیو پولو تھے۔ وہ تجارت کے سلسلہ میں
بخارا تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں انھیں وہ قاصد مل گئے جو قبلائی خاں
نے ایران کے ہلاکو خاں کے پاس روانہ کئے تھے اور اب پیکین واپس
جا رہے تھے۔ انھوں نے ان دونوں بھائیوں کو اپنے قافلہ میں شامل
کر لیا۔ اس طرح وہ خان اعظم کے دربار میں پہنچ گئے۔

قبلائی خاں نکولو اور مافیو کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آیا اور
انھوں نے اسے یورپ کا عیسائی مذہب کا اور یورپ کا سب حال
بتایا۔ قبلائی نے یہ باتیں بڑے شوق سے سنیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ عیسائی مذہب کی طرف اسے کچھ رغبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۱۲۶۹ء
میں اس نے ان دونوں بھائیوں کو پوپ کے پاس یہ پیغام لے کر
یورپ واپس بھیجا کہ ایک سو "لایق فائق اور ذہین اشخاص جو ساتوں
فنون کے ماہر ہوں" ۔ اور جو عیسائی مذہب کو پوری طرح سمجھا سکیں
یہاں بھیج دیئے جائیں۔ لیکن جب یہ دونوں بھائی یورپ پہنچے تو

انھوں نے پوپ اور یورپ کو بڑی خراب حالت میں پایا۔ اسوقت وہاں اس قسم کے ایک سو قابل شخص ڈھونڈے بھی نہ ملتے تھے۔ چنانچہ دو سال کے بعد وہ صرف دو عیسائی راہبوں کو لے کر واپس آئے لیکن تاریخی حیثیت سے زیادہ اہم چیز یہ تھی کہ اس مرتبہ وہ نکولو کے لڑکے کو بھی ساتھ لائے۔ وہ بالکل نوجوان تھا اور اس کا نام مارکو تھا

غرض کہ پولو خاندان کے یہ تین افراد اپنے مہیب سفر پر روانہ ہوگئے۔ اور خشکی کے راستہ سے پوری ایشیا کی مسافت طے کی۔ اُفوہ اس زمانہ کے سفر بھی کیسے کیسے طویل ہوتے تھے! اب بھی اگر ان پولو سیاحوں کے راستے سے سفر کیا جائے تو سال کا کافی حصہ اس کی نذر ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے ایک حد تک ہیون سانگ کا قدیم راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ فلسطین سے آرمینیا گئے۔ وہاں سے عراق ہوتے ہوئے خلیج فارس پہنچے۔ یہاں بہت سے ہندوستانی تاجروں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ پھر ایران سے گزر کر بلخ اور کاشغر کے پہاڑوں کو عبور کر کے ختن اور لوپ نار جھیل تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد ریگستان پھر چین کے شاداب میدان آئے۔ تب کہیں پیکن پہنچے۔ خان اعظم نے خود انھیں ایک سونے کی تختی عطا کی تھی جو پروانہ راہداری کا کام دیتی تھی۔

قدیم رومیوں کے زمانے میں چین اور شام کے درمیان قافلے اسی راستے سے آتے جاتے تھے۔ ابھی چند روز ہوئے میں نے سویڈن کے ایک سیاح سون ہیڈن کا سفر نامہ پڑھا تھا جس میں اس نے ریگستان گوبی کے سفر کا حال لکھا ہے۔ وہ پیکن سے مغرب کی جانب

روانہ ہوا اور ریگستان کو طے کرتا ہوا لوپ نار جھیل کے پاس سے گزرتا ہوا ختن پہنچا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ اسے تمام جدید سہولتیں حاصل تھیں، پھر بھی اس کو اس میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا ہوا۔ بھلا خیال تو کرو کہ سات سو برس پہلے جب پولو نے یہ سفر کیا یا تیرہ سو برس پہلے جب ہیون سانگ نے یہ سارا راستہ طے کیا تو کیا صورت رہی ہوگی۔ سون ہیڈن نے ایک عجیب بات دریافت کی۔ یعنی یہ کہ لوپ نار جھیل کی جگہ بدل گئی ہے۔ اس جھیل میں تارن ندی آکر گرتی ہے۔ چوتھی صدی کا ذکر ہے کہ اس ندی کا دھارا بدل گیا تھا اور اس کی خالی وادی میں ریگستان کی ریت آپڑی تھی۔ یہاں پر لولان کا قدیم شہر واقع تھا اس تبدیلی کی وجہ سے وہ دنیا سے بالکل کٹ گیا اس لئے اس کے باشندے اسے ویران کر کے چلے گئے تھے۔ اس لئے قافلوں کے پرانے راستے بھی بدلنا پڑے۔ ابھی چند سال ہوئے کہ سون ہیڈن نے یہی تبدیلی پھر محسوس کی۔ اس نے دیکھا کہ تارن ندی پھر اپنا دھارا بدل کر پہلی جگہ پہنچ گئی ہے۔ اور جھیل بھی اس کے ساتھ ساتھ ہٹ گئی ہے۔ گویا اب پھر تارن ندی قدیم شہر لولان کے کھنڈروں کے کنارے بہنے لگی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ راستے جو سولہ سو برس سے استعمال نہیں ہوئے ہیں پھر کھل جائیں لیکن اب اونٹ کی جگہ موٹر کار کا دور دورہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ لوپ نار کو آوارہ گرد جھیل کہتے ہیں۔ میں نے تارن ندی اور لوپ نار جھیل کی آوارہ گردی کا اس لئے حال بیان کیا کہ تمہیں یہ اندازہ ہوسکے کہ ندیوں کا دھارا بدل جانے سے بڑے بڑے علاقوں کی ہیئت

کیسے بدل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی تاریخ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پرانے زمانہ میں وسطی ایشیا بڑا خوب آباد تھا۔ اور وہاں کے باشندے موج در موج اٹھتے تھے اور مغرب اور جنوب کی طرف فتح کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ لیکن آج یہ تقریباً ریگستان ہے۔ جس میں معدودے چند شہر اور بہت چھدری آبادی ہے۔ شاید اُس زمانہ میں یہاں پانی کی افراط ہوگی جس سے کافی آبادی کی بسر ہوتی ہوگی۔ پھر جیسے جیسے آب و ہوا خشک ہوتی گئی اور پانی کی قلت ہوگئی تو آبادی بھی کم ہوگئی، یہاں تک کہ یہ مقام بالکل ویران ہوگیا

ان طول طویل سفروں میں ایک فائدہ بھی تھا یعنی سیاح کو نئی نئی زبانیں سیکھنے کا پورا موقع ملتا تھا۔ پولو خاندان کے ان تین افراد کو وینس سے پیکن پہنچنے میں پورے تین سال لگے تھے۔ اس طویل عرصہ میں مارکو نے منگولی زبان پر پوری قدرت حاصل کرلی تھی اور شاید چینی بھی سیکھ لی تھی۔ مارکو خان اعظم کا بہت معتمد اور محبوب ہوگیا تھا۔ چنانچہ کوئی سترہ برس تک وہ اس کی خدمت میں رہا۔ خان نے اسے صوبیداری پر مامور کردیا اور سرکاری کاموں کے لئے اس نے چین کے مختلف حصوں کا سفر بھی کیا۔ اگرچہ مارکو اور اس کے باپ کو گھر کی یاد بہت ستاتی تھی اور وہ وینس واپس جانا چاہتے تھے۔ لیکن خان سے رخصت حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ بالآخر واپسی کا ایک موقع نکل آیا۔ ایران کی ایلخانی سلطنت کا حکمران قبلائی کا چچازاد بھائی تھا۔ اتفاق سے اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا

لیکن اس کی بیوی یہ وصیت کر گئی تھی کہ غیر کُف میں ہر گز شادی نہ کرنا۔
اس لئے ارغون نے (یہ اس کا نام تھا) قبلائی خاں کے پاس پیکنگ میں
قاصد بھیجا اور یہ درخواست کی کہ خاندان کی کوئی لڑکی میرے لئے منتخب کرکے
بھیج دیجئے۔

قبلائی خاں نے ایک مغل شہزادی کا انتخاب کیا اور جو دستہ اس
کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس میں پولو خاندان کے
ان تینوں افراد کو بھی شامل کر دیا کیونکہ یہ بڑے تجربہ کار سیاح تھے اُنھوں
نے سمندر کے راستے سے سفر کیا اور جنوبی چین سے پہلے سماترا گئے اور وہاں
کچھ قیام کیا۔ اس وقت سماترا میں بودھوں کی شری وجے سلطنت حکمراں
تھی۔ لیکن اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ سماترا سے یہ قافلہ جنوبی ہند
پہنچا۔ میں تمھیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مارکو ایک مرتبہ کائل کی بارونق
بندرگاہ میں آیا تھا۔ یہ بندرگاہ جنوبی ہند میں پانڈیہ سلطنت میں واقع
تھی۔ شہزادی اور مارکو اور ان کا پورا قافلہ ہندوستان میں کافی عرصے
تک ٹھہرا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کوئی عجلت نہ تھی۔ غرضکہ وہ دو برس
میں ایران پہنچے۔ اس عرصہ میں اس کا منگیتر مر چکا تھا۔ اس بیچارے نے
کافی انتظار کیا۔ شاید اس کا مر جانا کچھ برا بھی نہیں ہوا کیونکہ اس نوجوان
شہزادی کی شادی ارغون کے بیٹے کے ساتھ ہو گئی جو عمر کے لحاظ سے
اس کا جوڑ کا تھا

پولو خاندان کے یہ تینوں شخص شہزادی کو وہاں چھوڑ کر قسطنطنیہ
کے راستے سے وطن چلے گئے۔ وہ ۱۲۹۵ء میں وینس پہنچے گویا چوبیس
برس باہر رہے۔ اس لئے کوئی انھیں پہچان بھی نہ سکا کہتے ہیں کہ اپنے

پرانے دوستوں اور عزیزوں کو حیرت میں ڈالنے کے لئے اُنھوں نے ایک ضیافت کی اور جب سب لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے تو انھوں نے یکایک اپنے ڈھیلے ڈھالے بیہودہ کپڑے اتار پھینکے۔ اس کے بعد انھوں نے قیمتی جواہرات مثلاً ہیرے۔ لعل۔ زمرد وغیرہ کے ڈھیر سب کے سامنے ڈال دیئے اور سارے مہمان دنگ رہ گئے۔ پھر بھی انھوں نے چین اور ہندوستان کی مہموں کے جو فسانے بیان کئے اس پر بہت کم لوگوں نے اعتبار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مارکو اس کا باپ اور چچا سب مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔ ان بیچاروں نے اپنے وینس کی چھوٹی سی جمہوریت دیکھی تھی اس لئے وہ چین یا ایشیا کے دوسرے ملکوں کی وسعت اور دولت کا قیاس بھی نہ کر سکتے تھے۔

تین سال بعد یعنی ۱۲۹۵ء[له] میں جینوا کی ریاست سے وینس کی جنگ ہوئی۔ یہ دونوں بحری طاقتیں تھیں اور ایک دوسرے کی مدمقابل تھیں۔ اس جنگ میں وینس کو شکست ہوئی اور حکومت جینوا نے وینس کے ہزاروں آدمی قید کر لئے۔ انہی میں ہمارا دوست مارکو پولو بھی تھا۔ چنانچہ جینوا کے جیل خانے میں بیٹھ کر اس نے اپنا سفرنامہ لکھا بلکہ یوں کہیے کہ لکھوایا۔ اس طرح "مارکو پولو کا سفرنامہ" عالم وجود میں آیا معقول کام کرنے کے لئے جیل خانہ بھی واقعی کتنی اچھی جگہ ہے۔

اس سفرنامے میں مارکو نے چین کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور وہاں اُس نے جو سیر و سیاحت کی اس کا حال بھی بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیام۔ جاوا۔ سماٹرا۔ لنکا اور جنوبی ہند کا

[له] شاید مصنف نے ۱۲۹۸ء کی جگہ ۱۲۹۵ء لکھ دیا ہے۔ مترجم

بھی کچھ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ چین میں بڑی بڑی بندرگاہیں تھیں۔ جہاں مشرق کے ہر حصے کے جہاز کھڑے رہتے تھے۔ ان میں بعض بعض تو اتنے بڑے ہوتے تھے جن پر تین چار سو آدمیوں کی گنجائش تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ چین بڑا سرسبز و شاداب اور خوشحال ملک تھا جس میں بہت سے شہر اور قصبے تھے اور جہاں "ریشم اور زری کے کپڑے اور عمدہ سے عمدہ کمخواب" تیار ہوتی تھی۔" اچھے سے اچھے انگوروں کے باغ لہلہاتے ہوئے کھیت اور خوشنما چمن" تھے اور تمام راستوں پر مسافروں کے لئے بہترین قسم کی سرائیں بنی ہوئی تھیں۔ سرکاری پیغامات لے جانے کے لئے ڈاک کا خاص انتظام تھا۔ ڈاک کے یہ ہرکارے گھوڑے بدلتے ہوئے چوبیس گھنٹے میں چار سو میل تک طے کر لیتے تھے اور بہت اچھی رفتار تھی۔ وہ کہتا ہے کہ چین کے لوگ لکڑی کی جگہ ایک سیاہ پتھر جلاتے تھے جسے وہ زمین سے کھود کر نکالتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کوئلے کی کانیں بھی کھودتے تھے اور جلانے کے لئے کوئلہ استعمال کرتے تھے۔ قبلائی خاں نے کاغذ کا سکہ بھی جاری کیا تھا۔ یعنی آج کل کی طرح کاغذی نوٹ نکالے تھے۔ جس میں عند الطلب مقررہ رقم ادا کرنے کا وعدہ ہوتا تھا۔ یہ چیز نہایت دلچسپ ہے کیونکہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے مالی ساکھ پیدا کرنے کا جدید طریقہ اختیار کیا تھا۔ یورپ والوں کو مارکو سے یہ سن کر بڑی حیرت اور خوشی ہوئی کہ چین میں عیسائیوں کی ایک نوآبادی بھی تھی۔ جہاں پر مسٹر جان حکمراں تھا۔ غالباً یہ وہی پرانے نسطوری تھے جو منگولیا گئے تھے۔

اس نے جاپان۔ برما اور ہندوستان کے متعلق بھی بعض چشم دید اور بعض سُنے ہوئے حالات لکھے ہیں۔ مارکو کا یہ سفرنامہ اس وقت بھی حیرت انگیز ہے۔ اُس زمانہ میں یورپ والے چھوٹے چھوٹے محدود علاقوں میں رہتے تھے اور مقامی تعصبات میں گرفتار تھے۔ اس لئے یہ سفرنامہ پڑھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں باہر کی دُنیا کی عظمت و دولت اور عجائبات کا اندازہ ہوا۔ اس سے ان کے تخیل میں ایک ہیجان برپا ہوا۔ مہم بازی کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اور ان کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ گویا اس کی بدولت انھیں بحری سفر کی طرف زیادہ رغبت پیدا ہوئی۔ یورپ برابر آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کی نوعمر تہذیب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ رہی تھی اور دور وسطیٰ کی پابندیوں سے نکلنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ گویا یورپ اس نوجوان کی طرح جس کا عین عنفوان شباب ہو جوش عمل سے سرشار تھا۔ بحری سفر کا یہ ذوق وشوق۔ دولت کی یہ جستجو اور مہم بازی کا یہ ولولہ ہی یورپ والوں کو بعد میں امریکہ لے پہنچا۔ اور اس امید کے راستے سے انھوں نے بحرالکاہل۔ ہندوستان۔ چین اور جاپان چھان مارا اب سمندر دنیا کی شاہراہ بن گیا اور ایشیا اور یورپ کے درمیان خشکی کے راستوں کی اہمیت کم ہو گئی۔

مارکو کی روانگی کے چند روز بعد ہی خان اعظم قبلائی خاں کا انتقال ہو گیا۔ جس یوان خاندان کی اس نے چین میں بنیاد ڈالی تھی وہ بھی زیادہ عرصہ تک نہ چلا۔ مغلوں کی قوت بڑی تیزی سے گھٹنا شروع ہوئی اور پردیسیوں کے خلاف چین میں ایک زبردست قومی تحریک شروع ہو گئی۔ چنانچہ ساٹھ برس کے اندر اندر جنوبی چین

سے مغل نکال دیئے گئے اور ایک چینی نے نانکنگ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بارہ برس بعد یعنی ۱۳۶۸ء میں یوان خاندان کا بالکل خاتمہ ہو گیا اور مغل دیوارِ چین کے پرے بھگا دیئے گئے اب ایک دوسرا چینی خاندان (یعنی نائی منگ خاندان) منظر عام پر آیا۔ کوئی تین سو برس تک یہ خاندان چین پر حکمرانی کرتا رہا۔ یہ دور چین میں منظم حکومت عام خوشحالی اور تہذیب و تمدن کا دور سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں سامراجی مہمات اور فتوحات کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔

چین میں سلطنت مغلیہ کے تباہ ہو جانے سے یورپ اور چین کے درمیان سلسلہ آمد و رفت بھی منقطع ہو گیا۔ اب خشکی کے راستے تو محفوظ نہیں رہے تھے اور سمندر کے راستے سے آمد و رفت کا رواج بہت کم تھا۔

(۷۰)

رومی کلیسا کی جارحانہ سرگرمیاں

۲۸ جون ۱۹۳۲ء

میں اس واقعہ کا ذکر کر چکا ہوں کہ قبلائی خاں نے یورپ سے ایک سو عالم فاضل شخص چین بھیجنے کی درخواست کی تھی لیکن پوپ اس کی تعمیل نہ کر سکا۔ وہ اس وقت خود مصیبت میں مبتلا تھا۔ شاید تمہیں یاد ہوگا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب فریڈرک ثانی کا انتقال ہو چکا تھا اور ۱۲۵۰ء سے ۱۲۷۳ء تک وہاں کوئی شہنشاہ نہیں رہا تھا۔ اس وقت وسطی یورپ کی حالت نہایت ابتر تھی۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ لٹیرے بانکوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ۱۲۷۳ء میں ہیپس برگ خاندان کا ایک شخص روڈولف نامی شہنشاہ بنا۔ لیکن اس سے حالات کچھ بہتر نہیں ہوئے۔ اسی زمانے میں اٹلی سلطنت کے قبضے سے نکل گیا۔

اس زمانہ میں نہ صرف سیاسی بدنظمی تھی بلکہ رومی کلیسا کے نقطہ نظر سے مذہبی ابتری کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے اب لوگ کلیسا کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل نہیں کرتے تھے۔ ان میں شک کا جذبہ پیدا ہو گیا اور شک تو مذہب کے لئے زہر قاتل ہوتا ہی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شہنشاہ فریڈرک ثانی نے پوپ کی کافی تضحیک کی اور مذہب سے خارج کئے جانے کی بھی کوئی پرواہ نہ کی یہاں تک کہ اس نے پوپ سے تحریری بحث مباحثہ بھی شروع کر دیا جس میں

پوپ کو نیچا دیکھنا پڑا۔ اس زمانہ میں فریڈرک کی طرح یورپ میں اور بہت سے شک کرنے والے ہوں گے۔ نیز ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اگرچہ پوپ یا کلیسا کے احکام پر شک یا اعتراض نہیں کرتے ہوں گے۔ لیکن ارباب کلیسا کی عیش پسندی اور بداعمالی کو بُری نظر سے دیکھتے ہوں گے۔

دوسری طرف صلیبی جنگیں بدنامی کے ساتھ ختم ہو رہی تھیں یہ لڑائیاں بڑی بڑی امیدوں اور جوش وخروش کے ساتھ شروع کی گئی تھیں۔ لیکن اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ناکامیوں کا سخت ردعمل ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کلیسا سے لوگ مایوس ہو گئے تو رفتہ رفتہ وہ دوسرے ٹھکانوں میں ہدایت اور روشنی تلاش کرنے لگے۔ کلیسا نے اس کا جواب تشدد سے دیا اور تخویف کے ذریعہ لوگوں کے دماغوں پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ بھول گیا کہ انسانوں کے دلوں پر قبضہ کرنا بہت نازک کام ہے اور اس میں تشدد سے کام نہیں چلتا۔ غرض کہ افراد اور جماعتوں کے ضمیر میں جو ہیجان پیدا ہوا تھا کلیسا نے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی اور شک کا جواب دلیل سے نہیں بلکہ تلوار اور ڈنڈے سے دیا۔

۱۱۵۵ء ہی میں ایک ہردلعزیز اور مخلص واعظ یعنی بریکیہ (اٹلی) کا آرنلڈ کلیسا کے غیض وغضب کا شکار ہو

بداعمال اور عیش پسندی کے خلاف وعظ کہتا پھرتا تھا۔ چنانچہ اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اُس

کی لاش کو جلا کر راکھ ٹائبر ندی میں بہادی تاکہ لوگ اسے متبرک سمجھ کر یادگار کے طور پر نہ رکھ لیں آرنلڈ نے آخر دم تک بڑے سکون اور استقلال سے کام لیا۔

پوپ نے یہاں تک کیا کہ جن عیسائی فرقوں نے عقائد کے معاملہ میں ذرا سا اختلاف بھی ظاہر کیا یا پادریوں پر زیادہ نکتہ چینی کی انکی پوری کی پوری جماعتوں کو مذہب سے خارج کر دیا اور ان کے خلاف باضابطہ جنگ کے احکام جاری کر دیئے غرضکہ کوئی ایسا مکروہ ظلم نہ تھا جو ان پر نہ توڑا گیا ہو۔ چنانچہ جنوبی فرانس کے ٹولوس مقام کے البی جوئی فرقے اور ولدو نامی ایک شخص کے پیرووں (ولڈینیوں) کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔

اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ پہلے اٹلی میں ایک شخص گذرا ہے۔ جس کی شخصیت عالم عیسائیت میں نہایت دلکش اور نمایاں ہے۔ یہ اسیسی کا رہنے والا فرانسس تھا۔ دراصل وہ بہت بڑا امیر آدمی تھا لیکن اس نے تمام مال و دولت پر لات مار کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کا عہد کیا اور غریبوں اور مریضوں کی مدد کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ چونکہ اس زمانہ میں کوڑھی سب سے زیادہ بدنصیب تھے اور ان کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا اس لئے اس نے خاص طور پر ان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اس نے بودھوں کے سنگھ کی طرح ایک حلقہ قائم کیا۔ جو سینٹ فرانسس کے حلقہ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ جگہ جگہ وعظ کہتا پھرتا تھا اور لوگوں کی خدمت کیا کرتا تھا گویا وہ حضرت عیسٰی کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتا تھا، ہزاروں آدمی اس کے پاس آتے تھے اور سینکڑوں اس کے

مرید ہو جاتے تھے ۔ وہ صلیبی جنگوں کے زمانے میں مصر اور فلسطین بھی گیا باوجودیکہ وہ عیسائی تھا لیکن مسلمان اس نیک دل اور محبوب شخص کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آئے اور اس کے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دیا ۔ وہ ۱۱۸۱ء سے ۱۲۲۶ء تک زندہ رہا ۔ اس کے انتقال کے بعد کلیسا کے اعلیٰ اراکین سے اس کے حلقے کا تصادم ہوا ۔ شاید اب کلیسا اس فقر و فاقے کی زندگی کا قائل نہیں رہا تھا وہ ابتدائی زمانہ کے اس عیسائی عقیدے سے بہت آگے بڑھ گیا ۔ چنانچہ ۱۳۱۸ء میں مارسلز میں اس حلقے کے چار راہبوں کو ملحد قرار دے کر زندہ جلا دیا گیا ۔

ابھی چند سال ہوئے کہ سینٹ فرانسس کی یاد میں اسیسی کے چھوٹے سے قصبہ میں ایک زبردست تہوار منایا گیا تھا ۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ یہ تہوار کس تقریب میں منایا گیا تھا ۔ غالباً اس کی سات سو سال کی برسی تھی ۔

کلیسا کے اندر ہی حلقہ فرانسس کی طرح ایک دوسری جماعت بھی پیدا ہوئی لیکن اصولوں کے لحاظ سے یہ جماعت حلقہ فرانسس سے بالکل مختلف تھی ۔ اسے اسپین کے ایک راہب سینٹ ڈومینک نے قائم کیا تھا ۔ اس لئے یہ حلقہ ڈومینک کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ بہت متعصب اور متشدد لوگ تھے ۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اولین فرض ایمان کا برقرار رکھنا ہے اور ہر چیز اس کے ماتحت ہے چنانچہ اگر سمجھانے بجھانے سے کام نہ چلے تو ان کے نزدیک جبر و تشدد میں بھی کوئی مضائقہ نہ تھا ۔

۱۲۳۳ء میں کلیسا نے مذہب میں تشدد کے دور کا باضابطہ افتتاح کیا یعنی مذہبی عدالت قائم کر دی ۔ یہ عدالت لوگوں کے مذہبی

عقائد کی چھان بین کرتی تھی اور جو لوگ ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ انھیں زندہ آگ میں جلا دینے کا حکم دیدیتی تھی۔ چنانچہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ملحد گرفتار کئے گئے اور سینکڑوں کو آگ کی نذر کر دیا۔ اس جلانے سے زیادہ خوفناک وہ اذیتیں تھیں جو ان لوگوں کو تجدید سے توبہ کرانے کے لئے پہنچائی جاتی تھیں۔ بہت سی بدنصیب عورتوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ جادوگرنیاں ہیں اس لئے انھیں زندہ جلا دیا۔ لیکن یہ حرکت مذہبی عدالت کے حکم سے نہیں ہوئی بلکہ عوام نے اپنے طور پر ایسا کیا۔ خاص کر انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں یہ صورتیں بہت پیش آئیں۔

پوپ نے ایک فتویٰ دیا جس کی رو سے ہر شخص کا یہ فرض قرار دیا تھا کہ وہ دوسروں کے مذہبی عقائد کی مخبری کرے۔ اس نے علم کیمیا کی سخت مذمت کی۔ اور اسے شیطانی علم کے نام سے تعبیر کیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ تمام ظلم و تشدد دیانتداری کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ یعنی سچ مچ وہ یہ ایمان رکھتے تھے۔ کہ لوگوں کو آگ میں جلا کر وہ ان کی اور دوسروں کی روحوں کو ہلاکت سے بچا رہے ہیں۔ مذہب کے علمبرداروں نے اکثر دوسروں پر زبردستی کی ہے۔ اپنے عقائد جبراً ان سے منوائے ہیں اور ہمیشہ اسے دینی خدمت سمجھا ہے۔ خدا کے نام پر انھوں نے بیشمار قتل اور خون کئے اور "غیر فانی روح" کو بچانے کے دعویدار بن کر انھوں نے فانی جسم کو جلا کر خاک سیاہ کر دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ اس لحاظ سے مذہب کا نامۂ اعمال نہایت سیاہ ہے۔ لیکن دیدہ دانستہ مظالم کرنے کے معاملہ میں عیسائیوں کی مذہبی عدالت سب سے سبقت لے گئی تھی۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ جو لوگ اِن دحشیانہ

حرکات کے ذمہ دار تھے وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا پکا عقیدہ تھا کہ یہ طرز عمل بالکل صحیح اور حق بجانب ہے۔

جیسے جیسے پوپ یورپ پر ظلم توڑتے اور تشدد کرتے تھے۔ ان کا وہ اقتدار جو انہیں بادشاہوں اور شہنشاہوں پر حاصل ہو گیا کم ہوتا جاتا تھا۔ اب وہ دن نہیں رہے تھے کہ وہ بادشاہوں کو مذہب سے خارج کرنے کی دھمکی دے کر ان کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکیں۔ جس زمانے میں مقدس رومی سلطنت کی حالت خراب تھی اور کوئی شہنشاہ نہیں تھا یا تھا تو وہ روم میں رہتا نہیں تھا۔ اس وقت فرانس کے بادشاہ نے پوپ کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا ۱۳۰۳ء میں شاہ فرانس کو پوپ کی کوئی حرکت ناگوار گذری چنانچہ اس نے ایک شخص کو پوپ کے پاس بھیجا۔ یہ شخص خود پوپ کے محل میں پہنچ کر اس کے سونے کے کمرے میں گھس گیا اور اس کے منہ پر اسکو برا بھلا کہا خوب ذلیل کیا۔ اس بدسلوکی کے خلاف کسی ملک سے ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ اب ذرا اس واقعہ کو یاد کرو جب کنوسہ کے مقام پر ایک بادشاہ برف میں ننگے پیر پوپ کی اجازت کے انتظار میں محل کے باہر کھڑا رہا تھا۔

چند سال بعد یعنی ۱۳۰۹ء میں، نئے پوپ نے جو فرانسیسی تھا، اوینون میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ مقام اب فرانس میں ہے۔ یہاں ۱۳۷۷ء تک پوپ قیام پذیر اور فرانسیسی بادشاہوں کے زیر اثر رہے۔ ۱۳۷۸ء میں مجلس کلیسا میں اختلاف ہو گیا اور دونوں فریقوں نے اپنے اپنے علیحدہ پوپ منتخب کر لئے۔ ایک تو روم میں

رہتا تھا۔ اور اُسے مُقدس رومی سلطنت کا شہنشاہ اور شمالی یورپ کے بشیتر ملک پوپ تسلیم کرتے تھے دوسرا مخالف "مخالف پوپ" کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ اوینون میں رہتا تھا۔ اور اُسے شاہ فرانس اور اس کے چند رفقا مانتے تھے۔ چالیس برس تک یہ صورت قائم رہی اور پوپ اور "مخالف پوپ" ایک دوسرے کو ملعون قرار دیتے اور مذہب سے خارج کرتے رہے ۱۴۱۷ء میں پھر صلح ہو گئی اور روم کے نئے پوپ کو دونو فریقوں نے تسلیم کر لیا۔ لیکن ان دونوں پوپوں کے بیہودہ جھگڑوں کا یورپ کے باشندوں پر بہت خراب اثر پڑا ہوگا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نمائندہ کہتے تھے جب ان کے افعال ایسے بُرے ہوں تو ان کے تقدس اور خلوص میں شک پیدا ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ان جھگڑوں کی وجہ سے لوگوں نے آنکھ بند کر کے مذہب کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن ابھی ان کی آنکھیں پوری طرح نہ کھلی تھیں۔

وکلیف نامی ایک انگریز نے کھلم کھُلا کلیسا پر اعتراضات کرنے شروع کیے، وہ خود پادری تھا اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسری کے عہدے پر مامور تھا۔ وہ خاص طور پر اس لئے مشہور ہے کہ اس نے انجیل کا پہلے پہل انگریزی میں ترجمہ کیا۔ زندگی میں تو وہ روم کے غیض و غضب سے بچ گیا۔ لیکن مرنے کے ۳۱ برس بعد یعنی ۱۴۱۵ء میں کلیسا کی ایک مجلس نے حکم دیا کہ اس کی ہڈیاں کھود کر نکالی جائیں اور آگ میں جلا دی جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا!

ویکلف کی ہڈیوں کو کھود کر جلا دینا تو آسان تھا لیکن اس کے خیالات کو روکنا آسان نہ تھا چنانچہ وہ پھیل کر رہے اور بوہیمیا۔ (چیکوسلوویکیہ) تک پہنچے۔ یہاں جان ہُس نے جو پراگ یونیورسٹی کا صدر معلم تھا اس کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ اگرچہ پوپ نے اسے مذہب سے خارج کر دیا تھا لیکن اس کے وطن میں کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکتا تھا کیونکہ وہاں وہ بہت ہر دلعزیز تھا۔ اس لئے انھوں نے فریب سے کام لیا۔ شہنشاہ نے اسے جان کی امان دے کر سوئزرلینڈ میں مدعو کیا۔ جہاں شہر کانسٹنس میں مجلس کلیسا کا اجلاس ہو رہا تھا جب وہ وہاں گیا تو اس سے مطالبہ کیا گیا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور توبہ کرے لیکن اس نے صاف انکار کیا اور کہا کہ جب تک مجھے قائل نہ کر دیا جائے میں ہرگز اس کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ جان کی امان کے وعدے کے باوجود اسے زندہ جلا دیا گیا۔ یہ ۱۴۱۵ء کا واقعہ ہے۔ ہُس بڑا دلیر شخص تھا جس چیز کو وہ غلط سمجھتا تھا اس کا اقرار کرنے کے بجائے اس نے اس دردناک موت کو ترجیح دی۔ وہ آزادی ضمیر اور آزادئ کلام پر قربان ہو گیا آج اس کا شمار چیکوسلوویکیہ کے سورماؤں میں ہوتا ہے اور لوگ بڑے عزت و احترام سے اسے یاد کرتے ہیں۔

جان ہُس کا خون رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ وہ گویا ایک چنگاری تھی جس نے اس کے مریدوں میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ پوپ نے ان کے خلاف مذہبی جنگ کا اعلان کیا۔ مذہبی جنگیں اس زمانہ میں بہت آسان تھیں اور ان میں کچھ خرچ تو ہوتا نہ تھا کیونکہ بہت سے بدمعاش اور

سر پھرے اس انتظار میں رہتے تھے اور ایسے موقعوں سے خوب فائدہ اُٹھاتے تھے۔ بقول ایچ۔ جی۔ ویلز، ان مجاہدوں نے بے گناہوں پر "بدترین ظلم" توڑے۔ لیکن جب ہُس کے پیرودُں کی فوج جنگی ترانے گاتی ہوئی پہنچی تو یہ سارے غازی فرار ہو گئے اور جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی بھاگ گئے۔ یعنی جب تک بے گناہ دیہاتی ان کے رحم وکرم پر تھے، اس وقت تک ان میں سپاہیانہ جوش وخروش کی کمی نہ تھی لیکن جب منظم فوج آ پہنچی تو ان کا سارا جوش کافور ہو گیا۔

مطلق العنان اور سخت گیر مذہب کے خلاف اس طرح بلووں اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ آگ سارے یورپ میں پھیل گئی جس سے عیسائی مذہب میں اختلافات پیدا ہو گئے چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ عیسائیوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دو فرقے ہو گئے۔

۷۱

استبداد کے خلاف جنگ

۳۰ر جون ۱۹۳۲ء

مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کے مذہبی جھگڑوں کا حال تمہیں بے مزا معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن ہے یہ بہت اہم، کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جدید یورپ کی کس طرح تشکیل ہوئی۔ اور یورپ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مذہبی آزادی کی جنگ جو چودھویں صدی عیسوی سے یورپ میں شروع ہوئی اور سیاسی آزادی کی جنگ جو آگے چل کر چھڑے گی حقیقت میں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یہ گویا تحکم اور حاکمیت کے خلاف جنگ تھی۔ مقدس رومی سلطنت اور پوپ دونوں مطلق العنانی کے مظہر تھے اور لوگوں کی روح کو کچل ڈالنا چاہتے تھے۔ شہنشاہ خدا کا نمائندہ تسلیم کیا جاتا تھا اور اس سے زیادہ پوپ۔ کسی کو اس پر شک کرنے کا حق نہ تھا اور نہ کوئی ان کے احکام سے سرتابی کرسکتا تھا۔ فرمانبرداری سب سے بڑا وصف سمجھی جاتی تھی۔ اپنی ذاتی قوت فکر سے کام لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ گویا ایک طرف آنکھیں بند کرکے تعمیل کرنے کا معاملہ تھا اور دوسری طرف ضمیر کی آزادی تھی۔ ان دونوں میں کھلم کھلا مقابلہ تھا۔ چنانچہ یورپ میں صدیوں تک ضمیر کی آزادی کے لئے اور اس کے بعد سیاسی آزادی کے لئے سخت جدوجہد جاری رہی۔ بہت سے نشیب و فراز دیکھنے اور

طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد انھیں کسی حد تک کامیابی نصیب ہوئی لیکن ٹھیک اس وقت جب لوگ اس پر خوشیاں منا رہے تھے کہ ہم آزادی کی منزل پر پہنچ گئے ہیں انھیں اس کا احساس ہوا کہ وہ دھوکے میں تھے۔ اقتصادی آزادی کے بغیر کسی آزادی کی کوئی حقیقت نہیں۔ جب تک افلاس موجود ہے تو سب بیکار ہے۔ کسی بھوکے سے یہ کہنا کہ تو آزاد ہے گویا اس کی ہنسی اُڑانا ہے غرض کہ دوسرا قدم اقتصادی آزادی کی جنگ کے لئے اٹھا۔ اور یہ جنگ آج بھی ساری دنیا میں جاری ہے۔ صرف ایک ملک کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں لوگوں کو عام طور پر اقتصادی آزادی حاصل ہو گئی ہے اور وہ روس یا سویٹ یونین ہے۔

ہندوستان میں ضمیر کی آزادی کے لئے کبھی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ یہاں شروع زمانے ہی سے لوگوں کو یہ آزادی حاصل تھی۔ عقیدے کے معاملے میں وہ بالکل آزاد تھے اور اس سلسلہ میں جبر و تشدد سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ لوگوں کو دلیل اور بحث سے قائل کیا جاتا تھا۔ ڈنڈے اور سولی سے نہیں۔ ممکن ہے کبھی کبھی جبر و تشدد بھی ہوتا ہو۔ لیکن آزادی ضمیر کا حق قدیم آریہ نظریوں کے مطابق عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہ نکلا۔ چونکہ لوگ اس طرف سے مطمئن تھے کہ اصولاً انھیں پوری آزادی حاصل ہے۔ اس لئے وہ اس معاملہ میں زیادہ چوکس نہ رہے اور رفتہ رفتہ وہ ان رسم ورواج اور توہمات میں پھنس گئے جو کسی بگڑے ہوئے مذہب میں پیدا

ہو جاتی ہیں۔ ان میں حد سے زیادہ مذہبیت پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے وہ بہت پیچھے جا پڑے اور مذہبی اقتدار کے غلام بن گئے۔ یہ پوپ یا کسی دوسرے فرد کا اقتدار نہ تھا بلکہ "مقدس کتابوں" اور رسم و رواج کا۔ چنانچہ ہندوستانی آزادیٔ ضمیر کے دعوے تو کرتے تھے اور اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس سے کوسوں دور تھے اور ان خیالات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے جو پرانی کتابوں اور رسم و رواج نے ان کے دل میں بٹھا دئے تھے۔ گویا اقتدار اور استبداد کی ہمارے یہاں بھی حکمرانی تھی اور ہمارے دماغوں پر بھی اس کا پورا قبضہ تھا جو زنجیریں ہمارے جسم کو جکڑ دیتی ہیں وہ بھی بُری ہیں۔ لیکن عقائد اور تعصبات کی غیر محسوس زنجیریں جو ہمارے دماغوں کو جکڑے رہتی ہیں ان سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ وہ خود ہماری بنائی ہوئی ہیں اور اگرچہ اکثر ہمیں ان کا احساس نہیں ہوتا لیکن ہم اس بُری طرح ان کی گرفت میں ہوتے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ جب مسلمان ہندوستان میں حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تو مذہب کے معاملہ میں تھوڑا بہت جبر ہونے لگا۔ دراصل یہ فاتح اور مفتوح کے درمیان ایک سیاسی جنگ تھی۔ لیکن اسے مذہبی رنگ میں رنگ دیا گیا۔ چنانچہ کبھی کبھی مذہبی تشدد بھی ہوا۔ لیکن اس سے یہ خیال کر لینا بالکل غلط ہے کہ خود اسلام میں اس قسم کا جبر روا ہے۔ سُنا ہے کہ جب ۱۶۱۰ء میں تمام عرب اسپین سے نکالے گئے تو ایک اسپینی مسلمان نے بہت دلچسپ تقریر کی تھی۔ اس نے عیسائیوں کی مذہبی عدالت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا

کہ "کیا ہمارے فتحیاب بزرگوں نے کبھی ایک دفعہ بھی یہ کوشش کی کہ عیسائیت اسپین کی سرزمین سے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دی جائے۔ حالانکہ یہ اُن کے اختیار کی بات تھی۔ کیا انھوں نے تمہارے آبا و اجداد کو اپنے رسم و رواج کی پابندی کی پوری آزادی نہیں دی۔ حالانکہ وہ ان کے غلام تھے۔ .... اگر بجبر مسلمان بنانے کی اکا دکا مثالیں ملتی بھی ہیں تو وہ اتنی کم ہیں کہ قابل لحاظ نہیں اور ان کے ذمہ دار صرف وہ لوگ ہیں جن کے دل میں خدا اور رسول کا خوف نہ تھا اور جنھوں نے اسلام کے مقدس احکام کی صریحی خلاف ورزی کی۔ جو مسلمان ایسا کرے وہ مسلمان کے معزز لقب کا مستحق نہیں۔ تم ہمارے ہاں کوئی ایسی مثال نہیں پیش کر سکتے کہ مذہب کے اختلاف کی بنا پر کوئی ایسی خونی عدالت قائم کی گئی ہو جسے تمہاری قابل نفرت مذہبی عدالت سے دور کی بھی نسبت ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے مذہب کا دروازہ ان لوگوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے جو خوشی سے اس میں داخل ہونا چاہیں۔ لیکن ہمارے قرآن پاک نے ہرگز یہ اجازت نہیں دی ہے کہ لوگوں کے ضمیر پر جبر کیا جائے"۔

غرض کہ ہم نے مذہبی رواداری اور ضمیر کی آزادی کو جو قدیم ہندوستانی معاشرت کی نمایاں خصوصیات تھیں ایک حد تک کھو دیا۔ لیکن یورپ بڑی جد وجہد کے بعد ان اصولوں کے معاملے میں نہ صرف ہمارے برابر پہنچ گیا بلکہ ہم سے بہت آگے نکل گیا آج ہندوستان میں کبھی کبھی فرقہ دارانہ جھگڑے ہوتے ہیں اور ہندو مسلم آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے

ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ افسوسناک صورت عام نہیں ہے بلکہ گاہے گاہے کہیں کہیں رونما ہو جاتی ہے۔ ویسے ہم عام طور پر امن اور دوستی کے ساتھ رہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے اصل مفاد بالکل یکساں ہیں۔ پھر بھی ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ وہ مذہب کے نام پر اپنے بھائیوں کا سر پھوڑیں ہمیں اس چیز کا سدباب کر دینا چاہئیے۔ اور یقیناً ہم ایسا کریں گے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم یہ کام ہے کہ ہم رسم و رواج اور توہمات کے جال سے نکلنے کی کوشش کریں کیونکہ یہ مذہب کے پردے میں ہمیں جکڑے ہوئے ہیں۔

مذہبی رواداری کی طرح ہندوستان میں سیاسی آزادی کی بھی بڑی اچھی ابتدا ہوئی تھی۔ تمہیں دیہی جمہوریتوں کا تو خیال ہو گا۔ اور یہ بھی یاد ہو گا کہ ابتدا میں بادشاہوں کے اختیارات کتنے محدود تھے۔ یورپ کے بادشاہوں کی طرح یہاں ان کے آسمانی حقوق تسلیم نہیں کئے جاتے تھے چونکہ ہمارے تمام سیاسی نظام کی بنیاد گاؤں کی آزادی پر قائم تھی۔ اس لئے لوگ اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ کون بادشاہ ہے کون نہیں۔ ان کی مقامی آزادی برقرار رہے تو پھر وہ بالاتر حاکم سے کوئی مطلب نہ رکھتے تھے مگر یہ نہایت خطرناک اور احمقانہ خیال تھا۔ رفتہ رفتہ بالاتر حاکم نے اپنی قوت بڑھالی اور دیہات کی آزادی میں دخل دینے لگا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جب یہاں بالکل مطلق العنان حکمراں ہونے لگے اور نہ گاؤں کی حکومت خود اختیاری باقی رہی اور نہ اوپر سے لے کر نیچے تک آزادی کا کوئی شائبہ باقی رہا۔

۷۲
دورِ وسطیٰ کا خاتمہ

یکم جولائی ۱۹۳۲ء

آؤ۔ ذرا تیرھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک کے یورپ پر ایک نظر اور ڈالیں۔ اس زمانہ میں وہاں سخت بدنظمی تشدد اور خانہ جنگی کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان کی حالت بھی اس وقت کچھ اچھی نہ تھی۔ لیکن یورپ کے مقابلہ میں تو یہاں بڑا امن تھا مغلوں نے یورپ میں بارود رائج کردی تھی چنانچہ اب بندوقیں استعمال ہونے لگی تھیں۔ بادشاہوں نے اپنے باغی امرار کی سرکوبی کرنے میں ان سے بہت کام لیا۔ اس معاملہ میں انھیں شہروں کے نئے تاجر طبقہ سے بھی بڑی مدد ملی۔ ان نوابوں میں آپس میں بھی آئے دن جنگ و جدال ہوتی رہتی تھی جس کی وجہ سے وہ کمزور ہو گئے لیکن گانوؤں کو بھی بہت نقصان پہنچا جب بادشاہ کی طاقت بڑھ گئی تو اس نے خانہ جنگی کا انسداد کردیا۔ بعض ملکوں میں تخت و تاج کے دو دعویداروں میں بھی لڑائیاں ہوئیں مثلاً انگلستان میں خاندان یارک اور خاندان لنکاسٹر میں خوب جنگ رہی۔ دونوں فریقوں نے گلاب کے پھول کو اپنا جنگی نشان مقرر کیا تھا۔ ایک نے سفید گلاب کو۔ اور دوسرے نے سرخ گلاب کو۔ اسی وجہ سے یہ لڑائیاں جنگ

گلاب کے نام سے مشہور ہیں۔ ان خانہ جنگیوں میں بے شمار رئیس اور امرار مارے گئے۔ کچھ صلیبی جنگوں کی نذر ہوئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان امرار کا زور گھٹ گیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اصل طاقت امرار سے منتقل ہو کر جمہور کے ہاتھ میں آگئی بلکہ بادشاہ زیادہ طاقتور ہو گیا۔ عوام کی حالت بدستور رہی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ خانہ جنگیوں کے کم ہو جانے سے ان کی حالت کچھ سنبھل گئی۔ اب رفتہ رفتہ بادشاہ مطلق العنان اور مختار کل ہو گیا۔ نئے تاجر طبقے اور بادشاہ میں ابھی تصادم نہیں ہوا تھا۔ یہ تو آگے چل کر ہوا۔

اس جنگ اور خونریزی سے زیادہ خوفناک طاعون کی وبا تھی جو ۱۳۴۸ء میں سارے یورپ میں پھیل گئی۔ اس کی زد میں روس اور ایشیائے کوچک سے لے کر انگلستان تک پورا یورپ آگیا تھا اس کے علاوہ یہ مصر، شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا تک پہنچی۔ پھر اس نے مغرب کا رخ کر دیا لوگ اسے "سیاہ موت" کہتے تھے۔ اور اس کی بدولت لاکھوں انسان لقمۂ اجل ہو گئے انگلستان کی تو کوئی ایک تہائی آبادی اس کی نذر ہو گئی چین اور دوسرے مقامات میں بھی اموات کی تعداد بہت زیادہ رہی لیکن تعجب ہے کہ ہندوستان اس سے محفوظ رہا۔

اس ناگہانی آفت سے یورپ کی آبادی کم ہو گئی یہاں تک کہ زمین کی کاشت کے لئے بھی کافی آدمی میسر نہ تھے! اس قحط الرجال کی وجہ سے مزدوروں کی مزدوری کچھ بڑھنا شروع ہوئی۔ لیکن

سب آئین ساز مجالس پر زمینداروں اور جائداد کے مالکوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے انھوں نے ایسے قانون نافذ کر دیئے کہ مزدوروں کو زیادہ اجرت طلب کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ انھیں سابقہ حقیر اجرتوں ہی پر کام کرنا پڑے گا۔ جب کسان اور غریب لوگ حد سے زیادہ کچلے اور دبائے گئے اور ان کا صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو انھوں نے بغاوت کرنا شروع کر دی۔ سارے یورپ میں پے در پے کسانوں کی بغاوتیں ہونے لگیں۔ فرانس میں بھی ۱۳۵۸ء میں ایک بغاوت ہوئی جو "ژاکری" کے نام سے مشہور ہے۔ انگلستان میں ۱۳۸۱ء واٹ ٹائیلر کی سرکردگی میں بغاوت ہوئی جس میں ٹائیلر بادشاہ کے سامنے قتل کیا گیا۔ اکثر یہ بغاوتیں بڑے ظالمانہ طریقے سے دبائی گئیں لیکن مساوات کے نئے خیالات آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں اب یہ سوال پیدا ہونے لگا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم غریب ہیں اور بھوکوں مرتے ہیں اور دوسرے دولتمند ہیں اور ان کے پاس ہر چیز کی افراط ہے۔ کیا وجہ ہے کہ کوئی آقا ہے اور کوئی غلام۔ کوئی اچھے اچھے کپڑے پہنتا ہے اور کسی کو تن ڈھانکنے کے لئے یہ چیتھڑے بھی نہیں ملتے۔ گویا اب قتدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی پرانی روایات جن پر جاگیرداری نظام کی بنیاد قائم تھی ختم ہوتی جا رہی تھیں اور کسان بار بار سر اٹھاتے تھے لیکن وہ کمزور اور غیر منظم تھے اس لئے دبا دیئے جاتے تھے مگر کچھ عرصے بعد وہ پھر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور یہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔

انگلستان اور فرانس مسلسل برسر جنگ رہے۔ چنانچہ چودھویں صدی کے اوائل سے پندرھویں صدی کے وسط تک ان میں سو سالہ جنگ ہوئی۔ فرانس کے مشرق میں برگنڈی علاقہ تھا۔ یہ بہت طاقتور ریاست تھی اور برائے نام شاہ فرانس کے ماتحت تھی۔ لیکن تھی بہت سرکش۔ اس لئے انگریزوں نے فرانس کے خلاف اس سے سازش کر لی اور دوسری حکومتوں کو بھی ملا لیا چنانچہ کچھ زمانہ کے لئے تو فرانس چاروں طرف سے گھر گیا تھا۔ مغربی فرانس کا بہت بڑا حصہ عرصے تک انگریزوں کے قبضے میں رہا اور انگلستان کے بادشاہ نے شاہ فرانس کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا۔ جب فرانس ذلت کے گڑھے میں پڑا تھا۔ اور اُسے نجات کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ اس وقت ایک نوجوان کسان لڑکی کی صورت میں امید اور کامرانی نے اپنی شکل دکھائی۔ آرلیاں کی دیوی، جون آف آرک سے تو تم واقف ہو۔ وہ تمہاری ہیروئن ہے۔ اس نے اپنے ہم وطنوں میں جن کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں نئے سرے سے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا اور انھیں عمل کے لئے اُبھارا۔ اس کی رہنمائی میں فرانسیسیوں نے انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال بھگا دیا۔ لیکن ان سب خدمات کا اسے یہ انعام ملا کہ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور مذہبی عدالت نے اس کی موت کا فیصلہ صادر کر دیا۔ وہ انگریزوں کے ہاتھ پڑ گئی اور انھوں نے کلیسا کو مجبور کیا کہ وہ اسے مجرم قرار دے۔ پھر سنہ ۱۴۳۱ء میں روئیں کے بازار میں انھوں نے اسے

زندہ جلا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد رومی کلیسا اپنے کیے پر پچھتایا اور اس نے اپنے سابقہ فیصلہ کو جس کی رو سے جون مجرم قرار دی گئی تھی مسترد کر دیا۔ اور ایک بڑی مدت کے بعد تو اس کا شمار اولیا میں ہونے لگا۔

جون فرانس کا نام لے کر کھڑی ہوئی تھی اور اس کا نعرہ یہ تھا کہ وطن کو پردیسیوں کے پنجے سے چھڑانا چاہیے۔ یہ بالکل نئی قسم کی بات تھی۔ اس وقت لوگوں کے ذہن میں جاگیرداری تخیل ایسا سمایا ہوا تھا کہ وطنیت کا خیال ان کے دماغ میں آیا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جون کی بات نے انھیں حیرت میں ڈال دیا اور وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے غرضکہ جون آف آرک کے زمانے سے فرانس میں وطنیت کے دھندلے آثار نظر آنے لگے۔

انگریزوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے بعد شاہ فرانس نے برگنڈی کی طرف رُخ کیا جس نے اُسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ بالآخر اس نے اس طاقتور ماتحت کو زیر کر لیا اور ۱۴۸۳ء میں برگنڈی بھی سلطنت فرانس میں شامل ہو گیا۔ اب شاہ فرانس کی طاقت بھی بڑھ گئی اور اس نے اپنے تمام امرار کو کچل ڈالا یا زیر کر لیا۔ برگنڈی کے الحاق کے بعد فرانس اور جرمنی ایک دوسرے کے مقابل ہو گئے اور ان کی سرحدیں مل گئیں۔ لیکن فرانس میں تو ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم تھی لیکن جرمنی کمزور تھا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔

انگلستان بھی اسکاٹ لینڈ کو فتح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کشمکش بھی عرصہ تک جاری رہی اور اسکاٹ لینڈ اکثر انگلستان

کے مقابلہ میں فرانس کا ساتھ دیتا رہا۔ ۱۳۱۴ء میں اسکاٹ لینڈ والوں نے رابرٹ بروس کی سرکردگی میں بینک کے مقام پر انگریزی فوجوں کو شکست دیدی۔

اس سے بھی پہلے یعنی بارھویں صدی سے انگریزوں نے آئرلینڈ کو فتح کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ اس بات کو سات سو برس ہو چکے ہیں۔ جب سے اب تک بار بار لڑائیاں۔ بغاوتیں۔ تخویف اور مظالم ہوتے رہے ہیں۔ پھر بھی آئرلینڈ کا مسئلہ اب تک طے نہیں ہوا ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک برٹشی حکومت کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کرتا رہا اور اس کی ہر نسل انگریزوں کے خلاف بغاوت کرتی آئی ہے۔ ہندوستان کی طرح آئرلینڈ کے مسئلہ کا بھی آزادی کے سوا اور کوئی حل نہیں ہے۔

تیرھویں صدی میں یورپ کے ایک اور چھوٹے سے ملک سوئزرلینڈ نے اپنی آزادی کے لئے زور لگایا۔ یہ ملک مقدس رومی سلطنت میں شامل تھا اور آسٹریا والوں کی اس پر حکومت تھی۔ تم نے ولیم ٹیل اور اس کے بیٹے کا قصہ تو سنا ہوگا۔ لیکن غالباً یہ قصہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز مقدس رومی سلطنت کے خلاف سوئزرلینڈ کے کسانوں کی بغاوت ہے۔ انھوں نے سلطنت کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا تھا سب سے پہلے ۱۲۹۱ء میں تین ضلعوں نے "ابدی اتحاد" کے نام سے ایک جماعت قائم کرکے بغاوت کا علم بلند کیا۔ پھر دوسرے ضلع بھی شریک ہو گئے۔ بالآخر ۱۴۹۹ء میں سوئزرلینڈ آزاد ہوگیا اور وہاں جمہوریت قائم ہوگئی۔

یہ مختلف قوموں کا وفاق تھا اس لئے "اتحاد سوئزرلینڈ" کے نام سے موسوم ہوا۔ شاید تمہیں خیال ہو کہ پہلی اگست کو ہم نے سوئزرلینڈ کے اکثر پہاڑوں پر آگ کے شعلے دیکھے تھے۔ دراصل یہ ان کا قومی دن تھا۔ کیونکہ اسی دن انقلاب شروع ہوا تھا اور آگ کا جلنا آسٹریا کے بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی نشانی مقرر کی گئی تھی۔

اب ذرا دیکھیں کہ مشرقی یورپ میں قسطنطنیہ کس حال میں ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ۱۲۰۴ء میں لاطینی مجاہدوں نے یونانیوں سے یہ شہر چھین لیا تھا۔ ۱۲۶۱ء میں یونانیوں نے انھیں مار بھگا دیا اور مشرقی سلطنت پھر قائم کرلی۔ لیکن ایک دوسری اور اس سے بڑی آفت سر پر منڈلا رہی تھی۔ جب مغلوں نے سارے ایشیا پر دھاوا بولا تو پچاس ہزار عثمانی ترک ان سے بچ کر نکل کھڑے ہوئے۔ یہ سلجوقی ترکوں سے بالکل مختلف تھے۔ اور اپنا سلسلہ بانی خاندان عثمان سے ملاتے تھے۔ اس لئے یہ عثمانی ترک کہلاتے ہیں۔ انھوں نے مغربی ایشیا میں سلجوقیوں کے یہاں پناہ لی۔ پھر جیسے جیسے سلجوقی کمزور ہوتے گئے یہ طاقت پکڑتے گئے اور برابر پھیلتے چلے گئے۔ دوسرے حملہ آوروں کی طرح انھوں نے قسطنطنیہ پر حملہ نہیں کیا بلکہ ۱۳۵۳ء میں وہ اس کے پاس گزر کر یورپ پہنچ گئے۔ وہاں ان کا اقتدار بڑی تیزی سے بڑھا اور انھوں نے بلغاریہ اور سرویا پر قبضہ کرکے ادرنہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ اب گویا عثمانی سلطنت قسطنطنیہ کے دونوں طرف ہوگئی یعنی ایک طرف ایشیا میں اور دوسری طرف یورپ میں۔ اس طرح انھوں نے قسطنطنیہ کو گھیر لیا۔ بس صرف یہ شہر ان کی سلطنت میں شامل تھا

دیکھو وہ مغرور مشرقی رومی سلطنت جو تقریباً ایک ہزار برس سے قائم تھی اب صرف ایک شہر میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ ترک بڑی تیزی سے مشرقی رومی سلطنت کو اپنے میں جذب کر رہے تھے لیکن ترکی سلطانوں اور رومی شہنشاہوں میں بڑے دوستانہ تعلقات قائم تھے اور آپس میں شادی بیاہ بھی ہونے لگے تھے۔ بالآخر ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ اب جہاں ہم ترکوں کا ذکر کریں اس سے مراد عثمانی ترک ہوں گے۔ سلجوقی ترک تو اب منظر عام سے ہٹ گئے تھے۔

اگرچہ قسطنطنیہ کی فتح غیر متوقع نہیں تھی پھر بھی یہ ایسا اہم واقعہ تھا جس نے سارے یورپ کو ہلا ڈالا۔ اس کے معنی ایک تو یہ تھے کہ ایک ہزار برس کی قدیم یونانی مشرقی سلطنت ختم ہو گئی اور دوسرے یہ کہ یورپ پر مسلمانوں کا حملہ نئے سرے سے شروع ہو گیا۔ ترک برابر بڑھتے جا رہے تھے اور کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یورپ کو فتح کر کے چھوڑیں گے۔ لیکن وائنا کے دروازے پر وہ روک دیئے گئے۔

چھٹی صدی میں شہنشاہ جسٹی نین نے سینٹ صوفیہ کا جو عظیم الشان گرجا بنوایا تھا ترکوں نے اسے مسجد بنا لیا اور اس کا نام مسجد ایاصوفیہ رکھا۔ اس کے علاوہ گرجے کے خزانے کو بھی کچھ لوٹا۔ یورپ اس واقعہ سے بھڑک اٹھا لیکن کر ہی کیا سکتا تھا۔ بہرحال حقیقت امر یہ ہے کہ ترکی سلطان نے قدیم یونانی کلیسا کے ساتھ بڑی روا داری کا برتاؤ کیا۔ اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان محمد ثانی نے یہ اعلان کیا کہ میں خود یونانی کلیسا کا محافظ ہوں۔ بعد کے زمانے

کا ایک سلطان جو سلیمان اعظم کے نام سے مشہور ہے اپنے آپ کو مشرقی رومی شہنشاہوں کا جانشین کہتا تھا۔ چنانچہ اس نے قیصر کا لقب بھی اختیار کر لیا تھا۔ قدیم روایات میں کتنی کشش ہوتی ہے۔

قسطنطنیہ کے یونانیوں کو عثمانی ترکوں کا آنا کچھ زیادہ ناگوار نہ گذرا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ قدیم سلطنت دم توڑ رہی ہے۔ اس لئے انھوں نے پوپ اور مغربی ملکوں کے عیسائیوں کے مقابلہ میں ترکوں کو ترجیح دی۔ لاطینی مجاہد ان کے نزدیک بہت برے ثابت ہو چکے تھے۔ کہتے ہیں کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کے گذشتہ محاصرے کے دوران میں ایک بازنطینی رئیس نے یہاں تک کہا تھا کہ "رسول کا عمامہ پوپ کی کلاہ سے کہیں بہتر ہے"۔

ترکوں نے ایک عجیب قسم کا فوجی رسالہ ترتیب دیا تھا جسے وہ جانثار کہتے تھے۔ یعنی وہ خراج کے طور پر عیسائیوں سے ان کے چھوٹے چھوٹے لڑکے لے لیتے تھے اور انھیں خاص ترتیب دیتے تھے۔ والدین سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو جدا کرنا ظلم ضرور ہے لیکن ان لڑکوں کو بہت کچھ نفع بھی پہنچا۔ کیونکہ انھیں بڑی اچھی تربیت ملی اور وہ ایک فوجی امراء کی جماعت بن گئے۔ جانثاروں کی یہ جماعت عثمانی ترکوں کا دست و بازو ثابت ہوئی۔

اسی طرح مصر میں بھی مملوکوں کی ایک جماعت بنالی گئی تھی آگے چل کر اسے بہت زیادہ طاقت حاصل ہو گئی۔ یہاں تک کہ مصر کے سلاطین بھی اسی جماعت سے ہوئے ہیں۔

قسطنطنیہ کے ساتھ عثمانی ترکوں کو اپنے پیشرووں یعنی بازنطینی

شہنشاہوں کی تعیشات اور بداعمالیوں کی بہت سی بری عادتیں بھی وراثت میں ملیں۔ وہ بازنطینیوں کی بگڑی ہوئی شہنشاہیت کے رنگ میں ڈوب گئے اور اس طرح رفتہ رفتہ ان کی طاقت کو گھن لگ گیا۔ لیکن کچھ عرصے تک وہ بہت طاقتور رہے اور تمام عیسائی یورپ ان سے تھراتا رہا۔ انھوں نے مصر بھی فتح کرلیا اور عباسی خلیفہ سے جو بالکل بے دست و پا اور کمزور تھا، منصب خلافت حاصل کرلیا اس کے بعد عثمانی سلطان خلیفہ ہوتے رہے یہاں تک کہ ابھی کوئی آٹھ برس ہوئے کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے بادشاہت اور خلافت دونوں کا خاتمہ کردیا۔

قسطنطنیہ کی فتح کا واقعہ تاریخ میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس روز دنیا کا ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہوا۔ یعنی دور وسطی ختم ہوا۔ ہزار برس کے تاریک دور کا خاتمہ ہوگیا اور یورپ میں عام بیداری۔ حیات نو اور جوش عمل نظر آنے لگا۔ اسے نشاۃ ثانیہ کی ابتدا کہتے ہیں جب کہ علم و ادب نے نئے سر سے جنم لیا۔ لوگ گہری نیند سے جاگ اٹھے۔ انہوں نے پلٹ کر صدیوں پیچھے قدیم یونان کے عروج کے زمانے پر نظر ڈالی اور اس سے استفادہ کرنا شروع کیا کلیسا نے زندگی کا جو ادا اس اور بھیانک تصور قائم کردیا تھا۔ اب دماغ اس سے بغاوت کرنے لگے اور وہ زنجیریں جو لوگوں کی روح کو جکڑے ہوئے تھیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ اب پھر یونانیوں کا سا قدیم جمالیاتی ذوق عود کر آیا اور مصوری۔ سنگ تراشی اور تعمیرات کے حسین سے حسین نمونوں سے سارا یورپ مالا مال ہوگیا۔

یہ تمام صورتیں قسطنطنیہ کے فتح ہوتے ہی یکایک نمودار نہیں ہوئیں
ایسا خیال کرنا تو بہت لغو ہے۔ ترکوں کی فتح سے اس انقلاب کی
رفتار میں بس ذرا سی تیزی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ بہت سے اہل علم اور
قابل لوگ قسطنطنیہ سے ہجرت کر کے مغرب کی طرف چلے گئے۔ ٹھیک
اس وقت جب کہ یورپ اچھی چیز کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کے
لئے بالکل آمادہ تھا یہ لوگ اٹلی میں یونانی ادب کے خزانے لے
کر پہنچے گویا فتح قسطنطنیہ نے بھی نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں تھوڑی
بہت مدد دی۔

لیکن اس عظیم الشان انقلاب کا یہ تو محض ایک معمولی
سا سبب تھا۔ دور وسطیٰ میں اٹلی یا مغرب کے ملکوں کے لئے
قدیم یونانی ادب اور تخیل کوئی نئی چیز نہ تھا۔ یونیورسٹیوں میں
اب بھی اس کی تعلیم ہوتی تھی اور اہل فن اس سے پوری
طرح واقف تھے۔ البتہ یہ صرف چند افراد تک محدود تھا چونکہ
یہ اس وقت کے خیالات سے میل نہ کھاتا تھا اس لئے عام طور
پر مقبول نہ تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے دماغوں میں شکوک پیدا
ہونے شروع ہوئے اور اس طرح زندگی کے نئے تصور کے لئے
میدان تیار ہو گیا۔ وہ موجودہ حالات سے مطمئن نہ تھے اور کسی
ایسی چیز کی جستجو میں تھے جو ان کی طبیعتوں کو زیادہ مطمئن کر سکے۔
جب وہ اس شک کی حالت میں تھے تو یکایک انھیں یونان کے
قدیم فلسفہ میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی اور انھوں نے دل کھول
کر اس کے ادب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا پھر تو انھیں ایسا

معلوم ہوا کہ گوہر مقصود ہاتھ آگیا جس سے ان کی خوشی اور جوش کی انتہا نہ رہی۔

نشاۃ ثانیہ کا دور پہلے اٹلی سے شروع ہوا پھر فرانس، انگلستان اور دوسرے مقامات میں اس کا ظہور ہوا۔ لیکن اس کی اہمیت صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ یونانی ادب اور تخیل دوبارہ زندہ ہو گیا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔ یعنی وہ تحریک جو ایک عرصہ سے یورپ میں اندر اندر ہی اپنا کام کر رہی تھی۔ اب ابھر آئی اور مختلف صورتوں میں اس کا اظہار ہونے لگا۔ نشاۃ ثانیہ اس کی ایک شکل تھی۔ اور مختلف صورتوں میں اس کا اظہار ہونے لگا جن میں سے دور بحالی کی بھی صرف ایک شکل تھی۔

(۷۳)

بحری راستوں کا دریافت ہونا

۳ر جولائی ۱۹۳۲ء

یورپ میں اب دور وسطیٰ آخری سانس لے رہا تھا۔ گویا نئے نظام کے لئے جگہ خالی کر رہا ہے۔ ہر طرف موجودہ حالات سے بددلی اور بے اطمینانی پائی جاتی ہے اور یہ چیز انقلاب اور ترقی کا پیش خیمہ ہے۔ وہ سارے طبقے جنھیں مذہبی اور جاگیرداری نظام نے تباہ کر ڈالا تھا۔ اس وقت بے چین نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ کسان بلوے کر رہے ہیں فرانسیسی میں ان بلووں کو Jacqueries ژاکری کہتے ہیں۔ یہ نام ژاک (Jacques) کسان کے نام پر پڑ گیا جو شاید کسی بلوے کا بانی ہوگا۔

تاہم کسان ابھی بہت پس ماندہ اور کمزور تھے اور ان بلووں کے باوجود ان کی حالت بہتر نہیں ہوئی۔ ان کے دن پھرنے میں ابھی دیر تھی۔ اصل مقابلہ تو پرانے جاگیرداروں اور نئے اوسط طبقے میں تھا جو ابھی پیدا ہوا تھا اور روز بروز طاقتور ہوتا جاتا تھا۔ جاگیرداری نظام میں زمین کو دولت کا خزانہ ہی نہیں بلکہ خود دولت سمجھا جاتا تھا لیکن اب ایک نئے طریقے سے دولت پیدا ہونے لگی تھی۔ یعنی زمین سے نہیں بلکہ صنعت و حرفت

اور تجارت سے اور نئے اوسط طبقے کو اس سے فائدہ پہنچ رہا تھا اسی وجہ سے ان کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ یہ کشمکش تو بہت پرانی تھی لیکن اب صورت حال بدل گئی۔ یعنی ان دونوں جماعتوں کی حیثیتوں میں فرق آ گیا۔ جاگیرداری نظام اگرچہ اب بھی باقی تھا لیکن اب وہ مدافعت کر رہا تھا اور اوسط طبقے نے اپنی قوت محسوس کر کے حملہ شروع کر دیا تھا۔ یہ جنگ سینکڑوں برس تک چلتی رہی اور اس میں اوسط طبقے کو زور بروز زیادہ کامیابی حاصل ہوتی گئی۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں اس کشمکش کی صورت مختلف تھی۔ مشرقی یورپ میں تو اس کے بہت کم آثار نظر آتے تھے۔ نمایاں حیثیت سب سے پہلے مغربی یورپ میں حاصل ہوئی۔

پچھلی بندشوں کے ٹوٹنے سے ہر طرف ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ سائنس۔ آرٹ۔ ادب۔ فن تعمیر وغیرہ میں ترقی شروع ہو گئی اور نئی نئی دریافتیں ہونے لگیں۔ جب کبھی انسانی طبیعت پرانی بندشوں کو توڑ پھینکتی ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ اس میں بہت وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارا وطن بھی آزاد ہو جائے گا تو ہماری قوم کے ذہن میں بھی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جائے گی۔ جب کلیسا کی گرفت ڈھیلی پڑی اور اس کا اثر کم ہونے لگا تو لوگوں نے گرجوں اور معبدوں کی تعمیر پر روپیہ خرچ کرنا کم کر دیا۔ اب جگہ جگہ خوبصورت عمارتیں تعمیر ہونا شروع ہو گئیں۔ لیکن یہ زیادہ تر ٹاؤن ہال یا اسی قسم کی دوسری عمارتیں تھیں۔ گوتھک طرز تعمیر بھی ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ایک

ایک نئے طرز کی نشو ونما ہوئی۔

عین اس وقت جب کہ مغربی یورپ ایک نئے جوش عمل سے سرشار تھا مشرق کے سونے نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ مارکوپولو اور دوسرے سیاحوں کی داستانوں نے جو ہندوستان اور چین ہو آئے تھے یورپ کی خیالی دنیا میں ایک ہیجان برپا کر دیا چنانچہ مشرق کی لامحدود دولت کی لالچ میں بہتوں نے سمندر کا رخ کیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا تھا۔ مشرق کے تمام برّی اور بحری راستے ان کے ہاتھ میں تھے اور وہ تجارت کی کچھ زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتے تھے۔ اس لئے تمام بڑے بڑے تاجر سخت برافروختہ تھے۔ ان کے علاوہ مہم بازوں کا نیا گروہ بھی جو مشرق کے سونے پر چھاپا مارنا چاہتا تھا اپنی جگہ پر بہت پیچ وتاب کھاتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مشرق زرین تک پہنچنے کے لئے نئے راستے نکالنے کی کوشش کی۔

آج تو بچہ بچہ یہ جانتا ہے کہ ہماری دنیا گول ہے اور سورج کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ اب یہ بات بالکل آئینہ ہو گئی ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں یہ چیز بہت واضح نہ تھی۔ اور جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے اور اسے زبان پر لاتے کی ہمت بھی کرتے تھے ان پر کلیسا کے ہاتھوں طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوتی تھیں۔ مگر کلیسا کی اس دہشت کے باوجود یہ خیال روز بروز پھیلتا جاتا تھا کہ زمین گول ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ اگر واقعی زمین گول ہے تو مغرب کی طرف چل کر



نئی بحری راستوں کی دریافت

ہم چین اور ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔ دوسروں نے سوچا کہ افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچ سکتے ہیں ملحوظ رہے کہ اس زمانہ میں نہر سوئز کا وجود نہ تھا۔ اور جہاز بحر روم سے براہ راست بحر قلزم میں نہیں جا سکتے تھے بلکہ تجارتی مال کو خشکی کے راستے غالباً اونٹوں کے ذریعہ بحر روم کے ساحل سے بحر قلزم کے ساحل پر بھیجا جاتا تھا اور وہاں پھر جہازوں پر لادا جاتا تھا۔ یہ صورت بہرحال دقت طلب تھی۔ لیکن جب مصر اور شام دونوں ترکوں کے ماتحت ہو گئے تو یہ راستہ اور خطرناک ہو گیا۔

ہندوستان کی دولت کی کشش برابر اپنا کام کر رہی تھی اور یورپ والوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ چنانچہ اسپین اور پرتگال نے تلاش و تجسس کے بحری سفروں کے معاملے میں پیشقدمی کی۔ ٹھیک اس وقت اسپین غرناطہ سے عربوں کا اخراج کر رہا تھا اراغون کے فرڈینانڈ اور کیسٹل کی اسبیلا کی شادی سے اسپین کے عیسائی متحد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۴۹۲ء میں یعنی ترکوں کے قسطنطنیہ فتح کرنے کے تقریباً پچاس برس بعد غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہی اسپین یورپ میں ایک زبردست عیسائی طاقت بن گیا۔

غرض پرتگالی تو مشرق کی طرف روانہ ہوئے اور اسپینی مغرب کی طرف۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا زبردست کارنامہ پرتگالیوں نے انجام دیا۔ یعنی ۱۴۴۵ء میں کیپ ورڈ دریافت کیا۔ یہ راس افریقہ کا انتہائی مغربی کونا ہے۔ ذرا افریقہ کے نقشے

پر ایک نظر ڈالو۔ تم دیکھوگی کہ اگر کوئی یورپ سے اس راس کی طرف چلے تو اسے جنوب و مغرب کے رُخ جانا ہوگا۔ لیکن اس راس پر پہنچ کر اس کا رُخ جنوب و مشرق کی طرف ہو جائے گا۔ اس راس کا دریافت ہوجانا بڑا امید افزا شگون سمجھا گیا۔ کیونکہ اب سے لوگوں کو یقین ہوگیا کہ اب وہ افریقہ کا چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچ جائیں گے۔

پھر بھی پورے افریقہ کا چکر کاٹنے میں چالیس برس اور لگ گئے اور کہیں ۱۴۸۶ء میں بارتھولومیو ڈائز نامی ایک پرتگالی افریقہ کے انتہائی جنوبی کونے یعنی راس امید تک پہنچ سکا۔ بالآخر اس کے چند سال بعد ہی ایک دوسرا پرتگالی واس کو ڈے گاما اس دریافت سے فائدہ اٹھا کر راس امید کے راستے ہندوستان تک پہنچ گیا۔ واس کو ڈے گاما کالی کٹ شہر میں ۱۴۹۸ء میں لنگر انداز ہوا۔

گویا ہندوستان پہنچنے کی دوڑ میں پرتگالی جیت گئے لیکن اسی زمانے میں ہماری دنیا کے پچھواڑے (امریکہ میں) بہت اہم باتیں ظہور میں آرہی تھیں۔ جن سے آگے چل کر اسپین کو فائدہ پہنچا کرسٹوفر کولمبس ۱۴۹۲ء میں امریکہ پہنچ گیا تھا۔ وہ دراصل جینوا کا ایک غریب باشندہ تھا۔ چونکہ اسے پکا یقین تھا کہ دنیا گول ہے اس لئے وہ چین اور ہندوستان پہنچنے کے لئے مغرب کی سمت جانا چاہتا تھا۔ اسے یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ سفر اتنا طویل ہوگا جتنا آخر میں ثابت ہوا وہ ہر بادشاہ کے دربار میں گیا۔ تاکہ ان میں سے کوئی اس تحقیقی سفر میں امداد دینے پر آمادہ ہو جائے۔ بالآخر اسپین کے فرڈیننڈ اور ازابیلا اس پر راضی ہوگئے اور کولمبس تین چھوٹے چھوٹے

جہاز اور ۸۸ آدمیوں کا قافلہ لے کر چل کھڑا ہوا۔ نامعلوم دنیا کی تلاش میں یہ بڑی بہادری اور جانبازی کا سفر تھا۔ کیونکہ کسے معلوم تھا کہ آگے کیا پیش آئے۔ مگر کولمبس کو کامیابی کا یقین تھا اور اس کا یہ یقین صحیح ثابت ہوا۔ غرض ۶۹ دن کے سفر کے بعد خشکی نظر آئی۔ کولمبس نے سمجھا کہ یہی ہندوستان ہے۔ در اصل یہ جزائر غرب الہند میں سے ایک جزیرہ تھا۔ کولمبس کو خاص براعظم امریکہ میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ اور وہ مرتے دم تک اسی مغالطے میں مبتلا رہا کہ وہ ایشیا پہنچ گیا ہے۔ اس کی اس غلط فہمی کے آثار آج تک باقی ہیں یعنی یہ جزیرے اب بھی جزائر غرب الہند کے نام سے موسوم ہیں اور امریکہ کے اصل باشندے اب بھی ہندوستانی یا ریڈ انڈین کہلاتے ہیں۔

کولمبس اس وقت تو واپس آگیا لیکن اگلے سال پھر بہت سے جہاز لے کر گیا۔ بخیال خویش ہندوستان کے اس نئے راستے کی دریافت سے سارے یورپ میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد ہی واسکو ڈے گاما نے اپنے مشرقی سفر میں عجلت کی اور کالی کٹ پہنچ گیا۔ جیسے جیسے مشرق اور مغرب دونوں طرف سے تازہ دریافتوں کی اطلاعیں آتی تھیں یورپ کا جوش و خروش بڑھتا جاتا تھا۔ ان نئے علاقوں پر حکمرانی کے دو عویدار تھے یعنی پرتگال اور اسپین۔ اب پوپ صاحب بھی میدان میں آئے اور اسپین اور پرتگال کے درمیان لڑائی کو روکنے کی غرض سے انھوں نے بڑی فیاضی سے ان ملکوں کے حصے بخرے کر دیئے۔ یعنی ۱۴۹۳ء میں ایک فرمان جاری کیا جو فرمانِ حد بندی کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے جزیرہ ازورس

کے تین سو میل مغرب کی جانب شمال سے جنوب تک ایک فرضی لکیر کھینچ دی اور یہ طے کر دیا کہ پرتگال اس لکیر کے مشرق کے تمام غیر عیسائی علاقوں پر قبضہ کر سکتا ہے۔ اور اسپین اس کے مغرب کے علاقوں پر۔ گویا پوپ نے یورپ کو چھوڑ کر ساری دنیا پرتگال اور اسپین کو بخش دی اور خود ان کی گرہ سے کچھ خرچ نہ ہوا۔ جزیرہ ازورس بحر اوقیانوس میں واقع ہے اور اگر اس کے تین سو میل مغرب میں شمال سے جنوب کو ایک لکیر کھینچی جائے تو مغرب کی طرف کل شمالی امریکہ اور بیشتر حصہ جنوبی امریکہ کا پڑتا ہے۔ گویا پوپ نے پورا براعظم امریکہ اسپین کو بخشا اور ہندوستان چین جاپان و دیگر مشرقی ممالک، نیز تمام افریقہ پرتگال کو۔ پرتگالیوں نے اس عظیم الشان سلطنت پر قبضہ کرنا شروع کیا لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر بھی انھوں نے کچھ پیش قدمی کی اور برابر مشرق کی طرف بڑھتے گئے۔ ۱۵۱۰ء میں وہ گوا پہنچے اور ۱۵۱۱ء میں جزیرہ نما ملایا کے شہر ملاکا میں۔ اس کے بعد ہی جاوا میں اور ۱۵۷۶ء میں چین پہنچ گئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے سچ مچ ان ملکوں پر قبضہ کر لیا۔ بس چند مقامات پر انھیں قدم جمانے کی جگہ مل گئی۔ مشرق میں انھوں نے آگے چل کر جو کچھ کیا اس کا ذکر ہم اگلے خط میں کریں گے۔

مشرق کی طرف جانے والے پرتگالیوں میں ایک شخص فرڈیننڈ مگیلن بھی تھا۔ وہ اپنے پرتگالی آقا سے منحرف ہو گیا اور جب یورپ واپس گیا تو اسپین کی رعایا بن گیا۔ وہ مشرقی راستے سے یعنی راس امید ہو کر ہندوستان اور مشرقی جزائر کو جا چکا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا

کہ مغربی راستے سے وہاں جائے شاید اسے یقین تھا کہ کولمبس نے جو ملک دریافت کیا ہے وہ ایشیا میں نہیں ہے۔ درحقیقت بلبوا نامی ایک اسپینی ۱۵۰۲ء میں وسطی امریکہ کو وہ پاناما کو عبور کرکے بحرالکاہل تک پہنچ چکا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے اس سمندر کو بحر جنوبی کہا تھا۔ اور اس کے ساحل پر کھڑے ہو کر یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ سمندر اور وہ تمام ملک جن کے ساحل کو یہ سمندر چھوتا ہے۔ میرے آقا شاہ اسپین کی ملکیت ہیں۔

۱۵۱۹ء میں مگیلن اپنے مغربی سفر پر روانہ ہوا۔ یہ گویا اس زمانے کا سب سے بڑا سفر ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ پانچ جہاز اور ۲۷۰ ہمراہی تھے۔ وہ بحرالکاہل عبور کرکے جنوبی امریکہ تک پہنچ گیا لیکن اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ برابر جنوب کی طرف چلتا رہا یہاں تک کہ وہ براعظم کے آخری کونے پر پہنچ گیا۔ اس عرصہ میں اس کا ایک جہاز تباہ ہو گیا تھا اور ایک کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ صرف تین باقی تھے۔ انھی کو لے کر اس نے وہ تنگ آبنائے پار کی جو جنوبی امریکہ اور ایک جزیرے کے درمیان واقع ہے اور دوسری جانب بحرالکاہل میں داخل ہو گیا یہ نام بھی مگیلن ہی کا رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ بحر اوقیانوس کے مقابلہ میں یہ سمندر اسے بہت پرسکون معلوم ہوا تھا۔ بحرالکاہل تک پہنچنے میں اسے چودہ مہینے لگے۔ یہ آبنائے اب بھی اس کے نام پر آبنائے مگیلن کہلاتی ہے۔

مگیلن بڑی دلیری کے ساتھ نامعلوم سمندر میں پہلے شمال کی طرف پھر شمال و مغرب کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ سفر کا یہ حصہ بڑا

ہمت شکن تھا۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس میں اتنا زمانہ لگ جائے گا پورے ۱۰۸ دن تک وہ اس حالت میں بیچ سمندر میں رہے کہ ان کے پاس کھانے پینے کو بھی بہت کم تھا۔ بالآخر بڑی سخت تکلیفیں اٹھانے کے بعد وہ جزیرۂ فلپائن پہنچے۔ وہاں کے باشندے اِن کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ انھیں کھانے پینے کا سامان دیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیئے۔ لیکن اسپینی بڑے مغرور اور کج خلق تھے۔ مگیلن وہاں کے دو سرداروں کی آپس کی جنگ میں شریک ہوا اور مارا گیا۔ اس کے علاوہ جزیرے کے باشندوں نے اور بہت سے اسپینیوں کو ان کی بددماغی کی وجہ سے قتل کر دیا۔

اسپینیوں کو دراصل ان جزیروں کی تلاش تھی جہاں سے قیمتی مسالے آتے تھے۔ اس لیے ان کی جستجو میں آگے بڑھ گئے۔ یہاں ایک جہاز کو اور چھوڑنا پڑا اور اسے آگ لگادی گئی۔ اب صرف دو جہاز باقی رہ گئے تھے چنانچہ یہ طے پایا کہ ان میں کا ایک جہاز پلٹ کر بحرالکاہل ہی کے راستے سے اسپین جائے اور دوسرا اسید ھا راس امید کے راستے سے۔ پہلا جہاز ابھی زیادہ دور نہیں پہنچا تھا کہ پرتگالیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن دوسرا جہاز جس کا نام "وکٹوریا" تھا افریقہ کا چکر کاٹ کر ۱۵۲۲ء میں یعنی روانگی کے پورے تین سال بعد اسپین میں اسپیلا پہنچ گیا۔ اس وقت اس میں صرف ۱۸ آدمی باقی رہ گئے تھے۔ یہ سب سے پہلا جہاز تھا جس نے دنیا کے گرد چکر لگایا۔

میں نے "وکٹوریا" جہاز کے سفر کا حال ذرا تفصیل سے لکھ دیا اس لئے کہ یہ نہایت ہی عجیب و غریب سفر تھا۔ آج کل تو ہم بہت

آرام و آسائش کے ساتھ سمندر کا سفر کرتے ہیں اور بڑے بڑے جہازوں پر دور دور جا سکتے ہیں۔ لیکن ذرا ابتدائی زمانے کے اُن سیاحوں کا تصور کرو جنھوں نے طرح طرح کے خطروں کا مقابلہ کیا، نامعلوم سمندروں کو دریافت اور آئندہ نسلوں کے لئے سمندر کے راستے دریافت کئے۔ مانا کہ اس زمانے کے اسپینی اور پرتگالی مغرور، بدماغ اور ظالم تھے لیکن وہ بے انتہا دلیر بھی تھے اور مہم بازی کے جوش سے سرشار تھے۔

اسی اثنا میں کہ مگیلن دنیا کا چکر لگا رہا تھا۔ کورٹس میکسیکو شہر میں داخل ہوا۔ اور شاہ اسپین کی جانب سے سلطنت ازتک فتح کر لی۔ اس واقعہ کا اور امریکہ کی مایا تہذیب کا میں تذکرہ کر چکا ہوں۔ کورٹیس ۱۵۱۹ء میں میکسیکو پہنچا۔ اس کے بعد ۱۵۳۰ء میں پزارو نے جنوبی امریکہ کی سلطنت انکا فتح کی۔ یہ سلطنت اسی جگہ پر واقع تھی جہاں اب پیرو ہے۔ کچھ تو ہمت اور دلیری کی بدولت کچھ مکر و فریب اور ظلم سے اور کچھ وہاں کے اندرونی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر کورٹیس اور پزارو نے دو قدیم سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن سچ پوچھو تو یہ دونوں سلطنتیں اپنا وقت پورا کر چکی تھیں اور بعض باتوں کے لحاظ سے بالکل غیر ترقی یافتہ تھیں۔ اس لئے وہ پہلے ہی وار میں اس طرح پارہ پارہ ہو گئیں جیسے تاش کے پتے ہاتھ سے چھوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

تحقیق و تلاش کے ان ہراولوں کے بعد پھر تو مہم باز لوٹ مار کے شوق میں جوق جوق آنے لگے۔ اسپینی امریکہ بالخصوص اس

اس انبوہ کی دست درازیوں کا شکار رہا یہاں تک کہ خود کولمبس کے ساتھ انھوں نے بہت بُرا برتاؤ کیا۔ اسی زمانہ میں میکسیکو اور پیرو سے اتنی مقدار میں سونا چاندی اسپین آیا کہ سارا یورپ حیرت میں رہ گیا اور اسپین یورپ کی سب سے زبردست طاقت بن گیا۔ یہ سونا چاندی رفتہ رفتہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں پہنچا یہاں تک کہ مشرق کا سامان خریدنے کے لئے ان کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی۔

اسپین اور پرتگال کی کامیابیوں نے قدرتاً دوسرے ملکوں کے باشندوں بالخصوص فرانس۔ انگلستان۔ ہالینڈ اور شمالی جرمنی کے باشندوں میں ایک جوش و خروش پیدا کر دیا۔ پہلے تو انھوں نے انتہائی کوشش کی کہ شمالی راستے سے ایشیا اور امریکہ پہنچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ یعنی ناروے کے شمال سے مشرق کی طرف جائیں یا پھر گرین لینڈ ہو کر مغرب کی سمت مڑ جائیں لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انھوں نے بھی عام راستہ اختیار کر لیا۔

یہ زمانہ بھی کتنا عجیب ہوگا۔ جب دنیا اپنے چہرے سے نقاب اُٹھا رہی تھی اور اپنے خزانے اور عجائبات لوگوں کے سامنے کھول رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے نئی نئی دریافتیں ہو رہی تھیں گویا نئے برِاعظم اور بحرِ اعظم اور ان کی بے شمار دولت "کھل جا سم سم" کے حکم کے منتظر تھے۔ یقیناً ساری فضا ان مہموں کے سحر سے معمور ہو گئی ہوگی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب دُنیا بہت تنگ جگہ ہو کر رہ گئی ہے اور یہاں کچھ زیادہ دریافت کرنے کو نہیں رہا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے سائنس نے اب بیشمار نئے نئے میدان کھول دیئے ہیں۔ جن میں تحقیق کی بڑی گنجائش ہے۔ اس لئے مہم بازی کے مواقع کی کوئی کمی نہیں خاص کر آج کل ہندوستان میں!